آبِ حیات کی حمایت میں

اور

دوسرے مضامین

از

ڈاکٹر محمد صادق

☆

مجلسِ ترقیٔ ادب
کلب روڈ ۔ لاہور

آبِ حیات کی حمایت میں

اور

دوسرے مضامین

از

ڈاکٹر محمد صادق

☆

مجلسِ ترقیٔ ادب
کلب روڈ ۔ لاہور

طبع اول : جولائی ۱۹۷۳ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : پروفیسر حمید احمد خاں
ناظم مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

طابع : ایس - ایم - شفیق

مطبع : شفیق پریس ، لاہور

سرورق : زرین آرٹ پریس ، لاہور

قیمت : چودہ روپے

غالب مصطفیٰ کے نام

فہرست

پیش لفظ

یہ مضامین تمام تر حیات و تصنیفاتِ آزاد سے متعلق ہیں اور سالہا سال کی مسلسل تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہیں۔ میں نے اس مواد کو حسبِ ضرورت اپنی تصنیف ''محمد حسین آزاد ــــ احوال و آثار'' میں استعمال کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مواد پہلی بار فراہم کیا گیا ہے اور اس سے حیاتِ آزاد پر مزید روشنی پڑتی ہے اس لیے اسے ایک مستقل تصنیف کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ قارئین خود محسوس کریں گے کہ یہ مضامین سراسر حقائق پر مبنی ہیں اور ان میں کسی رد و کد یا قیل و قال کی گنجائش نہیں۔

''تدوینِ دیوانِ ذوق'' سے قطع نظر، باقی مضامین مختلف اوقات میں مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور اب انھیں نہایت معمولی رد و بدل کے بعد یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ ''تدوینِ دیوانِ ذوق'' درحقیقت دو حصوں پر مشتمل ہے، یعنی غزلیات اور قصائد۔ ان میں سے صرف پہلا حصہ یہاں شامل کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ مع چند دیگر تحقیقی مقالات کے ایک علیحدہ تصنیف کی صورت میں شائع ہوگا۔

اگر اسے خودستائی پر محمول نہ کیا جائے تو اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ یہ مضامین کارآمد ثابت ہوئے ہیں اور ان سے استفادہ بھی کیا گیا ہے۔ اگر ''تدوینِ دیوانِ ذوق'' اور ''سخن دانِ فارس پر مزید روشنی'' کو مستثنا کر دیا جائے، تو باقی مضامین کا معتدبہ حصہ آپ کو ''محمد حسین آزاد'' مصنّفہ ڈاکٹر اسلم فرّخی

میں مل جائے گا ۔ اگرچہ انھوں نے اپنی تالیف ''نیرنگِ خیال'' میں اپنی انتخاب کردہ مثالیں دے کر اس کے ماخذ کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ یہ معلومات انھیں کہاں سے دستیاب ہوئیں ۔ عین ممکن ہے کہ ان معلومات کو قارئین ڈاکٹر صاحب کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ خیال کریں ۔

یہاں مجھے خصوصیت سے آغا محمد اشرف کا ذکر کرنا ہے جو اپنی تصنیف ''انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت'' (مطبوعہ ۱۹۵۹ع) کی تمہید میں لکھتے ہیں :

''سب سے بڑی خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ مولانا کی زندگی کا یہ دور اب تک پُراسرار پردوں میں چُھپا تھا . . . الحمد للہ کہ مولانا آزاد کے عقیدت مندوں کے سامنے ان کی نقاب کشائی کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے ۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ محمد حسین آزاد پر ہمارے مقالے کا ٹائپ شدہ مسودہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ اس سے اس حقیقت کی مکمل توثیق ہوتی ہے کہ آزاد کے سفرِ ترکستان کے متعلق تمام ضروری معلومات ۱۹۳۹ع ہی میں قلم بند ہو چکی تھیں ۔

محمد صادق

آب حیات کی حمایت میں

حافظ محمود شیرانی مرحوم کو مدت العمر یہ شکایت رہی کہ مصنف ''آب حیات'' ۔ تحقیق سے کام نہ لے کر بیشتر روایت کا سہارا لیا ہے ۔ انھیں مولوی حبیب الرحمان شروانی کی رائے سے اتفاق تھا کہ '' آزاد کی قیاس کی بلند پروازی نے الفاظ کے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں'' اور تاریخی لحاظ سے ''آب حیات'' ایک ساقط الاعتبار کتاب ہے - میں نے ان سے بارہا پوچھا کہ آخر آپ آزاد سے اتنے بدظن کیوں ہیں ؟ ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ تاریخ ادب اردو کے تمام ماخذ دستیاب ہو چکے ہیں ، لیکن جو مواد آزاد نے ''آب حیات'' میں پیش کیا ، اس کا بیشتر حصہ ان میں موجود نہیں - اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتاب مستند روایات پر مبنی نہیں بلکہ مصنف کے طبع زاد اختراعات یا محض سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے -

قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہی شیرانی جو ''آب حیات'' کی تاریخی وقعت کے منکر تھے ، آخرکار اس کی حمایت میں قلم اٹھانے پر مجبور ہوئے - جب انھوں نے حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ قاسم کی تصنیف ''مجموعۂ نغز[1]'' کی تالیف اپنے ذمہ لی تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ آزاد کے بیشتر بیانات جو تاریخی حیثیت سے انھیں کمزور یا ناقابل اعتبار معلوم ہوتے تھے ، اور جنھیں وہ آزاد کے

---

۱ - مجموعۂ نغز ، یعنی تذکرۂ شعرائے اردو ، لاہور ۱۹۳۳ع -

تخیل کی پیداوار بتایا کرتے تھے ، سب اسی تذکرے سے ماخوذ ہیں -

شیرانی لکھتے ہیں :

''مولانا نے اگرچہ ہر موقع پر اس تالیف سے استفادے کا اظہار نہیں کیا ہے ، تاہم وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ''آب حیات'' کا ایک بڑا حصہ اسی تذکرے سے ماخوذ ہے -''

اس کے بعد وہ ان معلومات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو آزاد نے اس تذکرے سے لی ہیں - یعنی :

ولی اور ناصر علی کے درمیان شاعرانہ تعلی کا قصہ (صفحہ ۹۳ ، آب حیات) ، شاہ مبارک آبرو کے حالات اور اشعار متفرق ، مکھن پاکباز کا ذکر (صفحہ ۹۷) ، شیخ شرف الدین مضمون کا حال اور اشعار (صفحہ ۱۰۲) ، آرزو کا ذکر اور اشعار (صفحہ ۱۲۱ ، ۱۲۲)، آرزو کی بدیہہ شعرخوانی (صفحہ ۱۲۳) ، سودا کے شعر کو حدیث قدسی کہنا (صفحہ ۱۷۲) ، محمد شاکر ناجی کے حالات اور نادر شاہ سے جنگ کے متعلق ان کے خمسے کے دو بند اور متفرق اشعار (صفحہ ۱۰۵) ، شاہ حاتم کے بیشتر اور اشرف علی خاں فغاں و یکرنگ کے کم تر حالات و اشعار (صفحہ ۱۰۷) -

میرزا جان جاناں مظہر کے واقعۂ شہادت کے ذکر میں تو خود ''آب حیات'' میں بھی تذکرے کا حوالہ دیا گیا ہے . . . سودا کے بیان میں میر اور میرزا کی افضلیت کے سلسلے میں ''مجموعۂ نغز'' کی اصل عبارت بھی منقول ہے - چنانچہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم بھی

اپنے تذکرے میں فرماتے ہیں : ''زعم بعضے آں کہ سر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بوئے نرسیدہ ، اما حق آنست کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا دریائیست بیکراں و میر نہریست عظیم الشان ۔ در معلومات قواعد میر را بر مرزا برتریست و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری ۔'' (صفحہ ۱۶۴)

سودا کا لطیفہ قائم علی امیدوار کے ساتھ (صفحہ ۱۷۰) ، بقاء اللہ خان بقا کے حالات، (صفحہ ۱۵۴ حاشیہ) اور اشعار میر کی ہجو میں (صفحہ ۲۲۲)، پیر خان کمترین کا حال (حاشیہ ۲۱۱-۲۱۲) اسی ماخذ سے ہیں ۔

میر تقی میر کے متعلق ہمارے ہاں عام جذبات یہ ہیں کہ مولانا آزاد نے میر صاحب کی بے دماغی اور تنک مزاجی کے افسانے کو غیر ضروری فروغ دیا ہے ، جس کی اصل غالباً کچھ بھی نہیں ۔ مصنفِ 'گل رعنا' کا بیان ہے :

''آزاد کہتے ہیں کہ افسوس یہ ہے کہ ان کو (میر صاحب کو) اوروں کے کمال بھی دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ میر سے شخص کے دامن پر بد نما دھبا ہے ''

اور ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

''خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے ، کسی اور کی کیا حقیقت ہے ۔'' مگر جب ان کی جانچ ہم ان کی کتاب ''نکات لشعرا'' سے کرتے ہیں تو حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہتی کہ یہ بیان کس قدر واقعے کے خلاف ہے ۔''
(گل رعنا ، صفحہ ۱۵۶)

مولانا آزاد کی اصل عبارت یہ ہے :

''سب تذکرے نالاں ہیں کہ اگر یہ غرور اور بےدماغی فقط اُمراء کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی ۔ افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انھیں دکھائی نہ دیتے تھے ۔ اور یہ اس ایسے شخص کے دامن پر نہایت بد نما دھبا ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکو کاری کا خلعت پہنے ہو ۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے، کسی اور کی کیا حقیقت ہے ۔''

(آب حیات، صفحہ ۱۶ - ۲۱۷) ۔

اس موقعے پر مولانا آزاد نے تخیل سے کام نہیں لیا ہے ۔ ان کی عبارت کا اصل ماخذ حکیم صاحب کا یہ فقرہ ہے :

''از نخوت و خود سریش چہ بر نگارم کہ سینۂ قلم حقائق رقم مے فگارد ۔ بر شعر کسے گر ہمہ اعجاز باشد و کلام شیخ شیراز سر ہم نمی جنباند تا بہ تحسین خود چہ رسد و بہ سخن احدے اگرچہ معجز طرازی بود و گفتۂ اہل شیرازی گوش ہم فرا نمی‌دارد ، امکان چیست کہ حرف آفرین بر زبانش رود ۔''

(صفحہ ۲۳۰ ، جلد دوم)

ولی کے متعلق آزاد کا یہ بیان بے اصل مانا گیا ہے :

''ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے ، اس کے حق میں (میر تقی میر) فرماتے ہیں ''ولی شاعریست از شیطان مشہور تر ۔'' پیر خان کمترین اسی زمانے میں ایک قدیمی شاعر دلی کے تھے، انھیں اس فقرے پر بڑا غصہ

آیا ۔ ایک نظم میں اول بہت کچھ کہا ، آخر میں آ کر کہتے ہیں : ع

”ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں“

(صفحہ ۲۱۱-۲۱۱)

'نکات الشعرا' چھپ گیا ہے - بے شک اس میں 'شیطان' والا فقرہ موجود نہیں لیکن آزاد کا بیان حکیم صاحب کے ان بیانات پر مبنی ہے :

”در تذکرۂ خود ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ ۔ در حق شاعر شانِ جلی المتخلص بہ ولی نوشتہ کہ وے شاعریست از شیطان مشہور تر ، و سزای این کار ناہنجار از کمترین شاعر بواجبی یافتہ کہ وی ہجوہائے متعددۂ او کردہ کہ بعضے ازاں بغایت رکیک و پردہ در افتاد ۔“ (صفحہ ۲۳۰)

”حقش بر جملہ سخن پردازان ہندی زبان ثابت است و سخن بر سخنش ابلیس منشی و شیطنت ۔ پیرخان کمترین کہ خداش بیامرزد بسیار بموقعہ و بجا گفتہ کہ : ع

'ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں ۔'“

(صفحہ ۲۹۷)

محمد امان نثار کے حالات ، اژدر نامہ کا ذکر اور نثار کی ہجو نگاری (صفحہ ۲۱۸) اسی تذکرے سے منقول ہے اور جرأت کے حال میں ایک حوالہ بھی ملتا ہے - جرأت کے بعض ابتدائی حالات (صفحہ ۳۲۷)، مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مشاعرے میں جرأت کا دھوم دھامی غزل پڑھنا اور میر صاحب سے داد طلب کرنا ، ان کا ٹال ٹال جانا ، اور بعد میں جھنجھلا کر یہ کہنا ”کیفیت اس کی یہ

ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو ، اپنی چوما چاٹی
کہہ لیا کرو۔'' (صفحہ ۲۴۱) اسی تالیف کا فیضان ہے ۔
میر حسن کے حالات (صفحہ ۲۵۳) ، میر ماشاءاللہ خاں
کے پورے حالات (صفحہ ۲۵۹) ، انشاء اور عظیم بیگ کا
معرکہ (صفحہ ۲۶۲ ، ۲۶۵) اور نواب امین الدولہ
یمین الملک ناصر جنگ عرف میرزا میڈھو کے ذکر کے
لیے بھی یہی تذکرہ سند مانا جاسکتا ہے ۔ اس کے علاوہ
اور بھی موقعے ہیں جہاں ''آب حیات'' میں اس تالیف
کا پرتو نمایاں ہے ۔''

اس رائے میں کہ ''آب حیات'' کے اکثر بیانات تاریخی
لحاظ سے کمزور ہیں ، یا یوں کہیے کہ طبع زاد ہیں ، پروفیسر
شیرانی منفرد نہ تھے ۔ ہر وہ حوصلہ مند نقاد یا ادبی محقق جس
نے گزشتہ ۵۰ سال میں تاریخ ادب اردو کے میدان میں
قدم رکھا ہے ، اس نے اپنی شہرت کی بنیاد کو ''آب حیات''
کی شکست و ریخت پر مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے ۔
یا یوں کہیے کہ آزاد دشمنی مذہبِ تنقید کی سنتِ اولین
قرار دی گئی ہے ۔

مصنفِ ''گل رعنا'' ہی کو لے لیجیے: غالباً اردو میں
کوئی اور ایسی کتاب نہیں جس میں ''آب حیات'' سے اس قدر
استفادہ کیا گیا ہے ۔ ہر قدم پر ''آب حیات'' سے مدد لی گئی
ہے اور بار بار اس کے الفاظ اور فقرے دہرائے گئے ہیں ،
لیکن باوجود اس خوشہ چینی کے بات بات پر آزاد کو ہدفِ
ملامت بنایا گیا ہے ۔

اسی طرح جب نواب سید ناصر حسین خیال نے ''مغل
اور اردو'' پر قلم اٹھایا تو دل کھول کر آزاد کو ملامت

کی ۔ لطف یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے بہت کم کتابیں اتنی ساقط الاعتبار ہیں جتنی ''مغل اور اردو'' ۔ آپ لکھتے ہیں :

''آزاد مرحوم کی روح نہ شرمائے ؛ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کی دھن میں آنکھیں بند کر لیتے اور اپنی قلم کو آزاد کر دیتے ہیں[1] ۔''

اور : ''ہمارے آزاد قصہ گوئی میں اکثر بہت آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ ادھر آدھر نہیں دیکھتے[2] ۔''

اور : ''آزاد مرحوم اپنے مورخ ہونے کے مدعی نہیں ، اس لیے اگر وہ تاریخی غلطیاں کر جائیں تو قابل معافی ہیں ۔ مگر تذکرے کی غلطیاں اور پھر اس طرح کی داستان سرائیاں لائق معافی نہیں[3] ۔''

اس پر ڈاکٹر عبدالحق کو احتجاجاً لکھنا پڑا :

''آزاد مرحوم کی ''آب حیات'' اپنی بعض واقعاتی غلطیوں کے باوجود اردو زبان میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے ۔ تاریخ کی حیثیت سے نہ سہی، افسانے کی حیثیت سے اسے دیکھیے۔ اس کی زبان اور اس کا اسلوب بیان اس قدر شستہ، رفتہ، سلیس و پاکیزہ اور دل چسپ ہے کہ ہمارے ادب میں اس کی بہت کم مثالیں ہیں ۔ آزاد مرحوم کا کیا یہ کم احسان ہے کہ اس نے سب سے پہلے تاریخ ادب لکھنے کا ڈول ڈالا اور ہمیں یہ خیال سجھایا ۔ بے شک آزاد کی غلطیوں کو دکھائیے لیکن اس پر لعن طعن کی بوچھاڑ نہ کیجیے، خصوصاً ناروا اور بے جا[4] ۔''

اور : ''لائق مؤلف آزاد مرحوم کی جن غلطیوں سے خفا ہیں ، ان میں سے اکثر آج صحیح ثابت ہو رہی ہیں ۔ اس

---

۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ - اردو ، جنوری ۱۹۳۴ء ، صفحہ ۲۲۰ ۔

کتاب ''آب حیات'' کی جن غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے ، ان میں سے سوائے ایک آدھ کے سب صحیح ہیں[1] ۔''

در اصل ''آب حیات'' مولانا آزاد کی زندگی کا نچوڑ ہے اور اس کا مواد نہایت جانفشانی سے اکٹھا کیا گیا تھا ۔ غدر سے پہلے ہی ان کی خواہش تھی کہ شاعروں کے حالات تمام و کمال جمع کیے جائیں ۔ چنانچہ استاد ذوق سے ان کے حالات کرید کرید کر پوچھتے ، اور ان جگہوں کو دیکھتے جاتے جہاں مشاہیر شعرا کا جمگھٹا ہوا کرتا تھا یا جہاں ان کے بڑے بڑے معرکے ہوئے تھے ۔ غدر کے بعد جب یہ پرانی صحبتیں گلدستۂ طاق نسیاں ہوگئیں تو ان کا ارادہ اور مستحکم ہوگیا اور اس کام نے ایک مذہبی فرض کی سی صورت اختیار کر لی ۔ غدر کے بعد جب وہ بے خانماں اور نہایت سراسیمگی کی حالت میں مارے مارے پھر رہے تھے ، وہ اپنا یہ فرض نہیں بھولے ۔ چنانچہ ۱۸۵۷ع میں لکھنؤ میں شعرا کے حالات جمع کرتے رہے (آب حیات ، صفحہ ۱۵۲)۔ پنجاب آ کر انھوں نے یہ مواد اُن لیکچروں کی صورت میں پیش کیا جو انھوں نے انجمن ِ پنجاب کے اجلاس میں پڑھے ۔ یہ لیکچر ''آب حیات'' کا نقش ِ اولین تھے اور نہایت مختصر اور ادھورے ۔ لیکن آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتا گیا ، یہاں تک کہ انھوں نے ''آب حیات'' کی صورت اختیار کر لی ۔ اب بھی یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا تھا ۔ چنانچہ پہلے ایڈیشن کے بعد ''آب حیات'' میں بہت سے اضافے کیے گئے ۔

''آب حیات'' کے مآخذ تین ہیں : (۱) وہ اطلاعات جو انھیں شعرا کے عزیز و اقارب سے براہ راست زبانی ملیں ۔

---

۱ ۔ اردو ، جنوری ۱۹۳۴ع ، صفحہ ۲۲۰ ۔

(۲) وہ اطلاعات جو انھوں نے بذریعۂ خط و کتابت حاصل کیں اور (۳) وہ اطلاعات جو انھیں پرانے تذکروں سے دستیاب ہوئیں ۔ مولانا آزاد نے حسب ضرورت ان ماخذ کا اپنی تصنیف میں حوالہ دیا ہے ۔

اس مختصر سے مقالے کا موضوع وہ اطلاعات ہیں جو مولانا آزاد نے بذریعہ خط و کتابت حاصل کیں ۔ وہ خطوط جو مولانا کو اس طرح موصول ہوئے ، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سوالات کا ایک سلسلہ لکھ بھیجتے تھے اور موصول شدہ جوابات اپنی ضروریات کے مطابق کام میں لاتے تھے ۔ جیسا کہ آپ خود محسوس کریں گے ، انھوں نے اس مواد کو نہایت دیانت داری سے استعمال کیا ہے اور اگر اس میں قطع و برید سے کام لیا ہے تو ان کا منشا یہ تھا کہ اس مواد خام کو ایک باترتیب اور موزوں شکل میں پیش کیا جائے ۔ کہیں کہیں غیر ضروری اطلاعات کو قلم انداز کر دیا گیا ہے یا لمبے چوڑے بیانات کو مختصر الفاظ میں ادا کر دیا گیا ہے ۔ لیکن اُن کی ترتیب میں نہ تو انھوں نے مبالغے سے کام لیا ہے اور نہ زیبِ داستاں کے لیے اس میں اضافہ کیا ہے ۔

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے ؛ اکثر اصحاب کا خیال ہے کہ آزاد نے شعرائے اردو سے بہت نا انصافی کی ہے اور ان کی خامیوں کو اُبھار اُبھار کر دکھایا ہے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کا مضحکہ اڑایا ہے ۔ ان خطوط کے مطالعے سے اس بدظنی کی ذرا بھی تائید نہیں ہوتی ۔ در اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ آزاد نے اُن تمام بیانات کو، جن سے ذم کا پہلو نکلتا ہے ، نظر انداز کر دیا ہے ۔

اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ آزاد کو اُن شعراء سے عشق تھا ۔ انھوں نے ''آب حیات'' کے خاتمے پر جس والہانہ شیفتگی کا اظہار کیا ہے ، اس کی مثال ہمارے ادب میں نہیں ملتی ۔ لیکن اس کا سبب ایک اور بھی ہو سکتا ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے ۔ میری رائے میں اسے ان کی محتاط طبیعت پر محمول کیا جا سکتا ہے ۔ آزاد میں مولانا حالی یا سید احمد جیسی اخلاقی جرأت نہ تھی ۔ وہ تنقید سے بہت جزبز ہوتے تھے ۔ مولانا حالی کے ذیل کے خطوط سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد کی حساس طبیعت بدظنی سے بہت گھبراتی تھی ۔ لہٰذا وہ شعراء کے معائب بیان کرنے سے احتراز کرتے تھے ، یا کم از کم اس سے گھبراتے تھے[1] :

''جناب مولوی صاحب مخدوم و مکرم ! اے وقت تو

---

۱ ۔ صادق الاخبار مورخہ ۱۰ ۔ مارچ ۱۸۸۱ع میں ایک مضمون مشتمل بہ 'احوال مومن' شائع ہوا تھا ۔ اس کے بعد ۲۴ مارچ کو ایک مختصر سا خط اسی اخبار میں شائع ہوا جس میں مولانا آزاد کو بدیں وجہ ہدف ملامت بنایا گیا تھا کہ انھوں نے ''آب حیات'' میں مومن کا ذکر نہیں کیا ۔ حالی کے خطوط میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ۔ اس مضمون میں آزاد پر یوں تعریض کی گئی ہے :

''مولوی محمد حسین آزاد نے ... ایسے جواہر زواہر کو خزف ریزہ جان کر پھینک دیا ، اور اپنی کتاب ''آب حیات'' میں جو اُن کے خیال میں ہوگی، دیگر شعرائے قدیم کے ساتھ نہ لکھا...حضرت آپ افسردہ‌خاطر نہ ہوں ۔ بھلا اجتماع ضدین کہیں ہو سکتا ہے ... مومن تو نام پایا اور مذہب سنی ۔ معاذ اللہ ایسے کٹے اور ڈبل سنی کہ اصحاب ثلاثہ کرام کی تعریف و توصیف میں قصائد بھی لکھے ، اور وہ ایسے دل سے لکھے کہ مقبول بھی ہو گئے ۔ مولوی آزاد کو کیا پڑی تھی کہ ایسے جنتی مومن کا حالِ زندگانی لکھ کر اور اس کو زمرۂ استاداں میں شمار کر کر آپ بھی اسی کے پیرو ہوتے اور اپنی برادری میں سے خارج کیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱ پر)

خوش کہ وقتِ ما خوش کر دی ۔ الحمدللہ کہ تذکرۂ مشاہیر شعرائے اردو (آب حیات) چھپنا شروع ہو گیا ہے۔۔۔آپ لوگوں کے بھلا برا کہنے کا ہرگز خیال نہ کیجیے ، اور اس خیال سے تغیر و تبدل کی مشقت نہ اٹھائیے ۔ ہاں اگر کسی موقع پر آپ کی رائے ہی بدل جائے تو مضائقہ نہیں[1] ۔''

ایک اور خط میں مولانا حالی لکھتے ہیں :

''آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے ۔ من صنف قد استہدف خیال رکھیے اور اپنا کام کیے جائیے ۔ نکتہ چینیوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جا سکتے اور اگر دو نکتہ چین ہیں تو ہزار مدح و ثنا گو بھی تو ہیں[2] ۔''

میرے پاس ایسے کئی خطوط ہیں جن سے آزاد نے استفادہ کیا ہے لیکن یہاں صرف چار کو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ نیز یہ واضح کرنے کے لیے کہ انھیں کیسی مورخانہ راست بازی سے استعمال کیا گیا ہے، ہر خط کے بعد ''آب حیات'' کے وہ اقتباسات پیش کروں گا جو ان اطلاعات پر مشتمل ہیں :

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰)

جاتے اور اہل تشیع کی نظروں میں سبک بنتے ۔ پس آپ صبر کریں ، تعصب کی شان کو بغور تکتے رہیں ۔ فرمائیے تو سہی ، جن شعراء کا ذکر کتاب ''آب حیات'' میں ہے ، ان میں سے کسی نے بھی ایک رباعی اصحاب ثلاثہ کبار کی شان میں کہی ہے ، گو ان میں سے اکثر اہل سنت ہیں ۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مومن مرحوم کو عشق مذہب تسنن اس امر کا مقتضی نہ ہوا ، وہ اس غیر کتاب میں داخل ہوتا ۔ واللہ ہم تو یہ تصرف مومن مرحوم سمجھتے ہیں اور آج سے فرقۂ اولیا میں شمار کرنے لگے ۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے : لعنت اللہ علی الکاذبین ۔''

۱ ، ۲ - مکتوبات آزاد -

پہلا خط

مولانا مخدومنا! تسلیمات ۔ حاتم کی تین غزلیں اور شاہ نصیر
کی دو غزلیں فی البدیہہ حسب الطلب عبداللہ شاہ صاحب نے
عنایت فرمائی ہیں اور انشاء اللہ جو کچھ مل سکے گا پھر کبھی
ارسال خدمت ہو گا ۔ خاکسار کی یہ التماس ہے کہ میرے
ایک عنایت فرما منشی دیبی پرشاد کائستھ ، ساکن ٹونک ،
ایک تذکرہ ہندو شاعروں کا لکھ رہے ہیں ۔ پس اگر آپ اپنے
کسی شاگرد سے فرمائیں کہ وہ وہاں کے ہندو شعر گویوں
قدیم و جدید کا حال و مقال جس قدر معلوم ہو سکے، لکھ کر
عنایت کرے تو عین عنایت ہو ۔ زیادہ نیاز ۔ درگا داس ۔
۴ مارچ ۷۶ع ۔

فی البدیہہ نصیر

ایک شخص نے شاہ صاحب سے دریافت کیا کہ جناب من
اس ضرب المثل کی حقیقت کیوں کر ہے ، جنگل میں مور ناچا
کس نے دیکھا ۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے فی البدیہہ فرمایا :

کی کوہ کنی تو زور کس نے دیکھا
اور قیس کا بن میں شور کس نے دیکھا
کرنا ہے جو کچھ کریں گے ان کے در پر
ناچا جنگل میں مور کس نے دیکھا

ایک دفعہ کچھ رنگترے لے کر تحصیل دار سونی پت
کے پاس گئے ، بہ سبب اس کے دو گانؤ آپ کی جاگیر کے . . .
اسی تحصیل میں تھے، تحصیل دار صاحب نے فرمایا کہ شاہ صاحب!
رنگتروں کی کیا ضرورت تھی ۔ آپ نے کچھ اپنا کلام نذر کیا
ہوتا ۔ اب اگر یہ خوشی ہے تو خیر ہم نے منظور کیے مگر
ان رنگتروں کی مثال میں کوئی شعر زبان مبارک سے فرمائیے ۔

آپ نے اسی وقت فی البدیہہ یہ رباعی تصنیف فرمائی :

اے نیّر برجِ آسمانِ اقبال
ان رنگتروں پر غور سے کیجیے گا خیال
یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر
پردے میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

آزاد نے اسی خط پر چند ضروری ترمیمات کیں اور اسے ''آب حیات'' میں درج کر دیا ۔ ترمیم شدہ شکل یہ ہے :

''دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیل دار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے اور کچھ رنگترے دلی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیل دار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! رنگترں کی تکلیف کیا ضرور تھی ۔ آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے ۔ ان رنگتروں کی حسن تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمائیے ۔ اسی وقت یہ رباعی کہی اور سنائی ۔''

خط میں جو غزلیں درج ہیں ، ان کے مطلعے یہ ہیں :

حاتم یار کا مجھ کو اس لیے ڈر ہے
شوخ ظالم ہے اور ستم گر ہے

یہاں طالعوں سے ملتا ہے پیارا
عبث دیکھے ہے زاہد استخارہ

شاہ نصیر زیب تن گرچہ ہے گل پیرہن سرخ ترا
لیکن انجام یہ ہوگا کفن سرخ ترا

خال پشت لب شیریں ہے عسل کی مکھی
روح فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

دوسرا خط

"بسم اللہ الرحمان الرحیم . . . بہ والا جناب رافت و عظمت مآب مکارم اخلاق ، منبع محاسن اشفاق ، جامع کمالات حضرت مولوی محمد حسین صاحب ! تسلیم مع التکریم ۔ عرض است عنایت نامۂ والا رقم زدہ ۲۰ جون ۱۸۸۲ع ورود یافتہ ممتازم ساخت ۔ ہر چند مکتوب سوم سلسلہ وار ارسال خدمت ساختم ، غالباً رسیدہ بملاحظۂ عالی گزشتہ باشد ۔ وقتاً فوقتاً ہر آنچہ حالات استادی شیخ عبداللہ امام بخش ناسخ صاحب معلوم حقیر است و یاد می آید ، ہمہ رطب و یابس نگاشتہ بخدمت فیض درجت ابلاغ می نمایم ۔ پس خذ ماصفا و دع ما کدر ہرچہ در مزاجِ مقدس آید ، درج تذکرہ خواہند فرمود ۔ آنچہ مناسب اندراج نیست ، آن را ترک خواہند فرمود ۔ ضرور نیست کہ جملہ داخل تذکرہ بودہ باشد ۔

یک فیروزہ عمدہ گرفتہ مرزای صاحب بر آن نام نامی شیخ ناسخ کندہ کنانیدہ حوالہ بطور نذر فرمودہ بودند ۔ شیخ صاحب اکثر در انگشت خود می داشتند ۔ وگاہی از انگشت بر آوردہ جائے می نہادند ۔ کسی آن را دزدیدہ برد ۔ بر آن فرمودہ اند :

ہم سا کوئی گم نام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

دیگر وقتی کہ در اللہ آباد تشریف می داشتند و در آن ایام مرزا کاب حسین خان صاحب بہادر تحصیل‌دار مقام سورانول بر سرحدِ نواب بودہ اند ، تمنا کردند کہ شیخ صاحب برائے چندے بمقام تحصیلے رفتہ قیام ورزند و سیر سبزہ زار آن جا فرمایند ۔ چنانچہ بمزید التماس شیخ صاحب در آن جا تشریف

بردند و یک ہفتہ اقامت فرمودند ۔ روزے چناں اتفاق افتاد کہ در طعام شیخ صاحب مرزا صاحب تکلف فرمودند لہٰذا توقف شده ۔ از اندرون حویلی طعام خدمت گاران شیخ اول آمده ۔ ناسخ پرسیدند کہ ایں چیست ۔ خدمت گاران گفتند کہ ایں طعام مایان است ، در طعام حضرت ہنوز توقف است ۔ پس شیخ صاحب آں ہمہ طعام دو سہ خدمت گاران گرفتہ تناول فرمودند و گفتند کہ طعام من کہ خواہد آمد شایان خواہید خورد ۔ ایں حکایت شنیده مرزا کاب حسن صاحب بغایت محجوب شدند کہ اول طعام آقا می باید فرستاد ۔

شیخ صاحب دو مرتبہ از لکھنؤ در دائره شاه محمد اجمل اللہ آبادی قدس سره رونق افروز شده مقیم بوده اند ۔ و از آنجا تا بنارس آمده خواستند کہ بطور شیخ علی حزیں در بنارس مقام ورزند ۔ باعث کثرت ہنود پسند نہ افتاد ۔ و یک مرتبہ در عظیم آباد ہم رفتند ۔ ہر چند مردم و رؤسائے آں جا بسیار خاطر داری فرمودند ، لیکن آں صحبت لکھنؤ کجا میسر . . . و زبان آنہا خام ۔ بسیار جلد از عظیم آباد برآمدند و فرمودند کہ زبان من ہم ایں جا خراب خواہد شد ۔ باز در اللہ آباد آمده اقامت فرمودند ، لہٰذا می فرمایند کہ :

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

اکثر برائے احبابِ لکھنؤ گریہ فرمودند ، و بر آں گفتہ اند کہ :

ایک تربینی تو ہے ناسخ کی آنکھ[1]
اب الہ آباد ہی پنجاب ہے

---

۱ - ''آب حیات'' میں اس طرح درج ہے :
ایک تربینی ہے دو آنکھیں مری

ہر چند در دائرہ شاہ اجمل قدس سرہ از احفاد شاہ محمد افضل الہ‌آبادی سہ خاندان بودند و برائے شیخ امام بخش ناسخ از ہر سہ خاندان طعام خوردنی یک وقت معمول بود می‌آمد ۔ یک خوان کلاں از سرکار شاہ ابوالمعالی صاحب ہر قسم طعام امیرانہ می آمد و دیگر از خانۂ شاہ سید علی جعفر صاحب زوج ہمشیرہ شاہ ابوالمعالی صاحب یک خوان دیگر و از خانۂ غلام حیدر صاحب خوان طعام دیگر اقسام می آمد ۔ باوجود آں شیخ صاحب ہمواره از باورچی خاص خود طعام حسب خواہش طبع تیار کنانیده بشمول ہمہ طعام کہ قریب پنج ثار بیک وقت می خوردند ۔ یک مرتبہ طباخ خاگینہ پخت ۔ دراں نہ معلوم از غفلت یا قصداً مار سیہ در آں انداختہ بود ، این قطعہ موزوں فرمودند :

جاں بلب آمد مرا از غفلت طباخ آہ !
می پزد خاگینہ با مار سیہ از بہر من
چوں دگر بارہ خطا بنمود سال عیسوی
گفت دل ، مار سیہ پخت ایں سفیہ از بہر من

دیگر شاہ غلام اعظم صاحب فرزند شاہ ابوالمعالی صاحب نبیرۂ شاہ محمد اجمل قدس سرہ صاحب افضل دائرۂ تخلص شاگرد شیخ بودند، اکثر حاضر مجلس می شدند ۔ روزے شیخ بوریای مشرقی بر تخت انداختہ نشستہ بودند کہ شاہ غلام اعظم حاضر شدند ، و بر ہماں تخت بنشستہ ازاں بوریا کا ہے کشیدہ شغل می نمود کہ شیخ صاحب دیدہ از آدم خود فرمودند کہ جاروب تازہ کہ آوردہ بیار ۔ آدم جاروب را آورد ۔ آں را از او گرفتہ حوالۂ شاہ غلام اعظم صاحب فرمودند کہ صاحب زادہ شغل ازیں باید فرمود ۔ و الا بوریا ے

ایں فقیر از اندک التفات برباد خواہد رفت۔ پس دیگر بوریاے مشرقی بدست آمدن مشکل است۔ ایشاں بسیار محجوب شدند۔ ایں گونہ دل بستگی ہاے بسیار مے فرمودند۔

در ۱۸۳۱ع در آں ایام کہ صلہ از معتمدالدولہ یافتہ بودند و آں روپیہ حوالۂ مرزائی صاحب دوست خود فرمودند، دزد را گماں شدہ کہ زر در خانۂ خود ذخیرہ داشتہ باشند۔ وقت شب نقب عقب خانہ افتاد۔ دزد ہیچ نہ یافت۔ خجل رفت۔

دزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب
نہ زر و سیم نہ بد مس، خجل آمد بیروں
بہر تاریخ مسیحی چو بریدم سر دزد
دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں!"

مندرجہ بالا اطلاعات "آب حیات" میں اس طرح درج ہیں:

"ایک امیر شرفاے لکھنؤ میں سے تھے اور شیخ صاحب کے بہت دوست تھے۔ انھوں نے ایک عمدہ فیروزہ پر آپ کا نام نامی کھدوا کر انگوٹھی بنوا کر دیا۔ اکثر پہنے رہتے تھے، کبھی اتار کر رکھ بھی دیتے تھے۔ وہ کسی نے چرا لی یا کھوئی گئی۔ اس پر فرمایا:

ہم سا کوئی گم نام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

(صفحہ ۳۷۱)

آغا کاب حسین خاں مرحوم انھیں اکثر بلایا کرتے تھے اور مہمان رکھتے تھے ... چنانچہ ایک موقع پر کہ آغا صاحب سورانول سرحد نوابی پر تحصیل دار ہو کر آئے۔ شیخ صاحب کو بلا بھیجا کہ چند روز سبزہ و صحرا کی سیر سے

طبیعت کو سیراب فرمائیے ۔ ایک دن بعض اقسام کے کھانے شیخ صاحب کی نیت سے پکوائے تھے۔ اس لیے وقت معمولی سے کچھ دیر ہو گئی ۔ شیخ صاحب نے دیکھا کہ حرم سرا کی ڈیوڑھی سے نوکر اپنے اپنے کھانے لے کر نکلے ۔ بلا کر پوچھا کہ یہ کس کے لیے ہے ؟ عرض کی ہمارا کھانا ہے ۔ فرمایا ادھر لاؤ ۔ ان میں سے چار پانچ کا کھانا سامنے رکھوا لیا ۔ چاٹ پونچھ کر باسن حوالے کیے اور کہا کہ ہمارا کھانا آئے گا تو تم کھا لینا ۔

آغا صاحب کو خبر جا پہنچی ۔ اتنے میں وہ آئیں ، یہاں کام ختم ہو چکا تھا ۔ (صفحہ ۳۴۸-۴۹)

چاہا تھا کہ شیخ علی حزیں کی طرح بنارس میں بیٹھ جائیں ۔ چنانچہ الہ آباد سے وہاں گئے، مگر اپنی ملت کے لوگ نہ پائے ۔ اس لیے دل برداشتہ ہو کر عظیم آباد گئے ۔ وہاں کے لوگ نہایت مروت اور عظمت سے پیش آئے ۔ مگر ان کا جی نہ لگا ۔ گھبرا کر بھاگے اور کہا کہ یہاں میری زبان خراب ہو جائے گی ۔ الہ آباد میں آئے ، پھر شاہ اجمل کے دائرے میں مرکز پکڑا اور کہا :

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

(صفحہ ۳۵۲)

. . . میں سمجھتا تھا کہ شیخ صاحب نے الہ آباد میں بیٹھ کر اس میں سے یہ مضمون تراشا ہوگا :

ایک تربینی ہے دو آنکھیں مری
اب الہ آباد بھی پنجاب ہے (صفحہ ۳۶۰)

. . . چنانچہ جن دنوں شاہ اجمل کے دائرے میں تشریف

رکھتے تھے تو وہاں تین گھرانے با برکت اور صاحب دستگاہ تھے ۔ تینوں جگہ سے وقت معمولی پر کھانا آتا تھا ۔ ایک خوان بلکہ دسترخوان شاہ ابوالمعالی کی سرکار سے آتا تھا ۔ اس میں ہر قسم کے امیرانہ اور عمدہ کھانے موجود ہوتے تھے ۔ ایک خوان سید علی جعفر کے ہاں سے آتا تھا کہ شاہ ابوالمعالی کی بہن اُن سے منسوب تھیں ۔ ایک خوان شاہ غلام حیدر صاحب کے ہاں سے آتا تھا ۔ اس پر بھی اپنا بورچی خانہ الگ گرم ہوتا تھا ۔ جس چیز کو جی چاہتا تھا ، پکواتے تھے ، دسترخوان پر وہ بھی شامل ہو جاتا تھا ۔ ایک دن بورچی سے خاگینہ کی فرمائش کی تھی ۔ اس میں کوئی سنپولیا گرا ہوگا ۔ چوں کہ دوبارہ یہ حرکت کی تھی ، آپ نے تاریخ کہہ دی ۔ تاریخ :

جان بلب آمد مرا از غفلتِ طباخ آہ !
می پزد خاگینہ با مارِ کریہہ از بہر من
چوں دگر بارہ خطا بنمود سال عیسوی
گفت دل مار سیہ پخت ابں سفیہ از بہر من

(صفحہ ۳٦۷-٦۸)

شاہ غلام اعظم افضل، ان کے شاگرد اکثر حاضرخدمت ہوتے تھے ۔ ایک دن آپ تخت پر بیٹھے تھے ، اس پر سیتل پائی کا بوریا بچھا تھا ۔ افضل آئے ، وہ بھی اسی پر بیٹھ گئے اور سیتل پائی کا ایک تنکا توڑ کر چٹکی سے توڑنے اور مروڑنے لگے ۔ شیخ صاحب نے آدمی کو بلا کر کہا کہ بھئی وہ جو آج نئی جھاڑو تم بازار سے لائے ہو ، ذرا لے آؤ ۔ اس نے حاضر کی ۔ خود لے کر شاہ صاحب کے آگے رکھ دی اور کہا ، صاحب زادے اس سے شغل فرمائیے ۔ فقیر کا بوریا آپ کے

تھوڑے سے التفات سے برباد ہو جائے گا ۔ پھر اور سیتل پانی اس شہر میں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا ۔ وہ بے چارے شرمندہ ہو کر رہ گئے ۔ (صفحہ ۳۶۳)

۰۰۰ ۱۸۳۱ع میں معتمد الدولہ آغا میر نے جو سوا لاکھ روپیہ قصیدے کا صلہ دیا تھا ، انھوں نے مرزائی صاحب کے حوالے کر دیا تھا ۔ لوگوں نے جانا ان کے گھر ہی میں ہے - چور نے رات کو نقب لگائی اور ناکام گیا ۔ آپ نے فرمایا ۔ تاریخ :

دزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب
نہ زر و سیم نہ بد مس ، خجل آمد بیروں
بہر تاریخ مسیحی چو بریدم سر دزد
دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

(صفحہ ۳۶۸)

تیسرا خط

جناب مولوی صاحب دام فضلہ ! پس تسلیم التماس آں کہ اس خط کے دو حصے ہیں : حصہ اول ، مرزا تقی ترقی نے خواجہ حیدر علی آتش کو فیض آباد بلوایا ۔ تجویز یہ تھی کہ وہاں رہیں ۔ اس زمانے میں میر خلیق بھی بلکہ ابتدائے رشد سے پندرہ روپیہ ماہوار کے نیشاپوریوں کے ہاں نوکر تھے ۔ مشاعرہ ہوا ، میر خلیق نے غزل کا مطلع پڑھا :

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے آدھر کا پہلو

اس بات پر آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں ہے تو میری کیا ضرورت تھی ؟ وہاں سے چلے آئے ۔ اور ضرورت شاگردی مصحفی کی یہ تھی کہ

میر حسن خود لے کر اپنے بیٹے کو مصحفی کے پاس آئے اور کہا کہ میں ”بدر منیر“ تصنیف کر رہا ہوں اور وہ سالار جنگیوں کے یہاں بلکہ خود سالار جنگ، برادرِ نسبتی شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم بھی تھے اور کہا کہ مجھے فرصت نہیں اور یہ ہر روز غزل لاتا ہے، تم دیکھ دیا کرو۔ اور لکھنؤ میں پیر بخارا ایک محلہ ہے، اس میں میر خلیق آکر ٹکا کرتے تھے۔ اور صورت پُرگوئی کی یہ تھی کہ مثلاً ایک لڑکا آیا اور اس نے کہا میر صاحب کل آٹھوں کا میلہ ہوگا، ہم جائیں گے، ایک غزل کہہ دو۔ اچھا بھائی کہہ دیں گے۔ نہیں، ہم کل میلے کو جائیں گے۔ اسی وقت غزل کہی۔ اس لڑکے نے کہا، یاد بھی کرا دو۔ غرض میر صاحب یاد کرا رہے ہیں۔ مصحفی کے وقت لکھنؤ میں غزل بِکا کرتی تھی۔ یہ بھی غزل کہہ کر فروخت کر دیتے تھے۔ ایک کوئی شخص غزل خرید اور تخلص ڈلوا کر ناسخ کے پاس پہنچا اور دو شعر پڑھے تھے کہ شیخ صاحب بگڑے اور کہا کہ ابے! یہ تیری ہے؟ یہ پیر بخارا والے کی ہے۔ میں خوب پہچانتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ مجلس میر ضمیر صاحب کی سازش سے ہوئی تھی اور اسی شخص کے مکان پر ہوئی تھی۔

میر علی حسن اشک تخلص، صاحب دیوان ہیں اور مولوی شہیدی تلمیذ ناسخ کے شاگرد۔ اب حیدر آباد دکن میں بہ زمرۂ منصب داراں ملازم ہیں۔ ان کے والد میر جنتی تخلص، مرثیہ گو، میر عماد خوش نویس کی اولاد سے۔ تلمذ دل گیر بیان کرتے تھے کہ وہ مکان جس میں میر خلیق ٹکا کرتے تھے، ہمارے تعلق کا تھا اور اس روز کی حکایت بیان کرتے تھے۔ اس روز سے فروغ میر خلیق کا ہوا۔ اس روز

تک ان کی یہ اوقات تھی کہ پیادہ پا فیض آباد سے آنا اور لکھنؤ سے دو تین سو روپیہ سالیانہ کمانا ۔ اپنے بچوں کی پرورش کرنا ۔ میر انیس اپنی ابتدائی حالت بیان کرتے ؛ کہتے کہ میں مشاعرے میں جب غزل پڑھتا تو دو چار دس آدمی رو کر لوٹنے لگتے، اور میر خلیق کے سامنے جب ذکر ہوتا کہ میر انیس خوب پڑھتے ہیں ، بہت بگڑے" اور آخری عمر میں حالانکہ چھوڑ دیا تھا ، مگر بعض اوقات اسی خیال سے کہ میں انیس سے اچھا پڑھتا ہوں ، منبر پر جا بیٹھتے اور سنا ہے خوب پڑھتے تھے اور ہاتھ اور پاؤں کو حرکت نہ ہوتی تھی ، ایک آنکھ کی گردش تھی ۔ شیخ امام بخش ناسخ نے ان کو بہت فروغ دیا اور ہمیشہ اپنے مجمع میں خلیق اور ان کے تین بیٹوں کی تعریف کیا کرتے تھے، اور پڑھنا تو حقیقت میں نایاب ہی تھا ۔ خلاصہ جو اس وقت تک سمجھ میں آیا ہے، یہ ہے کہ زبان اور بندش خلیق کی بھی اور میر انیس کی نایاب ہے اور مضمون اور مرثیہ گوئی کا خاتمہ مرزا دبیر پر ہو گیا ہے ۔ ایسے ایسے بین میں مضمون نکالتے کہ جواب نہیں ۔ خصوص تلمیح اور تملیح کا بادشاہ گزرا ہے ۔ اگر مجھ سے کوئی پوچھے تو میں دبیر کو سلطان الذاکرین کہوں ۔ ہاں ایک امر یعنی مضمون کی غیر واقعیت ، یہ مرض عام کل مرثیہ گویان ہند میں ہے اور رکاکت مضامین ، یہ بھی مرض مشترک ہے ۔ اور مولوی صاحب شعر میں جب تک مضمون نہ ہو، شعر نہیں اور اس کے مصنف کو شاعر نہیں کہنا چاہیے، بلکہ وہ وزان ہے ۔ اگر بہ حیثیت مضمون دونوں کا کلام منتخب کیا جائے تو باقی اس طرف بہت ہی کم رہ جائے گا ۔ مولوی حیدر علی صاحب "منتہی الکلام" ملا مکتبی تھا، اسے میر انیس

نے پڑھا ہے۔ اور عربی عبارت خوب پڑھ لیتے تھے۔ میرے سامنے
''عاشر بحار'' کی عبارت کو پڑھا کرتے تھے اور صحیح پڑھتے
مگر لغت زیادہ یاد نہ تھی ، غیر مانوس لفظ پوچھتے۔
بیان کرتے ہیں کہ ایک دن شیخ ناسخ کے پاس بیٹھا تھا
کہ میاں بحر آئے اور اپنا مطلع پڑھا ۔ شیخ نے اصلاح دی :

اگلی برسات پہ ساون کی گھٹا ٹل جائے

مقام اصلاح یاد نہیں رہا ۔ فقط ۔ میر حسن کی قبر محلہ
پیر بخارا میں ہے ۔ یار باقی صحبت باقی ۔

ذیل کی اطلاعات مندرجہ بالا خط سے ماخوذ ہیں :

ابتدا میں غزلیں بہت کہتے تھے اور والد بزرگوار سے
اصلاح لیتے تھے۔ جب شیخ مصحفی لکھنؤ میں پہنچے تو میر حسن
ان دنوں ''بدر منیر'' لکھ رہے تھے اور میر خلیق کی آمد کا
یہ عالم کہ مارے غزلوں کے دم نہ لینے دیتے تھے۔ شفیق باپ
کو اپنے فکر فرصت نہ دیتے تھے ۔ بیٹے کو ساتھ لے گئے ،
اپنی کم فرصتی کا حال بیان کیا اور اصلاح کے لیے شیخ
موصوف کے سپرد کر دیا . . . قدردانی نے اس کا ہاتھ پکڑا
اور نیشاپوری خاندان میں پندرہ روپیہ مہینہ کا نوکر رکھوا
دیا ۔ انھی دنوں میں مرزا تقی خان ترقی نے چاہا کہ فیض آباد
میں شعر و سخن کا چرچا ہو ۔ مشاعرہ قائم کیا اور خواجہ
حیدر علی آتش کو لکھنؤ سے بلایا ۔ تجویز یہ تھی کہ انھیں
وہیں رکھیں ۔ پہلے ہی جلسے میں جو میر خلیق نے غزل پڑھی ،
اس کا مطلع تھا :

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے آدھر کا پہلو

آتش نے غزل پھاڑ دی اور کہا جب ایسا شخص یہاں موجود

ہے تو میری کیا ضرورت ہے ؟ (صفحہ ۳۷۹)

''لکھنؤ آتے تھے تو پیر بخارا میں ٹھہرا کرتے تھے۔ پرگوئی کا یہ عالم تھا کہ مثلاً ایک لڑکا آیا، اس نے کہا، میر صاحب! آٹھوں کا میلہ ہے، ہم جائیں گے، ایک غزل کہہ دیجیے۔ اچھا بھئی کہہ دیں گے۔ میر صاحب ! میلہ تو کل ہے ہم کل جائیں گے، ابھی کہہ دیجیے۔ اسی وقت غزل لکھ دی۔ اس نے کہا یاد بھی کروا دیجیے۔ میر صاحب اسے یاد کروا رہے ہیں۔ ان دنوں میں غزلیں بکا کرتی تھیں ... یہ بھی غزلیں کہہ کر فروخت کرتے تھے ... ایک دن ایک خریدار آیا اور اپنا تخلص ڈلوا کر شیخ ناسخ کے پاس پہنچا کہ اصلاح دیجیے۔ شیخ صاحب نے غزل کو پڑھ کر اس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا، ابے تیرا منہ ہے جو یہ غزل کہے گا ؟ یہ وہی پیر بخارا والا ہے۔ (صفحہ ۸۰-۳۷۹)

''میر علی حسن اشک تخلص کہ میر عماد خوش نویس کی اولاد میں ہیں، خود ناسخ کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ ان کے والد جنتی تخلص، فقط مرثیہ کہتے تھے اور میاں دل‌گیر کے شاگرد تھے۔ میر اشک بھی حیدر آباد میں بہ زمرۂ منصب داراں ملازم ہیں۔ ان کی زبانی مولوی شریف حسین خاں صاحب نے بیان کیا کہ لکھنؤ میں ایک غریب خوش اعتقاد شخص بڑے شوق سے مجلس کیا کرتا تھا ... یہ معرکہ ان کے مکان پر ہوا تھا اور میر ضمیر کے اشارے پر ہوا تھا۔ (صفحہ ۸۴-۳۸۳)

''میر خلیق نے اپنے والد کے بعد چند روز بہت سختی سے زندگی بسر کی۔ عیال فیض آباد میں تھے ... میر موصوف لکھنؤ میں آتے تھے۔ سال بھر میں تین چار سو روپے حاصل

کرکے لے جاتے تھے اور پرورش عیال میں صرف کرتے تھے ... ان کے ادائے کلام اور پڑھنے کی خوبی دیکھنے اور سننے کے قابل تھی ۔ اعضاء کی حرکت سے بالکل کام نہ لیتے تھے ۔ فقط نشست کا انداز اور آنکھ کی گردش تھی ۔
(صفحہ ۳۸۴)

''میر خلیق نے اپنے بڑھاپے کے سبب سے اخیر عمر میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا ... میر انیس کی مرثیہ خوانی مشرقِ منبر سے طلوع ہونے لگی تھی ۔ جب کوئی آ کر تعریف کرتا کہ آج فلاں مجلس میں کیا خوب پڑھے ہیں ... تو انہیں خوش نہ آتا تھا ۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ اسی عالم ناتوانی میں منبر پر جا بیٹھے اور مرثیہ پڑھا ۔ اس سے مطلب یہ تھا کہ اس گئی گزری حالت میں بھی ہمیں درماندہ نہ سمجھنا ۔''
(صفحہ ۳۸۵)

یہاں ایک بات خصوصیت سے قابل غور ہے ۔ آزاد کے نامہ‌نگار نے کھلم کھلا لکھ دیا کہ میر خلیق ، انیس کی تعریف پر ''بہت بگڑتے تھے'' ۔ آزاد نے اس مضمون کو نہایت ملائم طریقے سے بیان کر دیا ہے ۔ یہ ان کا مخصوص طرزِ نگارش ہے اور اس سے ان کی گہری عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے ۔

چوتھا خط

۲۸ جون ۷۶ع

ادیب شفیق ، حبیب لوذعی و العمی ، مولوی محمد حسین صاحب عربی پروفیسر کالج لاہور ۔ السلام علیکم ۔ علیکم سلامی ۔

آپ کا مہربانی نامہ ۲۲ جون کا اس دور افتادہ کو ملا ۔ اس کا ورود میرے لیے فتح الباب ِ مسرت ہوا ۔ آپ کا ارادہ نسبت تالیف تذکرۂ مشاہیر شعرا اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ اِس تذکرے میں ہر شاعر کے تاریخی حالات اور اس کی سوانح عمری کے واقعات ، لطائف اور تلامذۂ رحمانی کا آپ نے التزام فرمایا ہے اور بہ‌عنایت الٰہی اس کا تکمیل پر پہنچنا دریافت ہو کر نہایت درجہ مسرت حاصل ہوئی ۔ اگرچہ میں سرمایۂ علمی بہت کم رکھتا ہوں ، الا ایسے امور کا نہایت شائق ہوں ۔ اور افسوس ہے کہ وقت لکھنے اس تذکرے کے میں آپ سے دور تھا ورنہ آپ کو تاریخی حالات شعراء کی نسبت سوائے حالات مرزا اسداللہ خاں غالب کے زیادہ تر امداد دی جاتی ، کیوں کہ میں نے اپنے والد ماجد سے بہت کچھ سنا ہے ۔ میں ایک خاکستر ہوں اس خرمن سوختہ کا جسے آتش غدر ۵۷ع نے جلا دیا ۔ اب آپ نے مخدومی و مکرمی عمی مرزا غالب کا حال دریافت کیا ہے ۔ اگرچہ اس کا منصب عمومی مکرمی جناب نواب ضیاءالدین خاں صاحب بہادر کو حاصل ہے ۔ وہ بالاستیعاب ان کے حال سے آپ کو اطلاع دیتے ۔ بدیں وجہ کہ وہ مجھ سے زیادہ کہن سال بھی ہیں اور ان کے معلومات افہام و اوہام کے نزدیک معتمد علیہ اور معتبرتر ہے ۔ مگر خیر جو کچھ مجھے معلوم تھا ، وہ حوالۂ قلم ہے ۔

آپ کو واضح ہو کہ جناب مرحوم سے مجھے تلمذ بھی تھا اور غایت درجہ ان کو مہر و شفقت میری نسبت تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باہم میرے والد کے اور ان کے زیادہ محبت اور مودت تھی ۔ اور چوں کہ وہ

صاحبِ اولاد نہ تھے ، مثل فرزندوں کے مجھے تربیت کیا ۔ میرے علم میں جو کچھ ہے ، اسے بے تکلف لکھے دیتا ہوں ۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اور راویان صادق کی تحقیق کے مطابق ہو یا نہ ہو ۔

آپ کا سوال نسبت تبدیلی تخلص ۔ جواب ۔ مجھ کو یاد ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ۱۸۲۸ع یا ۲۹ کے قریب انہوں نے تخلص تبدیل کیا اور واقعی اسداللہ خاں کے نام کے واسطے غالب ہی تخلص زیبا تھا ۔ کیوں کہ جناب امیر علیہ سلام کا یہ لقب قرار پا گیا تھا ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی اسد نامی ایک فرومایہ ہونگا ، کوڈھبا ، جھجھر کا شعر کہتا تھا ۔ اس کے ایک مقطع میں لفظ اسد ان کی نظر سے گزرا اور وہ مقطع یہ ہے :

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

ہم تخلص ہونا جناب مرحوم کو، ایسے لوگوں سے ، جو تہمت آدم ہیں ، نہایت مکروہ معلوم ہوا ۔ اس وجہ سے اسداللہ خاں کے ساتھ لفظ غالب کو موضوع کر دیا ۔

دوسرا سوال بابت مذہب مرزا صاحب و آبائے مرزا صاحب ۔ جواب : اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب اولادِ سلم اور تور سے ہیں اور ترکمان کہلاتے ہیں ۔ اجداد آن کے شیعہ مذہب نہ تھے ۔ اور اس ملک کا آدمی اور خصوصاً یہ ترکمان لوگ اکثر تفضیلی ہیں ۔ اور مرزا صاحب کو نظر سیر اور تاریخ پر تھی ۔ ان کے نزدیک حقیّت خلافت امامت کے ثابت ہوئی ۔ ماسوا اس کے کثرت صحبت اہل ایران کے ساتھ اور خصوصاً نواب حسام الدین حیدر خاں

معروف کے ساتھ اور بخشی محمود خان کے ساتھ اس امر کے باعث ہوئے کہ وہ علی پرست ہو گئے اور غلو ان کا ہنگام مباحثہ تھا ، نہ یہ کہ وہ تبترائی ہوں ۔ بزرگوں میں مرزا صاحب کے ، کسی کو ہم کیش مرزا صاحب نہ سنا ۔

تیسرا سوال کہ کس سنہ میں شعر کہنے شروع کیے؟ جواب : سنہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ۔ مگر عنفوانِ جوانی سے طبیعت نے راہ دی اور یہ ہی شغل رہا ۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں ۔

چوتھا سوال : ہرمزد ثم عبدالصمد کا معاملہ ۔ جواب : آپ کی زبان سے میں نے اکثر سنا کہ وہ ان کا استاد تھا اور وہ تاجر تھا ۔ اقتناء ذخائر کے لیے آگرے کو اس نے امیدگاہ بنایا تھا ۔ پس اگر مرزا صاحب جھوٹے تصور کیے جائیں تو یہ روایت بھی بے اصل محض ہے اور جب یہ روایت بے اصل ہے تو پھر القاء اور الہام کو ماننا پڑے گا ۔ ایسا متعلم سوائے سروش غیبی کے اور کیسے فیض پذیر ہو سکتا ہے ؟

پانچواں سوال : کتب مصنفہ کی تدوین ۔ جواب : ”دیوان فارسی“ ۱۸۳۳ع ، ۱۸۳۵ع میں ترتیب ہو گیا ۔ انطباع کا زمانہ مجھے یاد نہیں ۔ وہ الواح طبع سے مل سکتا ہے ۔ ”دیوان اردو“ ۱۸۳۹ع کے بعد ترتیب پذیر ہوا ۔ ”مہر نیم روز“ شاید ۱۸۵۱ع میں شروع ہوئی ۔ ”دستنبو“ ۱۸۵۷ع میں لکھی گئی ۔ اور اسی ۱۸۵۰ع اور ۱۸۵۱ع میں باریابی ارک پایا اور حکیم احسن اللہ خاں کے تقاضے سے تاریخ نگاری شروع کی ۔ ورنہ بادشاہ خود ایسے اشواق و اشغال سے معرا تھے ۔

چھٹے سوال کا جواب بھی اسی پانچویں میں آ گیا ۔

ساتواں سوال : کلکتے میں طرح ”باد مخالف“ اور اس

کی وجہ - جواب : اہل پورب اور بنگالہ بوجہ بے مذاقی کے قتیل پرست اور مادھو رام ستائی ہیں - اور مرزا صاحب کو اہل ہند کی نسبت کلام رہا - چنانچہ مرزا صاحب کے اس شعر سے مستفاد ہے - شعر :

لیک ناید ز من کہ در گفتار مدحتِ لالہ سور داس کنم

اور باعث اس تفضیح کے چند بے تمیزان کلکتہ ہوئے کہ وہ لوگ آدابِ مہمان نوازی اور ہنر شناسی سے عاطل ہیں - بجائے تکریم ضیف، تسویم و تفحیم ضیف کی گئی - اور اس تقریب کے باعث مولوی عبدالقادر صاحب نام اور مفتی کبیر احمد صاحب دو بزرگِ کلکتہ تھے - اور یہ دونوں آدمی کالج گورنمنٹ میں معلم اور مشاہیر سے تھے - ترنرمکان صاحب نے شاہنامے کی تصحیح کہ جس کو گویا تفضیح کہنا چاہیے ، ان دونوں صاحبوں کی پشت گرمی سے کی تھی - بالجملہ اسی بنا پر مثنوی ''باد مخالف'' لکھی گئی -

آٹھواں سوال : نواب مصطفیٰ خان کو ہدایت غیبی - جواب : ہدایت غیبی رفیق حال ہوئی مگر حالت شیبی سے پہلے رنگ جا ہوا تھا - اگر رم جو منہیات میں داخل نہیں ہے تو بنت العنب سے مضائقہ کس لیے ؟ شعر :

ہوگی چھٹی شراب و لیکن کبھی کبھی
پیتے تھے روز ابر و شبِ ماہتاب میں

مگر ہاں انصاف کہ میاں عبدالغنی صاحب سے خانقاہ میں جب تجدیدِ بیعت کی اور خود بھی کسی قابل نہ رہے تو توبۂ کامل حاصل ہوئی اور شاید پاس داشت حدیث خوانی ملحوظِ خاطر اسلام شکوہ رہا ہو -

نواں سوال : مولوی الطاف حسین حالی کی روایت -

جواب : واقعی مرزا صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ دقت اشارات و معنی و غرابتِ ترکیب ہم اردو میں نہ کرتے، اگر طباع و افہام کو ایسا ناقص جانتے۔

محبا! میں احباب کی خدمت گزاری کو عموماً حاضر ہوں اور آپ کی اس مہجور پرسی کا شاکر۔ جب کسی وقت کوئی کام ہو تو آپ ارقام فرمائیں، اس کا سرانجام میرے لیے سرمایۂ مسرت ہے۔ مگر اس معاملۂ خاص میں با ہمہ بے بضاعتی میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں اور یہ امر بے تلاقی ممکن نہیں۔ اگر آپ تصنیف کی تکمیل چاہتے ہیں تو دو چار روز کے لیے مع اس تالیف شریف کے یہاں تک رنجہ فرمائیں۔ یہ امر نہ دشوار اور نہ شاید آپ کو اس میں جائے انکار۔ ریواڑی سے لوہارو تک میرے ہاں کی سواریاں حاضر ہو سکتی ہیں۔ اور لاہور سے ریواڑی تک ریل کی سبیل ہے۔ زیادہ والسلام و الاکرام۔ میں ناتندرست ہوں ورنہ اپنے ہاتھ سے خط لکھتا۔"

المعذور معاف علاء الدین

پانچواں خط

جناب من! مجھے جب آپ کے تذکرے کے عالی خیالات اور مضامین کا تصور آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ اب تک شائع کیوں نہیں ہوا۔ مگر جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ کو بندہ سے سچا سچا حال سب شاعروں کا معلوم ہوا تو بہت سے شاعروں کے شاگرد زندہ ہیں، وہ فی مافی کرنے کو تیار ہوں گے اس لیے ایک عذابِ جان بن جائیں گے۔ اب مرزا (غالب) کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ

سکتا تھا ۔ سنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا ۔ جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا ۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صہبائی شعر کہنا کیا جانے ۔ نہ اس نے شراب پی ، نہ اس نے قمار بازی کی ، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں ، نہ جیل خانے میں پڑا ۔ طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس دس جگہ پہنچاتا تھا ۔ اس لیے قصائد میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے بلکہ ان پر نمبر لگائے ہیں ۔ سیز دہم ، دہم ، نہم ۔ میرے نزدیک فقط اس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ خصائل اور اخلاق سے بحث نہ ہو ۔ میاں غلام امام شہید فارسی کے شاعر، مرزا قتیل کے شاگرد ہیں ۔ وہ مرزا کو یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں وہ اور مشرق میں میں ۔ غالب کا خود قول یہ تھا کہ جب سے ہندوستان میں فارسی کا چرچا ہوا دو شاعر ہوئے ہیں، ایک غالب اور دوسرا خسرو ۔ ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب مصطفٰی خاں مرحوم اور ایک اہل شیراز کا حجاز کے سفر میں جہاز کے اندر صحبت کا اتفاق ہوا ۔ انھوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کے لیے دیا ۔ اس نے ایک نظر ایک آدھ روز دیکھ کر واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ ”دریں خرافات اوقات ضائع نکنیم ۔ ما نمی دانیم کہ در کدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است ۔“

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک شیرازی سید باقر علی جو آگے چل کر عیسائی ہو گیا تھا ، جان مور نام رکھتا تھا ۔ وہ ذوق مرحوم کے پاس جاتا تھا ۔ وہ اس سے مشکل شعر مرزا کے

پوچھتے تھے ، وہ فوراً معنی بتا دیتا اور محاورے کی ایک دو غلطی . . . (؟) عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا ، لیکن اردو کی نظم و نثر اس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں ۔ تاریخی یا علمی مضامین کے نہ ہونے کا اعتراض مدرسے کے تربیت یافتوں کو سوجھتا ہے اور منشی اور دبیر جو پہلے زمانے کے ہیں ، وہ خود بھی نہیں جانے ۔ ''نکات غالب'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفل مکتب تھا ۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اس کو اور کسی مضمون سے خبر ہی نہیں ۔ اگر کوئی لڑکا بھی خان آرزو کی تصنیفات پر ایک نظر سرسری ڈالے تو اس کو مرزا کے نکات سے دس گنے زیادہ نکتے یاد ہو جائیں گے . . . ہاں مجھے ایک پہیلی کہہ دو ۔ میں جغرافیۂ طبعی میں اسے لکھ دوں گا کہ آزد جو اول ہندوستان میں نیچرل پوئٹ (Natural Poet) ہے ، اس نے اس کے مضمون کو . . . وہ مضمون یہ ہے کہ خشکی و تری میں ایک رشتہ زن و شوئی کا ہے ، جب تک پانی مٹی سے نہیں ملتا ، کوئی نبات پیدا نہیں ہوتا ۔ دوسرا رشتہ ان میں دختر و مادر کا ہے ۔ یعنی چیستان ہوتی جائیں کہ وہ دو چیزیں کیا ہیں کہ جو جورو خصم بھی ہیں اور ماں بیٹیاں بھی ہیں ۔''

اس عجیب و غریب خط کے مصنف منشی ذکاء اللہ دہلوی ہیں ۔ بہت عرصے تک یہ معلوم نہ ہو سکا ، کیوں کہ اگرچہ خط پر ان کا دستخط موجود ہے ، لیکن اسے پڑھنا دشوار تھا ۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مصنف نے آزاد سے ایک پہیلی کی درخواست کی ہے ، شاید مجموعۂ ''نظم آزاد'' سے یہ گتھی سلجھائی جا سکے۔ کتاب کے مطالعے پر وہ پہیلی مل گئی

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ منشی ذکاءاللہ کی سفارش پر لکھی گئی تھی۔[1]

یہاں ان خیالات پر، جو مذکورہ بالا خط میں مرزا غالب کی شاعری اور شخصیت کی بابت ظاہر کیے گئے ہیں، رائے زنی کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک بالکل علیحدہ موضوع ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ آزاد نے اس تخریبی مواد کو جو اس خط میں بہ افراط موجود ہے، بالکل استعمال نہیں کیا۔ اور یہ اس غالب دشمنی کی، جو عموماً ان سے منسوب کی جاتی ہے، نقیض ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بزرگوں کی توہین یا ان کے نقائص اور کمزوریوں کو کھلم کھلا بیان کرنا آزاد کی روایتی عقیدت مندی کے منافی تھا۔ وہ واقعی ''خطاے بزرگاں گرفتن خطا است'' پر عمل پیرا تھے۔

میرے اس خیال کی تردید میں مخالفین تین مثالیں پیش کریں گے؛ اول یہ کہ آزاد نے میر کی بے دماغی پر بہت زور دیا ہے۔ دوسرے انھوں نے مرزا جان جاناں کے مذہبی تقدس کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان کی حسن پرستی کو نہایت کھلم کھلا انداز میں پیش کیا ہے۔ تیسرے انھوں نے غالب کی شاعرانہ عظمت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ باتیں میرے مضمون کا موضوع نہیں، تاہم نہایت مختصراً ان کا جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔

میر کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ واقعی تمام تذکرہ نویس ان کی بے دماغی کو نہایت شد و مد سے بیان کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں خود میر کے اپنے بیانات سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے اقتباسات

۱۔ دیکھیے ''جغرافیہ طبعی کی پہیلی''، نظم آزاد، صفحہ ۱۴۶۔

ملاحظہ کیجیے :

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل شورشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ
از بسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

اور :

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے ، جھگڑا ہے آسماں سے

میر کی افتادِ طبیعت کا اندازہ صرف ایک مثال سے ہو سکتا ہے ۔ حاتم اردو کے ایک مستند شاعر تھے ، لیکن چونکہ وہ مرزا کے استاد تھے ، جنھیں وہ اپنا حریف خیال کرتے تھے ، اس لیے انھیں ''مردے است جاہل و متمکن'' کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے اور جب اس سے بھی اُن کے دل کی بھڑاس نہیں نکلی تو ان کا شعر :

ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا
آگے آیا مرے ، کیا میرا

نقل کر کے یوں تصحیح فرماتے ہیں :

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں
آگے آیا مرے ، کیا میرا

رہا مرزا جان جاناں کا قصہ ؛ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ زندگی کی قدریں بدلتی رہتی ہیں اور عین ممکن ہے کہ جو باتیں آج مابہٗ شرافت خیال کی جاتی ہیں ، کل موردِ عتاب خیال کی جائیں ۔ آج کل ہم عشق کے نام سے بہت گھبراتے ہیں اور مردانہ حسن کی تعریف ایک مذموم فعل تصور کیا جاتا

ہے ، لیکن آج سے سو برس پہلے امرد پرستی کا عام رواج تھا۔ خصوصاً صوفیاے کرام کے نزدیک اسے معرفت الٰہی کا زینہ سمجھا جاتا تھا۔ آزاد نے مرزا جان جاناں مظہر کی عام حسن پرستی ، اور خصوصاً تاباں پر شیفتگی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ، وہ ان مستند روایات پر مبنی ہے جو خود ان سے یا ان کے اکابر خلفا سے منسوب کی جاتی ہیں ۔ مثلاً اپنی کتاب ''معمولات مظہری'' میں ان کے خلیفہ شاہ نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں :

''از حالت صبا و شیرخوارگی انوار عشق . . . از جبیں مبین ایشان ظاہر و ہویدا بود . . . در کنار خوب روے بہ رغبت تمام مے رفتند و از کنار او جدا نمی شدند مگر بہ حیلہ ؛ و از سن شعور مصرع موزوں می نمودند۔ ازیں جا ست کہ می فرمودند کہ شاعری و پریشان نظری از خمیرِ طینتِ فقیر است[1]۔''

ان کے ایک دوسرے خلیفہ شاہ عبد اللہ معروف بہ شاہ غلام علی اپنی تصنیف ''مقامات مظہری'' میں یوں رقم طراز ہیں :

''می فرمودند شرر عشق و محبت خمیر مایۂ طینت من است و خاطر را از آغاز صبا میل تمام بہ مظاہر جمیلہ ثابت ۔ مرا یاد است کہ طفل شش ماہہ در آغوش مرضعہ بودم ۔ زنی جمیلہ مرا در کنار گرفت ۔ جلوۂ جمالش دلِ مرا از جا بردہ و خاطر را بہ او وابستگی پیدا شد ۔ دلم بے دیدار او قرار نمی‌گرفت ۔ در فراقش گریہ ہا مے کردم ۔ پنج سالہ بودم کہ آوازۂ عاشقی من بر زبانہا افتاد و در مردم مشہور گشت کہ

---

۱ - مظہر کی بابت یہ تمام اقتباسات ''آب حیات کا تنقیدی مطالعہ'' مصنفہ سید مسعود حسن رضوی (۱۹۵۳ع) اور ''مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا اردو کلام'' مرتبہ عبدالرزاق قریشی (۱۹۶۱ع) سے نقل کیے گئے ہیں ۔

این پسر مزاج عاشقانہ می دارد ۔

می فرمودند کہ جاذب محبت ۰ن آں قدر رسا بود کہ عوارض جسمانی شاہدان بر طبیعت من ظاہر می شد ۔ یک بار جوانے کہ منظورِ نظرم بود ، تب کرد ، مرا نیز تب عارض شد ۔ وی دوا خورد و اثرِ دوا در من پدید آمد ۔''

علاوہ ازیں دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی حسن پرست طبیعت کا ذکر کیا ہے ۔ فضل علی خاں لکھتے ہیں : ''اکثر جوانانِ رعنا سے محشور تھے'' سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ ''انھیں تاباں سے محبت تھی اور اس کے غم میں زار و نزار تھے ۔ بعض تذکرہ نگاروں نے محمد فقیہ صاحب درد مند اور انعام اللہ خاں یقین سے مرزا کے تعلقات کو بھی اس رنگ میں پیش کیا ہے ۔ خوش گو کو مرزا سے بہت محبت اور عقیدت ہے ، وہ ان کی عشقیہ زندگی کا ایک واقعہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ مرزا صاحب اور ان کے منظورِ نظر میں کچھ جھگڑا ہو گیا ۔ مرزا صاحب چھ مہینے تک اس مسجد سے باہر نہیں نکلے جس میں ان کی اقامت گاہ تھی ، اور اس مسجد میں انھوں نے اپنے لیے قبر بنوائی تھی اور دن رات اس قبر میں پڑے رہتے اور ہر وقت آہ و بکا کرتے ۔

صاحبِ ''معمولات مظہری'' کے الفاظ میں مرزا جان مرزا صاحب کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتے تھے :

''ہر کہ دلش بداغ عشق برشتہ نمی شود ، و خاشاک طبیعت او سوختہ و پاک نمے گردد زمین طینت او صلاحیت تخم محبتِ الٰہی ندارد ۔ زیرا کہ عشق مجازی زینۂ عشق حقیقی است ۔ پس مادامیکہ رشتۂ عشق مجازی طوق گلو کردہ در کوچہ و بازار رسوا و خوار نسازید ۔ روح فقیر از شما راضی

نخواہد شد ۔''

بندرابن خوش‌گو ''سفینۂ ہندی'' میں لکھتے ہیں :

''مرزا جان جاناں۔ ۔ ۔ باوجود رعایت عالم سلوک و احتیاط ہائے کامل خود را بہ عشقِ جواناں در باختہ ۔''

شیفتہ نے بھی مرزا مظہر کو تاباں کے حسن کا پروانہ لکھا ہے۔

انعام اللہ خان یقین : نواب اظہرالدین کے بیٹے ، نہایت خوش رو ، خوش گو اور خوش خلق تھے۔ مصحفی لکھتا ہے : ''مرزا جان جاناں او را بسیار دوست داشتے و اکثر بخانہ اش شب را روز و روز را شب کردے'' ۔

پروفیسر شیرانی کی رائے میں آزاد خصوصاً اس وجہ سے گردن زدنی تھے کہ انھوں نے ایک جلیل‌القدر صوفی کی توہین کی ہے ، اور آپ اسے آزاد کے ایک متشدد شیعہ ہونے پر محمول کرتے تھے ۔ لیکن وہی بات جسے پروفیسر شیرانی معیوب خیال کرتے تھے ، خود مرزا جان جاناں اور ان کے خلفاء محمود و مستحسن خیال کرتے ہیں :

آں کہ پیشِ تو حرام است حلال است ایں جا

مرزا غالب کی آزاد نے وہ مدح ستائی نہیں کی جس کا آج کل رواج ہے اور جس کے وہ مستحق ہیں ۔ لیکن جس وقت تذکرۂ ''آب حیات'' لکھا گیا تھا ، اس وقت مرزا کو ایک جلیل القدر شاعر خیال نہیں کیا جاتا تھا اور یہی حال مرزا کے ہم عصروں کا تھا ۔ وہ ذوق کی شاعری کو معراجِ کمال تصور کرتے تھے ۔ غالب کی شہرت کا عروج حالی کی ''یادگار غالب'' سے ہوتا ہے۔

آزاد کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ غالب کے شاعرانہ کمالات پر پانی پھیر دیا جائے ۔ انھوں نے ان کی بابت وہی کچھ لکھا ہے جو اس وقت درست خیال کیا جاتا تھا ۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ ''آب حیات'' کی طباعت پر کئی اصحاب نے اس پر نہایت کڑی تنقید کی لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ آزاد نے غالب سے انصاف نہیں کیا ۔

غالب کا جو کلام آزاد نے ''آب حیات'' میں پیش کیا ہے ، وہ مولانا حالی کے مشورے سے انتخاب کیا گیا تھا ، جیسا کہ ذیل کے خط سے ظاہر ہے :

''جناب مولوی صاحب مخدوم و مکرم ! اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کر دی ۔ الحمدللہ کہ ''تذکرۂ مشاہیر شعرائے اردو'' چھپنا شروع ہو گیا ہے ۔ اس پر اپنا ناچیز ریویو لکھنے کو تیار ہوں . . . اخیر زمانے میں جو غزلیں مرزا صاحب نے لکھی ہیں ، ان میں سے چند کا پتہ دیتا ہوں :

(۱) جمال اچھا ہے ۔ کمال اچھا ہے ۔
(۲) ظہور کی ۔ طیور کی ۔
(۳) روا نہ ہوا ۔ ادا نہ ہوا ۔
(۴) یار ہوتا ۔ انتظار ہوتا ۔
(۵) بر نہیں آتی ۔ نظر نہیں آتی ۔[1]

۱۷ ستمبر ۱۸۸۰ع
خاکسار نیاز مند
الطاف حسین حالی ۔''

---

۱ ۔ مکتوبات آزاد ۔

خیر یہ تو ایک طویل جملۂ معترضہ ہے - میرا منشا اس مضمون سے یہ ہے کہ مستند شواہد کی بنا پر اس خیال کی تردید کی جائے کہ ''آب حیات'' من گھڑت قصے کہانیوں پر مشتمل ہے - میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم آج ایک حدِ فاصل پر کھڑے ہیں - ہمارے ایک طرف ایسا عہد ہے جس میں مولانا آزاد کے کمالات اور ان کی مساعی پر تعصب اور لاعلمی کے پردے پڑے ہوئے ہیں ، دوسری طرف ایک ایسے دور کا آغاز دکھائی دیتا ہے ، جس میں بیشتر احتمالات آہستہ آہستہ مرتفع ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے اسن نہایت آب و تاب کے ساتھ دکھائی دے رہے ہیں - وہ زمانہ دور نہیں جب ''آب حیات'' کی مخالفت حقائق سے بد ظنی کے مترادف خیال کی جائے گی -

---

اردو کا پہلا صحافی

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ شمالی ہند میں اردو صحافت نگاری کا آغاز مولوی محمد باقر سے ہوا ، جو مولوی محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار تھے ۔ لیکن نہ ان کی زندگی کے حالات باقاعدہ طور پر جمع کیے گئے اور نہ ان واقعات پر ، جو عموماً ان سے منسوب کیے جاتے ہیں ، ناقدانہ نظر ہی ڈالی گئی ہے ۔ یہاں ان کی زندگی کے وہ تمام حالات ، جو مجھے گزشتہ پندرہ سالوں میں مختلف ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں ، یک‌جا کر دیے گئے ہیں ۔ مولوی باقر کی وفات کو آج سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے ، اس لیے ان کی زندگی پر مبصرانہ نظر ڈالنا اور حقائق کو روایات سے جدا کرنا قریب قریب نا ممکن ہے ۔ بہر حال جو کچھ بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے ، حقیقت سے بہت قریب ہے اور اسے نہایت قابل اعتبار اور مستند ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے ۔

مولوی محمد باقر کے مورث اعلیٰ ہمدان واقع ایران سے تعلق رکھتے تھے ۔ آپ کا نام خلیفہ محمد شکوہ تھا ۔ آپ شاہ عالم کے دور حکومت میں وارد ہندوستان ہوئے اور دہلی میں اقامت اختیار کی ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے عہد کے مستند عالم تھے ۔ جلد ہی ان کا تعلق دہلی دربار سے ہو گیا اور وظیفہ ملنے لگا ۔

خلیفہ محمد شکوہ اور ان کے اخلاف کے حالات زندگی معلوم کرنے کے لیے لا محالہ ان کی خاندانی روایت کا سہارا لینا

پڑتا ہے، لیکن باوجود ان اطلاعات کے ان کی شخصیت کچھ بہت زیادہ متعین نہیں ہوتی - صرف مولوی محمد باقر ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں - آپ نے دہلی کالج میں اس وقت تعلیم پائی جب یہ ادارہ اپنی زندگی کی ابتدائی منازل طے کر رہا تھا - فارغ التحصیل ہونے کے بعد سرکار انگریزی کی ملازمت میں منسلک ہوئے اور رفتہ رفتہ نائب تحصیل دار ہو گئے - لیکن ان کے والد اس سے مطمئن نہ تھے، اس لیے ملازمت سے مستعفی ہو کر میدان صحافت میں قدم رکھا -

مولوی صاحب نے یہ فیصلہ کیوں کیا ؟ یہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں غدر کے زمانۂ ما قبل کا جائزہ لینا ہوگا -

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جوں جوں خاندان مغلیہ کی جڑیں کھوکھلی ہوتی گئیں، فارسی زبان اور ادب اپنا وقار کھوتے چلے گئے - سرکار انگریزی خوب جانتی تھی کہ فارسی اور حکومت مغلیہ لازم و ملزوم چیزیں ہیں، اور اگر اردو یعنی عوام کی زبان، فارسی، یعنی حکمرانوں کی زبان، کی جگہ لے لے تو حکومت مغلیہ کے مٹتے ہوئے اقتدار کو زبردست چرکا لگے گا - بنابریں محض سیاسی مصلحت کی بنا پر حکومت انگریزی نے یہ فیصلہ کیا کہ شمالی ہند کی سرکاری زبان اردو ہو - یہ ۱۸۳۵ع کی بات ہے - اس وقت شمالی ہند نشأۃ ثانیہ کی ابتدائی منازل سے گزر رہا تھا اور بہ تدریج ایک ایسی علمی اور ادبی فضا تیار ہو رہی تھی جس میں مغربی علوم و خیالات کو بڑا دخل تھا - پرانا جمود ٹوٹ چکا تھا، اور زندگی میں ایک ہلکا ہلکا تموج پیدا ہو رہا تھا - صحافت نگاری، جس کا اس وقت آغاز ہوا، نہ صرف اس بیداری کا نتیجہ تھی، بلکہ اس کی مددگار بھی ثابت

ہوئی ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں چند ہی سالوں میں بہت سے اردو اخبار جاری ہو گئے ۔

جب مولوی محمد باقر نے اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا تو انھیں ایک پریس کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ حسن اتفاق سے انھیں ایک نہایت عمدہ پریس ہاتھ آ گیا جس کے باب میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسے مسٹر ٹیلر، پرنسپل دہلی کالج نے نصابی کتابیں چھپوانے کے لیے خریدا تھا ۔ لیکن ڈکشنری آف نیشنل بایو گرافی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پریس درحقیقت ڈاکٹر سپرنگر، پرنسپل دہلی کالج، کے زمانے میں خریدا گیا تھا اور اس میں وہ کتابیں چھاپی جاتی تھیں جو کالج کے نصاب میں داخل تھیں ۔ لیکن یہ کام زیادہ عرصہ نہ چل سکا ۔ وجہ یہ تھی کہ ان کتابوں کے لیے کالج سے باہر مانگ نہ تھی، اور چوں کہ یہ نہایت محدود تعداد میں چھپتی تھیں، اس لیے ان پر بہت لاگت آتی تھی ۔ چنانچہ یہ پریس بہت عرصہ بیکار پڑا رہا ۔ اور مسٹر ٹیلر کی، جو ان دنوں پرنسپل تھے، یہ خواہش تھی کہ اونے پونے داموں بیچ کر اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے ۔ مولوی باقر کے لیے اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا ۔ مسٹر ٹیلر سے ان کے گہرے اور دیرینہ مراسم تھے لہٰذا انھوں نے پریس خرید لیا اور اپنے مشہور اخبار ''دہلی اردو اخبار'' کی بنا ڈالی ۔

''دہلی اردو اخبار'' کا سالانہ چندہ ۲۰ روپیہ تھا ۔ اس کے بیشتر پرچے غدر میں تلف ہو گئے اور آج کل بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں ۔ لیکن جو مواد ملتا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اخبار ملکی اور غیر ملکی خبریں چھاپنے کے علاوہ ایک ادبی حیثیت رکھتا تھا ۔ اس میں مشاہیر شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا اور

خصوصاً وہ واقعات جو قلعۂ معلی سے تعلق رکھتے تھے ، خاص اہتمام سے شائع کیے جاتے تھے ۔ اپنے چندے کی گرانی کی وجہ سے یہ اخبار خواص تک محدود رہا ، لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ملک میں اخبار بینی کا شوق بڑھ رہا ہے ، مولوی محمد باقر نے ایک اور اخبار بہ نام ''مظہرالحق'' جاری کیا ، جس کا چندہ دس روپے تھا ۔ غالباً یہ ۱۸۴۵ع کی بات ہے ۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ادارہ ، جس نے شمالی ہند میں سادہ نثر کی بنیاد ڈالی ، دہلی کالج تھا ، لیکن واقعات اس نظریے کی تائید نہیں کرتے ۔ حقیقت یہ ہے کہ کالج کے دیسی اساتذہ پرانی ادبی اقدار کے گرویدہ تھے ، جیسا کہ ان کی اپنی تصانیف سے ظاہر ہے ۔ طلبا کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سپرنگر نے لکھا ہے :

''۔ ۔ ۔ فارسی جماعتوں کی تعلیم ناقص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب (مدرسین فارسی) 'پر تکلف یعنی مسجع مقفیٰ طرز تحریر کے دل دادہ ہیں اور متأخرین کے کلام کو پسند کرتے ہیں ۔''

اور :

''مولویوں اور ان کے شاگردوں کا طرز تحریر بھدا اور زبان بے مزہ اور غلط ہوتی ہے ۔ ان کے خیالات ملّایانہ طرز تعلیم کی وجہ سے نہایت محدود ہوتے ہیں ۔ میری رائے میں مشرقی شعبے کے تمام نقائص میں سے سب سے پہلے اس کی اصلاح ہونی چاہیے[1] ۔''

اردو اخبار کے اس شمارے کے مطالعے سے ، جس میں ذوق کا مشہور قصیدہ :

---

۱ ۔ عبدالحق : مرحوم دہلی کالج ۔

شب کہ میں اپنے سربستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

چھپا تھا ، اس امر کی تائید ہوتی ہے ۔ اس قصیدے کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے :

''روز عید سعید جو قصیدہ دربارِ عام حضور اقدس اعلیٰ والا مقام میں جناب کلیم زماں ، سحبان دوراں ، سلطان الشعرا ، خاقانیِ ہند ، شیخ محمد ابراہیم خاں ذوق ، استاد خاص حضور والا دام برکاتہم نے پیش کیا اور پڑھا ، جس کا وعدہ لکھنے کا سابق میں راقم اخبار نے کیا تھا ، سو اس ہفتہ میں پایا ۔ واسطے حظِ ماہرین و سرور شائقین قدردان و جوہر شناس کے لکھا جاتا ہے ۔ از آنجا کہ بفحوائے مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید ، اور بتقاضائے مصداقِ مصرع : حاجتِ مشاطہ نیست روے دل آرام را ، وصف و ثنائے تصنیف و مصنف مستغنی عن المدح و الثناء و البیان و التبیان بعندیۂ راقم ہیچمداں ہے ۔ اس لیے اس طرف سے طے کشح مناسب بلکہ انسب معلوم ہوئی ۔ سنا گیا کہ بعد پیشی و سماعت قصیدہ مرقومہ کے ایک گاؤں جاگیر میں استاد ممدوح کو عطا ہوا ، اور حضور اقدس نے بہت عذر فرمایا کہ صلہ شایاں اس کا میں نہیں جو کہ میرا جی چاہتا تھا ۔ ۔ ۔''

اس کے برعکس خبروں کی زبان میں رنگ آمیزی کا عنصر بہت دب جاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

''اخبار انگلش میں سے واضح ہوتا ہے کہ واسطے کرنے بعض انتظامات جدید کے دفاتر ٹیلیگراف بنگالہ میں

ڈاکٹر اوشانسی صاحب موسم سرما میں کلکتہ کو
تشریف لے جاویں گے - جناب لفٹنٹ گورنر بنگالہ
۱۴ تاریخ اگست کو مقام میمن سنگھ میں پہنچے اور ۱۷
تاریخ وہاں سے طرف ڈھاکہ کے روانہ ہوئے- چٹھیات
ملک برما سے ، جو کہ اخبارات کلکتہ میں چھپی ہیں ،
واضح ہے کہ عنقریب سفیران والی برما صاحب کمشنر
رینگون کے پاس تو ضرور ہی آویں گے، گو جناب گورنر
جنرل بہادر کے پاس کلکتہ میں نہ آویں - اور صاحب
اخبار ہرکارہ کو تو یہ خبر پہنچی ہے کہ سفیران
مذکورین واسطے گفتگوے بالمشافہ کے کلکتہ میں
جناب نواب ممدوح کے پاس آویں گے - اور یہ بھی
مشہور ہے کہ بھائی شاہ ممدوح کا بھی بافسری سفیران
مذکورین بہت توزک و تجمل سے کلکتہ میں آوے
گا...''

اپنی علم دوستی کے ساتھ ساتھ مولوی محمد باقر ایک
کاروباری شخص بھی تھے - چنانچہ انھوں نے اپنے دوست
مسٹر ٹیلر کے مشورے سے ایرانی سوداگروں کی رہائش کے
لیے دہلی میں ایک سرائے تعمیر کرائی - اس سے بیرونی
تجارت کو بہت فروغ ہوا اور مولوی محمد باقر کا شمار شہر
کے متمول لوگوں میں ہونے لگا - کہا جاتا ہے کہ انھوں
نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی - یہ ان کے رہائشی مکان
کے قریب تھی اور چونکہ اس میں کھجور کا درخت تھا ،
اس لیے وہ ''کھجور والی'' مسجد کے نام سے مشہور ہوگئی -

مولوی محمد باقر کی زندگی کا اہم ترین واقعہ وہ مذہبی
مناقشہ ہے جس کا آغاز ۱۸۳۹ع کے لگ بھگ ہوا اور

جب تک وہ زندہ رہے جاری رہا۔ اس مناقشے میں ان کے مد مقابل مولوی جعفر علی تھے۔ آپ مولوی محمد باقر کے ہم مدرسہ[1] رہ چکے تھے اور دہلی کالج میں شیعہ قانون کے لکچرار تھے ۔

اس مناقشے کی بابت آغا محمد طاہر ، نبیرۂ آزاد ، ''فلسفۂ الٰہیات'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

''حضرت آزاد مرحوم کے والد ماجد ، علامہ محمد باقر شہید، شیعوں کے مجتہد تھے . . . دہلی میں نواب سید حامد علی خاں صاحب مرحوم بڑی چلتی رقم تھے کہ اپنی عقل و تدبیر کے زور سے ابو ظفر بہادر شاہ کے وزیر اعظم اور مختار کل بنے ہوئے تھے ۔ ان کی رئیسانہ طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ کوئی دوسرا شخص بادشاہ کے مزاج میں دخیل ہو ۔ ادھر یہ حال تھا کہ شہر میں مولانا محمد باقر علیہ‌الرحمہ اور قلعۂ معلٰی میں ان کے دلی دوست ، حضرت‌ذوق، کا طوطی‌بول رہا تھا۔ نواب صاحب موصوف کو اس کی تاب کہاں تھی ۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ذوق کے توڑ پر تو حضرت غالب کو پہنچایا اور مولانا کے مقابلے میں علامہ قاری جعفرعلی صاحب کو لا کھڑا کیا ۔ قلعے میں تو کچھ بس نہ چلا ، لیکن شہر میں دھڑا بندی شروع ہو گئی . . . یہاں مذہب کا معاملہ تھا . . . مباحثے سے مناظرہ اور مناظرے سے مجادلہ تک نوبت پہنچی . . . ''

اور آغا محمد باقر لکھتے ہیں :

'' . . . لیکن مولانا محمد اکبر کے انتقال کے بعد دہلی میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں ؛ ایک جماعت قاری جعفر

---

۱ ۔ بعض کی رائے میں مولوی باقر کے شاگرد تھے ۔

علی کی معتقد تھی۔۔۔دوسری جماعت مولانا محمد باقر سے عقیدت رکھتی تھی ۔ اس سے پہلے اجتہاد کا درجہ محض مولانا محمد باقر کے خاندان سے مختص تھا ۔ لیکن قاری جعفر علی صاحب کے دہلی میں قیام کرنے سے یہ قدیمی اعزاز منقسم ہو گیا ۔ اس افتراق کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نواب حامد علی خاں مرحوم نے تقریباً ۲۰ ہزار روپیہ نذرانہ دے کر سلطنت مغلیہ کی مختاری کا عہد حاصل کیا ۔ اب انھیں اپنی پارٹی کو تقویت دینے کے لیے ایک عالم دین کی ضرورت لاحق ہوئی ۔۔۔ نواب صاحب نے ۔۔۔ ان جعفر علی صاحب کو مولانا محمد باقر کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ، اور اس طرز عمل اور در اندازی سے دہلی کی شیعہ جماعت میں نفاق پیدا ہوگیا ، اور وہی گروہ جو مدتوں ایک ہی خاندان کے ساتھ عقیدت رکھتا چلا آتا تھا ، دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا۔۔۔مولانا محمد باقر اور مولانا جعفرعلی کے درمیان چند فقہی مسائل پر اختلاف بھی تھا ۔ اس کے متعلق بعض اوقات مناظرے اور مکالمے بھی ہوتے تھے اور اکثر مجادلوں تک نوبت پہنچتی[1] ۔۔۔"

مجھے مدت سے خواہش تھی کہ ان معاملات کا کھوج نکالا جائے ۔ چنانچہ خوش قسمتی سے ۱۹۴۱ع میں مجھے پروفیسر شیرانی مرحوم کے کتب خانے میں ایک رسالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں مولوی محمد باقر پر کفر کا فتوی لگا کر انھیں شیعہ مذہب سے خارج کیا گیا تھا ۔ اس رسالے سے اس مناقشے پر بہت روشنی پڑتی ہے ۔ رسالے کا پورا

---

۱ ۔ اورینٹل کالج میگزین ، فروری ۱۹۳۹ ، صفحہ ۴۴ ۔

نام یہ ہے :

''رسالہ مسماۃ بارشاد المومنین متضمنہ فتاویٰ حضرت مجتہدین بیچ خارج ہو جانے محمد باقر مالک اردو اخبار کے دائرۂ ایمان سے بیچ پانچویں ماہ رجب ۱۲۷۰ھ کے'' مطبع نور مغربی۔

اس رسالے کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مذہبی خیالات میں مولوی محمد باقر اعتدال پسند واقع ہوئے تھے اور اپنے بعض انتہا پسند رفقا سے انھیں چند اہم امور میں اتفاق نہ تھا۔ چنانچہ ان کے مخالف لکھتے ہیں :

''کبھی نزاع شیعہ سنی کو نزاع نفسانی اور شیطانی قرار دے ، اور گاہے رنگ اپنا یہ بیان کرے کہ میں شیطان کو بھی اپنی زبان سے برا نہیں کہتا ، اور کبھی تبرے کو حرکت بازاریوں کی لکھے . . . اور کبھی سادات فاطمہ کی خدمت میں وہ بہتان اور بے ادبیاں طبع کیں کہ روح مظلومہ فاطمہ کو نہایت غضبناک کیا . . .''

مولوی محمد باقر کو ایک فقیر مسملی بصری سے بہت عقیدت تھی اور چوں کہ ان کے مخالفین تصوف کے خلاف تھے اس لیے انھیں مولوی محمد باقر کا یہ فعل نہایت نازیبا معلوم ہوتا تھا۔ نیز انھیں یہ بھی شکایت تھی کہ دیگر مذہبی معاملات میں بھی مولوی محمد باقر نہایت آزادی سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ فتوے میں لکھا ہے ''اور کہیں دست بستہ بے خوف نماز جنازہ سنی مذہب کی پڑھتا ہے اور کہیں ہاتھ کھول کر شیعہ کے جنازے کی نماز پڑھا دیتا ہے۔''

اس رسالے سے ضمنی طور پر ہمیں مولوی محمد باقر کی

نسبت اور اطلاعات بھی ملتی ہیں ، اگرچہ انھیں قبول کرنے میں ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے ۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں ، خاندانی روایت کے مطابق مولوی محمد باقر نے چھاپہ خانے کا کام ملازمت سے مستعفی ہو کر شروع کیا تھا ۔ اس رسالے میں نہایت وضاحت سے درج ہے کہ انھیں بوجہ رشوت ستانی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا ۔ رسالے کے الفاظ ہیں :

''رشوت ستانی کہ جس علت سے آپ تو موقوف ہوا ، لیکن اکثر عملہ کچہری کو بھی موقوف کرایا اور عمر بھر جھوٹی نالش کروانے میں کٹ گئی ۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک پتھر چھاپے خانے کا مسمی ریاض کے گھر رکھوا کر بعلت دزدی اس پتھر کے سات برس قید کروائی . . . اور نو چھریاں اپنے بدن پر کھا کر واسطے دفع بدنامی ایک طالب علم کو پھنسوا دیا تاکہ لوگ جانیں طالب علموں کے جھگڑے میں چھریاں کھائیں ۔ اور اس طالب علم نے طامسن صاحب کے محکمے میں جا کر نجات پائی ۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے مولوی محمد باقر کی زندگی کے ایک نازک ترین واقعے کی عقدہ کشائی بھی ہوتی ہے ۔ خاندانی روایت کے مطابق جب یہ مذہبی جھگڑا خوب زوروں پر تھا کہ ایک رات مولوی محمد باقر کو اطلاع ملی کہ کوئی ملاقاتی ان کا انتظار کر رہا ہے ۔ مولوی محمد باقر کو سان گمان بھی نہ تھا ان کی جان خطرے میں ہے ۔ چنانچہ وہ اندھیرے میں نیچے چلے گئے ۔ نیچے پہنچے ہی تھے کہ اس شخص نے چھری سے ان پر پے در پے نو وار کیے ۔ مولوی

باقر زخمی ہو کر گر پڑے لیکن زخم کاری نہ تھے اور آپ چھ مہینے میں تندرست ہو گئے -

ظاہر ہے کہ اس قاتلانہ حملے کا باعث مذہبی جھگڑا نہ تھا - اور وہ برسوں پہلے ایک انتقامی جذبے کے تحت جس میں غالباً ریاض کے رفقا اور لواحقین کا ہاتھ تھا ، عمل میں آیا تھا -

خوش قسمتی سے مجھے ایک فتویٰ بھی ملا ہے جسے دہلی کے کسی مستند شیعہ عالم نے صادر کیا ہے - اس سے اس مناقشے پر مزید روشنی پڑتی ہے - افسوس ہے کہ اس فتوے کی نقل پر کوئی دستخط درج نہیں ، اس لیے یہ معلوم کرنا نہایت دشوار ہے کہ اسے کس عالم نے صادر کیا تھا - البتہ اس میں مفاہمت کی کوشش کی گئی ہے - فتوے کی عبارت یہ ہے :

" بسم اللہ الرحمان الرحیم

چوں از چند سال درمیان حافظ جعفر علی و مولوی محمد باقر مخالفت و منابزت باقصلی الغایت رسیدہ و از آں جا کہ ایں ہر دو شخص در شاہجہاں آباد بعلم منسوب اند ، لاجرم جماعتے با ایں و گروہے با آں یار و مددگار گشت تا آں کہ ایں جماعت جعفری وآں فرقہ باقری مشتہر شد - و این تخاصم و تعاند چناں در مومنین اثر کرد کہ از حد مخالفت شیعہ و سنی در گذشتہ نوبت ترک سلام علیک بل جمیع حقوق ایمانی کہ رعایت آں بہ حسب اخبار و آثار متواترہ لازم و واجب است ، مانند حضوری جنازۂ موتلی و عیادت مرضلی و تعزیت و تہنیت ہم دیگر کہ شعار مسلمانان و سنت اسلام است بالمرہ برخاست - و رئیس ہر دو گروہ استفتا ہائے فرضیہ موافق

آرائے خود بانواع بہ تلبیس و تدلیس تاویل ازیں جامے کنند و چون[1] ہر سوالے را موافق آں مضمون ... جواب می رود ہر یک بہ اتباع خود تاوباش خاطر خواہ خود بہمراہیان خویش خاطر نشیں می کند گو در واقع چناں نباشد۔ و از بسکہ ایں ہمراہیان جانبین نیز دو طبقہ اند ؛ یکے صاحبان فہم و دیگران جاہل و محض گوش بر آواز۔ و ہر یکے ازیں دو طبقہ نیز بر دو صنف اند ؛ یکے آں کہ بوجہ من الوجوہ و سبب من الاسباب با رئیس فرقہ ثانیہ یا بعضے مردم آنجا کینہ در سینہ و ضغینہ دیرینہ دارند۔ و ایں مخالفت را درباب تشنیع آناں و سرور دل خود غنیمت شمردہ اند۔ و صنف دوم کسانے اند کہ محض تبعیت را کاربند شدہ اند۔ یا خویشی یا تمتع دنیاوی یا امور دیگر ازیں قبیل باعث اطاعت یکے و مخالفت دیگرے شدہ است۔ الغرض ہر دو فرقہ اسباب اجازت تشنیع و تنابز دیگرے بایں خاندان نمودہ نوائر فساد و عداوت را بلند ساختہ بحد قطع رحم و لعنت بتسمیہ و اطلاق رسانیدہ اند و نمے دانند (و) غشائے تعصب و غطائے تعنت ایناں (را) (قول) خدائے تعالیٰ فراموش ساختہ اند کہ مے فرماید الفتنۃ اشد من القتل و جناب نبوت ارشاد فرمودہ است کہ لعن المومن کقتلہ و حق سبحانہ و تعالیٰ شانہ می فرماید من قتل مومناً متعمداً فجزاءہ جہنم خالداً فیہا و غضب اللہ علیہ و لعنہ۔۔ الخ و افسوس است کہ بہوائے نفس و کینۂ دیرینہ خود مومنین را بہ تہمتہائے چند ہدف سہام لعن و ملام سازند و نامہائے بد بر او گزارند و ایں فعل نیز مخالف امر الٰہی است کہ مے فرماید ولا تنابزوا بالالقاب۔۔۔(الآیہ) و

---

۱ - و بمنزلہ قطع رحم ایمائے بآں منجر شد۔

نمی دانند کہ اگر کسے بر غیر مستحق لعن کند بر خودش باز مے گردد و حیرانی است کہ باوجود ادعاے علمیت چرا عمل بکریمہ الصلح خیر و بہ مضمون کرامت مشحون آیہ و انی ہدایہ انما المومنون اخوۃ ... نمے کنند ہرگاہ چناں فرمودہ باشند پس چگونہ پسندیدہ اند در حق برادران ایمانی اقوالے را کہ براے خود نمے پسندند۔

الحاصل باستماع ایں حکایت و ادراک وفور چنیں شکایات آنفاً نظر بہ اصلاح ذات البین و رفع النزاع من المتخاصمین تحریرے ازیں جا رفتہ بود و دو شخص معتمد را ناظر حالات گردانیدہ شدہ بود۔ آں زماں آگہی رسید کہ صورت اصلاح در آئینہ ظہور مشہود شد مگر بعد اندک زمانے متواتر معلوم شد کہ باز نائرۂ فتنہ برخاست و ہماں معرکہ برخاست۔ و اساس استیناس منہدم و اسطوانۂ مخالفت برپا است۔ ظاہر شد کہ بعضے مومنین سیما معارف آنجا کہ علماً و وقاراً مشارالیہ جمیع مومنین اند از صمیم القلب متوجہ اصلاح ہم دیگر نیستند بل یحتمل کہ بعضے اصلاً و بالذات و برخے تبعاً و بالعرض گویا علت مادی مواد خصومت و نفاق شدہ اند اعاذنا اللہ... الخ و جمیع المومنین فی وساوس الشیطانیہ و ھواجس النفسانیہ ازاں جا کہ بر مومن صالح لازم است کہ در اصلاح و ایلاف جماعت بہ قلیلہ خود کوشد و در باب دین جامۂ کہنہ و غرض نفسانی نپوشد۔

خصوصاً بر ہمہ خاندان مالزوم ایں امر اہم و اتم است۔ لاجرم بفحواے آخر الدواء الکی بار دیگر تحریر مفصل و موکد نوشتن بر خود ضرور دانستہ بجمیع مومنین علی الاطلاق اطلاع دادہ مے شود کہ ازیں مخالفت و قطع رحم و لعن مومنین گو بہ کنایہ یا بتصریح تواند شد۔ ایں دو مخالف را بہ ہم دیگر

موالف سازند و غمازان و مفتریان خود غرض را که غمازی
و افترا شعار شان باشد از مجلس خود بدر کنند و بفحوائے
اذا جاء کم فاسق بقول ہر ناکس از جا نروند ۔ و اگر بعد
جہد و کوشش بلیغ پندارند که ایں دو متخاصم ہرگز
الفت نخواہند گرفت که باوجود علم کاربند استبداد و
جہالت اند چوں ہیچ کس از ایشاں مقتداء و مفترض الطاعت
نیست ایں ہر دو متخاصم را بحال شاں وا گزارند و بمضمون
'لنا اعمالنا و لکم اعمالکم' عامل بوده بصلح و آشتی از ہر دو کس
کناره جویند و بر گفتار کسے عمل نکنند و در ضروریات
دین ہرچه پرسیدن باشد چه در عبادت و چه در معاملات
ازیں جا تحقیق مے کرده باشد. . . و اگر باوجود ایں اطلاع
باز برسر نفاق باشند حجت ما پیش خدا بر سر سرکش
تمام شده است ۔ و ما علینا الاّ الاصلاح ۔ و روز جزا قریب
است اندیشه جواب ہر کس خودش را باید و از بسکه مفسده
عظیم و تفرقۂ بزرگ در دہلی اندر مومنین واقع شده و موجب
قول لن یصلح العطار ما افسد الدہر به ظاہر رجائے واثق صلح
نیست مگر چنیں تکلف دریں صورت برائے (اسلام ؟) حزب
شیعیان آل یسین اتم تکلیف خود را بعمل آورده ایم دریں
تحریر مدح یکے و اہانت و ذم دیگرے منظور نیست ۔ اگر
کسے ازاں دو فرقه مضمونے از مضامین ایں کتاب را ممد خود
و موہن دیگرے قرار [ساخته] بے جا ست ۔ و نیز جمله
مومنین بگوش ہوش شنوند که از جانبین استفتاہا در ایں
جا میرسد و ازیں جا مضمون استفتا بالضرورت فتویٰ نبرده ؟
و آں را اصحاب غرض مفید خود و مضر دیگرے
می سازد ۔ لہذا نوشته می شود که ثانی العمل ؟ تا فتویٰ

مفصلے در حق کسے بنام او ازیں جا نرود و مالش۱ ۔ ۔ ۔''

یہاں ایک بات قابل غور ہے ؛ مذکورہ بالا فتوے سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ مولوی محمد باقر کو کسی وقت بھی تمام شیعیان دہلی کی قیادت حاصل تھی ۔ بے شک اس مجادلے کی وجہ سے بعض شیعہ ان کے ہم خیال ہو گئے تھے اور اس وجہ سے مولوی باقر کو ان کا لیڈر کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن وہ نہ ہی دہلی کی تمام شیعہ جماعت کے لیڈر تھے اور نہ انہیں اجتہاد کا درجہ حاصل تھا ۔

اس مناقشے کا ایک مزاحیہ پہلو بھی ہے جو مولانا محمد حسین آزاد کی زندگی کے مبصر کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے ؛ کہا جاتا ہے کہ جب مناقشے کا آغاز ہوا ، مولانا آزاد دہلی کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ انھوں نے یا تو اپنے طور پر یا مولوی محمد باقر کے کہنے پر مولوی جعفر علی سے متنازعہ فیہ مسائل پر اپنی جماعت میں بحث شروع کر دی ۔ کچھ دن تو استاد نے صبر سے کام لیا ، آخر کار انھوں نے آزاد کی شکایت پرنسپل صاحب کے پاس جڑ دی اور کہا : ''یہ لڑکا پڑھنے نہیں بلکہ مجھے پڑھانے آتا ہے''۔ اور کہا اس کو سرزنش کی جائے ، لیکن پرنسپل نے ہنس کر بات ٹال دی اور آزاد کو شیعہ جماعت سے اٹھا کر اہل سنت کی جماعت میں بھیج دیا ۔ اس طرح آزاد کو اہل اسلام کے ان دونوں گروہوں کے خیالات سے واقفیت حاصل ہو گئی ۔ علاوہ ازیں اپنے والد کی مذہبی رواداری کا ان کی طبیعت پراثر ہوا اور وہ ہمیشہ اس کے حامی رہے ، جیسا کہ ان کی آخری تصنیف ''دربار اکبری'' کے مطالعے سے ثابت

---

۱ ۔ نقل نا مکمل ہے ۔

ہوتا ہے۔

مولوی محمد باقر کی وفات کی بابت بہت سی روایات ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب اپنی تصنیف ''مرحوم دہلی کالج'' میں لکھتے ہیں:

''.....مسٹر ٹیلر اور مسٹر اسٹیز جان بچا کر بھاگے اور میگزین سے صحیح سلامت باہر نکل آئے، لیکن ہوش حواس باختہ، حیران تھے کہ کہاں جائیں۔ ہر سمت موت کھڑی نظر آتی تھی... بہ ہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آئے اور اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں گھس گئے۔ اس نے انھیں محمد باقر صاحب، مولوی محمد حسین آزاد کے والد ماجد کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر سے ان کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ انھوں نے ایک رات تو ٹیلر صاحب کو اپنے امام باڑے کے تہ خانے میں رکھا لیکن دوسرے دن جب ان کے امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں عام ہو گئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ مگر ان کا بڑا افسوس ناک حشر ہوا۔ غریب بیرام خاں کی کھڑکی کے پاس جب اس سج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اور اتنے لٹھ برسائے کہ بے چارے نے وہیں دم دے دیا۔ بعد میں مولوی محمد باقر صاحب اس جرم کی پاداش میں سولی چڑھائے گئے اور ان کا کوئی عذر نہ چلا[1]''

غدر کے بعد یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ مسٹر ٹیلر وقت رخصت مولوی محمد باقر کو کچھ سرکاری کاغذات دے

---

۱ - عبدالحق : مرحوم دہلی کالج -

گئے تھے اور ہدایت کی تھی کہ غدر کے بعد انہیں حکام اعلیٰ تک پہنچا دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کاغذوں کی پشت پر مسٹر ٹیلر نے انگریزی میں لکھا تھا کہ اس شخص نے میری مدد نہیں کی۔ چنانچہ جب حسب وعدہ مولوی محمد باقر کاغذات لے کر افسر اعلیٰ کے پاس گئے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا اور باقی قیدیوں کی طرح انہیں بھی سولی پر چڑھا دیا گیا۔

یہ روایت قابل اعتنا نہیں معلوم ہوتی۔ اگر اس کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کیا جائے تو یہ بالکل بے معنی ثابت ہوتی ہے۔ مسٹر ٹیلر کا کردار نہایت بلند تھا اور یہ نہایت بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اپنی موت سے چند لمحے پہلے وہ ایسی غداری کے مرتکب ہوتے۔

بہرحال مسٹر ٹیلر کے قتل کا مولوی محمد باقر کی گرفتاری اور سزائے موت سے گہرا تعلق ہے۔ غدر کے بعد مخبری کا بازار گرم تھا اور ادنیٰ قسم کے لوگ حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ذلیل ترین افترا پردازیوں سے بھی نہیں چوکتے تھے، لیکن یہ صرف قیاس آرائی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا مجھے ایک ایسی اطلاع دستیاب ہوئی جس سے یہ پیچیدہ معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے؛ میری رائے میں مولوی محمد باقر کے قتل کے معاملے میں انگریز اپنی طرف سے حق بجانب تھے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مولوی محمد باقر نے دوران غدر میں باغیوں کا ساتھ دیا لیکن دیدہ دانستہ یا بحالت مجبوری ان سے ایک ایسے فعل کا ارتکاب ہوا جس سے ان کی انگریز دشمنی ثابت کرنے کے لیے اچھا خاصا مواد مل جاتا ہے۔ یہ معاملہ ذرا تشریح طلب ہے۔

۱۸۵۷ع کے اوائل میں جب انگریزوں کا پلہ بھاری ہو رہا تھا اور وہ دہلی کا محاصرہ کرنے والے تھے، انھوں نے ایک اشتہار جاری کیا تھا ۔ اس کا روے سخن دہلی اور اس کے نواح کے مسلمانوں سے تھا ۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ انگریز مسلمانوں کو غدر کے معاملے میں بری الذمہ سمجھتے ہیں اور یہ کہ غدر کا فتنہ ہندوؤں کی سازش کا نتیجہ ہے ۔ اس 'اشتہار' میں اس امر کی بھی وضاحت کی گئی تھی کہ کارتوسوں میں ، جن کا استعمال غدر کا باعث ہوا ، سؤر کی چربی نہیں بلکہ گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے ۔ لیکن انگریزوں کی یہ حکمت عملی کام نہ آئی اور اسے نفرت سے دھتکار دیا گیا ۔ علماے شہر کی طرف سے اس 'اشتہار' کا ایک جواب شائع کیا گیا جس کے الفاظ یہ ہیں :

''رسالہ ہادی العباد فی جواز الجہاد اللی یوم التناد متضمن جواب باصواب در رد اشتہار مکاران جعل ساز عدو مبین دین خاتم النبیین ، نوک زدۂ خامہ جناب استادی محمد ابن محمد در ۱۲۷۲ھ ۔ مطبع دہلی اردو اخبار ، ملقب بہ خطاب اخبار ظفر من اہتمام سید عبد اللہ ۔

استفتا : کیا فرماتے ہیں علماے دین اس امر میں کہ انگریز دہلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کے جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں ؟ اور جو لوگ اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد فرض ہے یا نہیں ؟ بیان کرو ۔

جواب : در صورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر اس شہر کے تمام لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی

فرضیت کے واسطے - چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت
مقابلے اور لڑائی کی ہے - اور یہ بہ سبب کثرت اجماع افواج
کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین
ہونے میں کیا شک رہا ؟ اور اطراف و حوال کے لوگوں
پر جو دور ہیں ، باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے -
ہاں اگر اس شہر کے لوگ عاجز ہو جائیں مقابلہ سے یا
سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان
پر بھی فرض عین ہو جائے گا -''

یہ جوابی اشتہار مولوی محمد باقر کے چھاپہ خانہ مطبع
دہلی اردو اخبار سے شائع ہوا تھا اور ان کی گرفتاری اور
سزائے موت کے لیے کافی تھا - غدر سے کچھ سال قبل ''دہلی
اردو اخبار'' کی ادارت مولانا آزاد سے متعلق تھی - چنانچہ ان
کا بھی پرچہ کٹ گیا تھا مگر یہ بچ کر نکل گئے اور لکھنؤ
پہنچے - جب معافی ہوئی تو پنجاب کا رخ کیا - اس پر بھی وہ
بہت عرصہ زیر عتاب رہے اور آخر کار ڈاکٹر لائٹنر کی مدد
سے معاملہ رفع دفع ہو گیا -

ایک اور غور طلب امر یہ ہے کہ مدتوں ''دہلی اردو
اخبار'' کا نام ''دہلی اردو اخبار'' رہا - اس کا واحد پرچہ جو
میرے پاس ہے اس پر بھی صرف ''دہلی اردو اخبار'' مرقوم
ہے - لیکن معلوم ہوتا ہے غدر کے دوران میں اس کے پرانے
نام پر بادشاہ ظفر کے نام کی رعایت سے ''اخبار ظفر'' کا اضافہ
کر دیا گیا تھا جس سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے
کہ باغیوں کو ''دہلی اردو اخبار'' کی ہمدردی حاصل تھی
اور وہ ان کا طرف دار تھا -

آزاد اور بزمِ مشاعرہ

یوں تو انجمن پنجاب کے پچھلے نو سال میں کئی نہایت اہم اجلاس منعقد ہوئے جن میں ادبی، سماجی اور لسانیاتی مباحث پر عالمانہ اور خیال افروز مضامین پڑھے گئے لیکن وہ جلسہ جو ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ع کو شام کے چھ بجے انجمن کے مکان پر منعقد ہوا، ایک منفرد تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پیش تر بھی دو ایک بار اردو شاعری پر عمدہ مضامین پڑھے گئے، جن میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اسے فرسودہ اور روایتی مضامین سے آزاد کرکے زندگی کے متعدد پہلوؤں سے ہم کنار کیا جائے، لیکن ان سے کوئی عمدہ نتائج مرتب نہیں ہوئے۔ آج اس خیال کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ حاضرین میں سے زیادہ تعداد طلبا کی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے استاد مولانا آزاد شاعری پر ایک معرکہ آرا مضمون پڑھ رہے ہیں جس سے اردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا، اس لیے وہ جلسے کی ابتدا سے بہت پہلے ہی مکان پر آ موجود ہوئے تھے۔

کالج کے اساتذہ اور طلبا کے علاوہ مسٹر تھارنٹن سیکریٹری گورنمنٹ پنجاب، کرنل میکلیگن سیکریٹری سررشتۂ تعمیرات گورنمنٹ پنجاب، مسٹر ینگ کمشنر لاہور، مسٹر ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ اشاعت علوم پنجاب اور مسٹر

نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور رونق افروز جلسہ تھے ۔ صدر چیف جسٹس بولنور تھے ۔ رؤساے شہر میں سے راجا ہربنس سنگھ ، نواب عبدالمجید ، پنڈت جوالا ناتھ ، شیخ منڈے خاں صاحب اور فقیر سید قمرالدین موجود تھے ۔ ٹھیک وقت پر ڈائرکٹر کے ایما پر مولانا آزاد نے اپنا مضمون پڑھا ۔ یہ وہی مضمون ہے جو ''نظم آزاد'' کے شروع میں بطور ''مقدمہ'' شائع ہوا ہے ۔ یہ مضمون اس قدر مشہور ہے کہ اس کا خلاصہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ فقط یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ صاحب مضمون نے پرانی شاعری کے مطالب و مضامین ، طرز تحریر ، تشبیہات و استعارات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ جہاں تک ممکن ہو شاعری کی پرانی طرز کو ، جو سراسر فارسی کی نقل ہے ، ترک کیا جائے اور اسے حقیقی جذبات اور حالاتِ گرد و پیش کا آئینہ دار بنایا جائے ۔ اس کے بعد آزاد نے اپنی مثنوی موسوم بہ ''شب قدر'' پڑھ کر سنائی جس کی تعریف میں بہ الفاظ ''کوہ نور'' ''ہر شخص کی زبان سے کلمات تحسین و احسنت صادر ہوئے ۔''

مضمون کے اختتام پر مسٹر ہالرائڈ نے اردو شاعری کی موجودہ حالت پر مبصرانہ نظر ڈالتے ہوئے ایک تقریر انگریزی زبان میں کی ۔ چوں کہ یہ تقریر تاریخ ادبیات اردو میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے اور عام طور پر لوگوں کو اس کا علم نہیں ، اس لیے ہم ضمیمۂ کوہ نور ، مطبوعہ ۱۶ مئی ۱۸۷۴ع سے اس کے ترجمے کی نقل پیش کرتے ہیں :

''یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ نظم اردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہوئی ہے ، اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں ۔ اسی

واسطے جماعہ رؤسا اور اہل علم اور ان لوگوں سے جو
شعر و سخن اور تصانیف سے لذت اٹھاتے ہیں ، درخواست
کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کی طرف
توجہ کریں ۔

اس وقت مولوی محمد حسین صاحب نے جو مضمون پڑھا
اور رات کی حالت پر شعر سنائے ، وہ بہت تعریف کے
قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی صاحب کا شکر گزار
ہونا چاہیے ۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اس طرز کا ہے
جس کا رواج مطلوب ہے۔۔۔ ۔

نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر کو جو اس امر کی طرف
توجہ خاص ہے ، وہ سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کی تحریر
سے واضح ہے جس کا ترجمہ یہ ہے :

'جناب لفٹیننٹ گورنر بہادر ایک اور امر کی نسبت
ہدایت فرماتے ہیں جس کا کمیٹی نے کچھ ذکر نہیں
کیا اور جو ممدوح کے نزدیک اس ملک کے سر رشتۂ
تعلیم کے افسروں کے لیے قابل غور ہے ؛ وہ یہ ہے کہ
اردو کی درسی کتابیں جو بالفعل رائج ہیں یا جن کے
پڑھانے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے ، ان میں اردو نظم
بالکل نہیں ۔ مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ عمدہ نظم
تعلیم کا وسیلہ ہے اور طرح طرح کے دیسی راگ اور
گیت جو ملک میں رائج ہیں جن میں سے بعض کو مراثی
لوگ دیہاتی جلسوں میں گاتے ہیں ، یا موروثی بھاٹ
کہتے ہیں ۔ اور بعض کو لوگ خود اپنے گھروں میں
شادی و غم کے موقع پر گاتے ہیں ، ان سے ظاہر ہے کہ
اہل ملک شادی و غم اور ہجو کے اظہار کرنے میں

نظم کی کتنی قدر اور اس کا کس قدر استعمال کرتے ہیں ۔ نظر برآں حسب الہدایت آپ سے کہا جاتا ہے، یعنی آپ اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دیہاتی اور ضلع مدارس میں ایک منتخبات اردو نظم ، جس میں اخلاق ، نصیحت اور ہر ایک کیفیت کی تصویر کھینچی گئی ہو، کیا پڑھائی میں داخل نہیں ہو سکتی ؟ کیا اس قسم کا انتخاب سودا ، میر تقی ، ذوق یا غالب کی تصانیف سے مرتب ہو سکے گا ؟ اگر شعرائے مذکورہ بالا کے دیوانوں یا مثنوی ہائے موجودہ سے ایسا انتخاب نہ ہو سکے ، تو حسب الہدایت دریافت کیا جاتا ہے کہ شعرائے زمانۂ حال سے خاص مدارس کے استعمال کے لیے ایک ایسی نظم کی تصنیف کا کام سر انجام ہو سکتا ہے یا نہیں ؟ اگر اس طور پر مدارس سرکاری کے وسیلے سے دیسی نظم غیر مذہبی کی تہذیب ہو جائے اور واہیات نظم ، جو بالفعل بہت جاری ہے، رفتہ رفتہ اس کی جگہ قائم مقام ہو جائے تو بڑی عمدہ بات ہوگی ۔'

نواب ممدوح جو فرماتے ہیں کہ نظم کا پڑھنا ضرور ہے ، اور انھیں امید ہے کہ غالباً مدرسوں سے جو طلبا پڑھ کر نکلیں گے ، یہ ایک پاکیزہ چشمہ ہوں گے جو کہ سارے ملک کو سیراب کریں گے ، بے شک یہ بہت مناسب تدبیر ہے ۔ لیکن میرے نزدیک ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے جو اگر آپ صاحب سر انجام کردیں تو بہت جلد نتیجہ اس کا حاضر ہو جائے ۔

بڑا شاعر وہ ہے کہ مصیبت کا بیان کرے تو رُلا دے ؛ خوشی کے بیان پر ہنسا دینا ، شجاعت کے بیان پر

لڑا دینا ، ظلم کے بیان پر ظالم سے بیزار کر دینا ، اُس کی زبان کے اختیار میں ہو - جس شخص کو یہ قوت حاصل ہو کہ ایک دم میں یہ مختلف اثر پیدا کر دے ، اگر وہ اپنی قابلیت کو ایسے موقع پر خرچ نہ کرے تو مقام افسوس ہے - شاعر کو چاہیے، جو لکھے ایسا لکھے کہ سنتے ہی انسان کا دل راستی کی طرف مائل ہو اور ہمدردی ، پاک دامنی اور خوش اخلاقی کی طرف راغب ہو - باغ کی سبزی اور ہریاول ، غروب آفتاب کے وقت آفق کی خوش نمائی اور اس کا جلوہ طلوع کے وقت ، جو کہ خدا کی صنعت کاملہ کا نمونہ ہے ، اسے شاعر ہی خوب سمجھتا ہے - پس اُسے چاہیے کہ ان کیفیتوں کے بیان سے خاص و عام کے دلوں پر اثر پیدا کرے تاکہ مشکل کے وقت عبرت پکڑیں اور فرحت کے موقع پر اس نعمت غیبی کا شکر بجا لائیں -

اب میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس طرح ہر شہر میں عموماً شاعری ہوا کرتی ہے ، آپ بھی ایک مشاعرہ کیا کریں ، مگر اتنا ہو کہ یہاں بجائے مصرع طرح کے کوئی موضوع خاص ملا کرے جس پر سب لوگ طبع آزمائی کر کے لایا کریں اور جلسۂ عام میں سنایا کریں- میرا جی چاہتا ہے کہ جب یہ سلسلہ جاری ہوجائے تو سال بھر کے بعد جن کے کلام سب سے بہتر ہوں ان کے لیے ایک خاص طور پر انعام و اکرام بھی تجویز کیے جائیں - جو تجویز میں نے آپ کے روبرو پیش کی ہے ، اگر وہ خاطر خواہ عمل میں آئے تو ۱۸۷۴ع ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور لوگ

کہیں گے کہ اردو نظم کی طرز قدیم کن کن اشخاص کی سعی و کوشش سے چاہ تنزل سے نکل کر اوج ترقی پر پہنچی۔ میری یہ رائے ہے کہ مہینہ بھر کے بعد یہ جلسہ ہوا کرے اور اب کی دفعہ جو جلسہ ہو، سب اہل سخن ایک نظم ''برسات کی تعریف'' پر لکھیں۔''

اس کے بعد کچھ تائیدی تقریریں ہوئیں جنھیں صرف خلاصۃً درج کیا جاتا ہے۔ رائے مول سنگھ صاحب آنریری مجسٹریٹ لاہور نے کہا:

''اے صاحبان! جناب ڈائرکٹر بہادر کی عنایت کا ہم تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ اس قدر ہماری اور ہماری زبان کی اصلاح میں سعی فرماتے ہیں۔ جو کچھ انھوں نے فرمایا، نہایت مناسب اور بجا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے، اور جو صاحبان عالی‌شان اس جلسے میں رونق افروز ہیں، ان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔''

پنڈت بسنت رام صاحب نے فرمایا:

''سنسکرت میں شاعری نہایت متنوع ہے اور اس کو کئی رس پر منقسم کیا گیا ہے۔ شاعر وہی ہے جو کہ اقسام نظم پر قادر ہو۔ پس ہم کو بھی چاہیے کہ جب شعر کہیں تو ایک محدود احاطے میں بند نہ ہو جائیں۔''

آخر میں صدر جلسہ نے فرمایا کہ کرنل ہالرائیڈ صاحب نے جو تقریریں اور تجویزیں اس جلسے میں بیان کیں، یہ نہایت درست اور مفید ہیں۔ اگر ان کے بموجب عمل درآمد ہوگا تو بہت اچھا نتیجہ ہوگا۔

غالباً یہاں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان

تقاریر کی حاضرین نے نہایت شد و مد سے تائید کی ۔ یہاں تلک کہ بعض علمی اداروں نے بھی، جنھیں حکومت سے تعلق تھا ، انھیں لبیک کہا ۔ اس کے علاوہ ملک کے بعض آزاد خیال اصحاب نے بھی جن کا ذکر بعد میں آئے گا ، اس تحریک کی تائید کی ۔ لیکن جلد ہی لوگ اس سے بدگمان ہوگئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ادبی قدامت پسندی نے ، خصوصاً چند غیر ادبی اور ذاتی امور کی بنا پر ، شدید مخالفت کی شکل اختیار کی ۔ کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کو اپنی اس ادبی پیش قدمی پر بجا طور پر ناز تھا ۔ انھیں یقین تھا کہ یہ تحریک چل نکلے گی اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جائے گی ۔ بنا بریں انھوں نے آزاد کی مثنوی اور مضمون کی نقلیں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے تعلیمی محکموں میں ارسال کیں اور یہ درخواست کی کہ انھیں چھپوا کر مدارس میں تقسیم کیا جائے ، تاکہ وہاں بھی نئی قسم کی شاعری کی بنیاد ڈالی جا سکے یا کم از کم اساتذہ کو جدید شاعری پر اظہارِ خیالات کا موقع ملے ۔

آج یہ معلوم کرنا تقریباً نا ممکن ہے کہ مختلف صوبوں میں اس تجویز کا کیا رد عمل ہوا ۔ لیکن جہاں تک پرانی تحریرات سے پتا چلتا ہے ، سوائے لکھنؤ کے کسی اور صوبے میں اس پر متانت سے غور نہیں کیا گیا ۔ پرانے اخباروں میں سے صرف ایک اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ ، مورخہ یکم جولائی ۱۸۷۴ع میں منشی گوبند لال ، مدرس نارمل سکول لکھنؤ اور منشی سید غلام حسین کے

مضامین ملتے ہیں ۔ اور چوں کہ گارساں دتاسی بھی اپنے ۱۸۷۴ع کے مقالے میں صرف انھی اصحاب کے مضامین کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے مضامین سے اقتباسات پیش کرتے ہیں ، اس لیے یہ نتیجہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے سوا اور کسی صوبے میں اس تحریک پر مکمل طور پر اظہار خیال نہیں کیا گیا ۔ بہر حال یہ دونوں مضامین ہمارے پاس ہیں اور انھیں آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے ۔ منشی غلام حسین فرماتے ہیں :

''کمیٹی اصلاح نظم اردو کی کارروائی کو بجنسہ نقل کرنا کچھ ضرور نہیں ہے ۔ اس میں فقط مولوی محمد حسین صاحب اسسٹنٹ عربی پروفیسر لاہور کالج کا 'لیکچر' مول چیز ہے ۔ واقع میں بڑے زور شور کا لیکچر دیا ہے اور بڑا زور طبیعت پر ڈالا ہے ۔ مولوی صاحب کی فصاحت و بلاغت اور علم و فضل میں کیا شک ہے ۔ ان کی تقریر سحرآمیز و ولولہ انگیز کی کیفیت تو کوئی لکھنؤ والوں کے دل سے پوچھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب انگریزی میں تقریر کیا چاہتے تھے ، بھولے سے اردو بولنے لگے ۔ جو لوگ انگریزی دان ہیں ان کے نزدیک تو مولوی صاحب کا ؟ فرجام بہت عمدہ او لطیف نمونہ ہے اس اردو کا جو بظاہر ہندوستانی ہے اور بہ باطن انگریزی ، جس کا پیدا کرنا حکام والا مقام کو منظور ہے ، مگر جو بےچارے کم بختی کے مارے انگریزی سے بے بہرہ ہیں ان کی مٹی خراب ہے ۔ وہ جب اس تقریر کو دیکھیں گے ، منہ دیکھ کر رہ جائیں گے کہ یہ لفاظی اور یہ ترکیب اور یہ بندش اور یہ

چستی اور یہ تسلسل اضافات اور حسن بیان اور طلاقت لسان کسی عالم ، شاعر ، نثار ، داستان گو کی تحریر میں نہیں دیکھی ۔ یہ رنگ ہی نرالا ہے ۔ مگر ہم اپنی کم فہمی اور کند ذہنی کو روتے ہیں کہ سارا لیکچر مکرر پڑھا مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کو کس امر کی شکایت ہے اور کس عیب کی اصلاح میں دریا بہائے ہیں ۔ غرض بعد فکر بسیار دو باتیں ذہن میں آئیں : ایک یہ کہ مولوی صاحب چاہتے ہیں کہ اردو نظم صنائع و بدائع ، استعارات و تشبیہات سے معرا ہو کر انگریزی کے ڈھنگ پر آجائے ۔ دوسرے یہ کہ عاشقانہ مضامین سے پرہیز کیا جائے ۔ خداوند عالم کی تعریف و توصیف یا اخلاق مضامین نظم کیے جائیں ۔ پہلے امر کی نسبت ہماری یہ گزارش ہے کہ جب تک ہندوستانیوں پر علی‌العموم انگریزی تعلیم اور یورپ کی شائستگی کا اثر اس قدر نہ ہوگا کہ ان کے خیالات اور اخلاق و اطوار جو ہزار برس سے ایک طرز خاص پر چلے آتے ہیں ، بالکل متغیر اور منقلب نہ ہو جائیں ، تب تک ان کے کلام مین انگریزی کا رنگ ہرگز نہ آئے گا ، اور اگر کوئی صاحب ایسا قصد کریں گے جیسے مولوی صاحب نے ایک شمہ اس نظم جدید کا لکھا ہے جس کے اختراع کے وہ درپے ہیں ، تو ناحق ہنسے جائیں گے ۔ کوئی پوچھے گا بھی نہیں کہ یہ ہے کیا بلا ۔ رہا سرکاری مدرسوں میں جاری کرنا تو وہ نظم جدید جس کے موجد مولوی صاحب ہوئے ہیں ، اس قدر رائج نہیں ہوسکتی کہ ہندوستان کی قومی نظم ہو

جائے - رہے استعارات و تشبیہات ، بغیر ان کے تو شعر کا لطف نہیں - کیا انگریزی میں استعارات نہیں ہوتے ؟ اپنا اپنا رنگ ہے - یہ کیا ضرور ہے کہ اسی قسم کے استعارات اردو میں بھی لائے جائیں جیسے انگریزی میں ہیں - اور شعر کو استعارات سے معرا کرنا تو ہماری دانست میں ایسا ہے جیسے کسی نازنین عورت کو زیور لباس چھین کر بالکل برہنہ کر کے سامنے کھڑا کر دیا - اس وقت سوائے آنکھ نیچی کر لینے کے اور لاحول پڑھنے کے ہم سے تو اور کچھ نہ ہو سکے گا -

دوسرے امر میں ہمارا سوال یہ ہے کہ آیا مولوی صاحب کی یہ مراد ہے کہ اردو نظم کا دار و مدار مضامین عاشقانہ پر ہے اور سوائے ایسے مضامین کے اور کسی قسم کے مضامین ہوتے ہی نہیں؟ یا یہ غرض ہے کہ متقدمین اور متاخرین نے عشق کو شعر کا ایک جزو اعظم قرار دیا ہے اور ان دونوں میں ایسی نسبت قائم رکھی ہے جیسے طعام اور نمک میں؟ پہلی شق کا جواب یہ ہے کہ اردو نظم کا حصر مضامین عاشقانہ پر ہرگز نہیں ہے ، ہر قسم اور ہر رنگ کے مضامین اس عمدگی اور لطافت کے ساتھ نظم ہو چکے ہیں اور نظم ہوتے جاتے ہیں کہ اگر سو کمیٹیاں ایسی ایسی مقرر ہوں اور سو برس تک ایسی بے سود کوششیں کریں اور لاکھوں روپیہ انعام دیں، تو بھی اس سے بہتر نظم نہ ہو سکے گا - چنانچہ بطور مشتے از خروارے میر انیس صاحب اور میرزا دبیر صاحب کے کلام کو دیکھیے کہ فصاحت و بلاغت ، جوش و خروش ، عالی مضمونی ، ولولہ و طنطنہ ، استعارات و تشبیہات ،

غرض جملۂ محاسن شعر اس میں موجود ہیں یا نہیں ۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ جن مضامین نازیبا کی شکایت مولوی صاحب کو ہے ان کا کہیں نام بھی نہیں ۔ یہ دعویٰ ہمارا ایسا ہے کہ از شرق تا غرب و از جنوب تا شمال کوئی اردو شناس ایسا نہیں جو اس کا انکار کر سکے ۔ ہندوستان کا کیا ذکر ، ان دونوں صاحبوں کا کلام عرب و عجم میں مشاہد مقدسہ میں پڑھا جاتا ہے اور وہاں بھی اپنا رنگ دکھاتا ہے ۔ مولوی صاحب کو لازم ہے کہ ان دونوں صاحبوں کے کلام کو جمع کر کے نظر تفصیلی سے دیکھیں کہ جن عیوب کے وہ شاکی ہیں ان سے ان کا کلام مبرا اور جن محاسن کے وہ خواہاں ہیں ان سے آراستہ ہے یا نہیں ۔ اگر مولوی صاحب کو کچھ بھی مذاق شعر ہوگا تو ان حضرات کے کلام کو مدارس سرکاری میں جاری کرنے کا مشورہ دیں گے ، اور ذوق اور غالب اور سودا وغیرہ کے قصائد کو نظم اردو کا محک قرار دیں گے اور اردو نظم کو انگریزی ڈھنگ پر لا کے بگاڑنے کا قصد نہ کریں گے ۔

''دوسری شق کا جواب سنیے کہ ہمارے نزدیک بے شک عشق شعر کا جزو اعظم ہے، بے اس کے اس کا مزہ نہیں ، اب اور ہم کیا ہیں ۔ سلف سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے ۔ اب اگر یہ کہیے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ جو اگلے زمانے کے لوگوں نے کیا تھا وہی آپ بھی کیجیے اور اسی لکیر کے فقیر ہو جیے، یہ زمانہ تو ترقی اور اصلاح کا ہے ، ہم کہتے ہیں کہ ہاں صاحب یہ سچ ہے کہ یہ زمانہ ترقی اور اصلاح کا ہے ، مگر ترقی اور اصلاح تو اس چیز کی ہوتی ہے

جس میں کوئی نقص یا عیب ہو۔ ہم تو کہتے ہیں عشق شعر کی جان ہے، بے اس کے اس کا لطف نہیں، اور عشق فی نفسہ بلا اضافہ الی الغیر عقلاً امر حسن ہے، قبیح ہرگز نہیں۔ اور جب اس کی نسبت معشوقِ حقیقی کی طرف ہو جیسے خواجہ حافظ اور مولانا روم اور حضرت امیر خسرو اور شمس تبریز وغیرہ کا مذاق ہے، تو یہ باعثِ تزکیۂ نفس اور وسیلۂ نجات ہوتا ہے۔ رہا اس طرف منسوب کرنا نہ کرنا، پڑھنے والے کی سخن فہمی اور نیت پر موقوف ہے۔ اسی طرح سے شعرائے اردو کے کلام میں جو مضامین عاشقانہ ہیں ان کا مرجع و مقصود یا تو وہی معشوق حقیقی ہے یا کوئی شخص موہوم جس کا وجود بجز ذہن شاعر کے اور کسی طرف میں نہیں ہے اور جس کی مدح و تعریف سے شاعر کا مقصود صرف اپنی طبع آزمائی اور اظہار کمال اور سامع کا دل خوش کرنا ہے۔ رہا یہ امر کہ نوجوان لڑکوں کو ایسے مضامین سمجھانا نامناسب ہے، تو کیا ضرور ہے کہ آپ عاشقانہ غزلیں انھیں پڑھائیے، اور قسم کی نظم تعلیم کیجیے۔ غرض ہماری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تو ہمارے نزدیک کسی طرح مناسب نہیں ہے بلکہ محال عقلی ہے کہ نظم اردو کو انگریزی کے رنگ پر لا کر ایک جدید طرز اختراع کی جائے۔ یہ امر اس وقت ہوگا جب انگریزی تعلیم کا اثر اس قدر ہو جائے گا کہ ہم لوگوں کے خیالات اور زبان اور اطوار اور عادات، جو باعثِ حدوثِ خیالات و زبان ہیں، بالکل بدل جائیں۔ ہاں اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ جو طرز سخن ہزارہا برس سے چلا آتا ہے۔ . . اس میں ترقی کی جائے، اس طرح سے کہ جا بجا

مشاعرے اور شعر و سخن کی صحبتیں قرار دی جائیں اور جو لوگ عمدہ اور مفید قصیدے وغیرہ کہیں ، انھیں انعام و اکرام دیا جائے ۔ تو دیکھیے چند ہی روز میں اردو نظم کیا کی کیا ہو جاتی ہے ۔ باقی سب ڈھکوسلا ہے سوائے تضییع اوقات اور مضحکہ کے کچھ حاصل نہ ہوگا ۔

منشی گوبند لال ، نارمل سکول لکھنؤ کا تبصرہ یہ ہے :

''احقر گورنمنٹ عالی‌شان اور عالیانِ فضیلت دست گاہ پنجاب کا نہایت مرتبہ مرہون احسان اور شکرگزار بہ دل و جان ہے کہ اس زمانۂ انحطاط و تنزل میں مرتبہ نظم میں ہمت والا نہمت اس کی ترقی پر مبذول فرماتے ہیں ۔ یقین ہے کہ اس طریقۂ حمیدہ اور ہدایت پسندیدہ سے منشاء جناب لفٹیننٹ گورنر بہادر کا بخوبی تمام و حسن ما لا کلام معرض حصول و موقف ظہور میں جلوہ گر ہوگا ۔ ہر چند شعرائے سلف و ناظمان سابق کے اشعار اردو سوائے طرز عاشقانہ کے ہر طرح کے مضامین میں موجود ہیں ؛ چنانچہ سر رشتۂ تعلیم ناگپور میں کتاب مسمی بہ ''گلزار بے خار'' اور اودھ میں نسخۂ مسمی بہ ''مجموعۂ سخن'' مشتمل دو حصوں پر بحکم مسٹر کالن بروننگ صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ناگپور و اودھ کے مرتب و رائج ہیں ۔ اور بھی مرتب ہو سکتی ہیں جو عمدہ وسیلہ تعلیم کے واسطے ہو سکیں ، لیکن اس میں ایک ہی فائدہ یعنی ترقیِ استعدادِ طلبا . . . متصور ہے ۔ اور دوسرا فائدہ یعنی تکمیل و مشق فن شعر و تہذیب و استعداد شعرا اور رواج شاعری یا تہذیب کا بجائے

شاعریِ رائجہ کے ، جس کے مضمون صرف حسن و عشق ، وصل و ہجر ہی ہوتے ہیں ، ممکن نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے مضامین باعث خرابیِ طبیعت و سبب شوق و رغبت فسق و فجور ہو جاتے ہیں . . . اس شہر لکھنؤ میں باوجود عدم پرسش کے اسیر و میاں بحر صاحب و مرزا دبیر و انیس ، اور سوا ان کے ایسے اور شاعر موجود ہیں جن کے کلام ایسے ہی ہیں جیسا صاحب سیکریٹری بہادر تحریر فرماتے ہیں . . . انگریزی زبان سے کمترین آگاہ نہیں ، لیکن سنا کرتا ہے کہ بیان سادہ اس میں زیادہ رائج و پسندیدہ ہے ۔ شاید پروفیسر صاحب نے اس مقام پر بہ مقتضائے وقت رعایت خاطر حکام پر نظر کی ہوگی ۔ نہیں تو بیان مطالب کے واسطے یہاں ایسے قواعد کلیہ منضبط ہیں جن سے واقعی سرگذشت اور علمی مطالب اور اخلاقی مضامین صاف و سلیس و بامزہ اور رنگین اور دقیق اور متین ، سب طرح کے نظم ہوئے اور ہو سکتے ہیں ۔

”پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ ”میری مثنوی ، جو معمولی بحریں مثنوی کی رائج ہیں ، ان سے قدم بڑھائے ہوئے ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ ان بحروں میں گنجائش کم ہے ۔ ساتھ اس کے یہ کہ جو بحریں مثنوی کی خاص ہیں ، انھیں کسی مذہب نے خاص نہیں کیا ۔ اب کہ ہمیں علی العموم ہر قسم کے مضمون کا نظم کرنا ہے ، پس کچھ گناہ نہ ہوگا اگر ہم قصیدہ یا غزل کی بحر میں مثنوی کہہ دیں۔“ کمترین عرض کرتا ہے کہ مثنوی اور غزل اور قصیدہ اور قطعہ و ترکیب بند و ترجیع بند

و مسمط و مستزاد کے واسطے کوئی بحر یا کوئی وزن خاص مقرر نہیں ۔ صرف رباعی کے واسطے ۲۴ وزن بحر ہزج سے خاص ہیں ۔ بلکہ بعض مثنوی پروفیسر صاحب کی مثنوی سے بھی قدم بڑھائے ہوئے ہیں ؛ مثلاً

''گل کُشتی'' ، میر نجات جس کا مطلع یہ ہے :

در گپ عشق ہر آن نامہ کہ دل خواہ بود
زینتش بنام خوش حضرت اللہ بود

کیوں کہ اس میں ہر ایک مصرع میں ۲۳ یا ۲۴ حرف ہیں اور پروفیسر صاحب کی مثنوی میں ۲۲ یا ۲۳ ۔ اور مثنوی تصنیف مرزا رفیع سودا جس کا مطلع یہ ہے :

یارو خدا ایک ہے ، دوسرے برحق نبی
صورت لوح و قلم جس کے لیے ہے خاق کی

اس میں بھی ہر ایک مصرع ۲۳ یا ۲۴ حروف کا ہے ۔ علی ہذاالقیاس اور بھی مثنویاں ہیں ۔ ہاں اتنا ہے کہ اکثر استادوں نے نظامی کی پانچوں مثنویوں پر مثنویاں کہی ہیں لہذا ان پانچوں وزنوں میں بہت مثنویاں ہیں ۔ اور قادران سخن نے انھیں وزنوں میں سب طرح کے مضمونوں کی گنجائش کی ہے . . . اور وزن کو مذہب سے کچھ سروکار نہیں ۔''

مندرجہ بالا تنقید کے سلجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ آزاد نے از راہ تعلی اپنے مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کیا تھا ''اہل نظر یہ بھی دیکھیں گے کہ آزادگی آزاد نے اس میں کئی قسم کی قیدوں کو توڑا ہے ؛ ایک ان میں سے یہ مثنوی ہے مگر جو معمولی بحریں مثنوی کی رائج ہیں

ان سے قدم بڑھائے ہوئے ہے ، اور سبب اس کا یہ ہے کہ
ان بحروں میں گنجائش کم ہے ۔ ساتھ اس کے یہ کہ جو
بحریں مثنوی کی خاص ہیں انھیں کسی مذہب نے خاص نہیں
کیا ۔ اب کہ ہمیں علی العموم ہر قسم کے مضامین کا نظم کرنا
ہے ، پس کچھ گناہ نہ ہوگا اگر ہم قصیدہ یا غزل کی بحر
میں مثنوی کہہ دیں ۔''

منشی گوبند لال کی تنقید کے پیش نظر آزاد کو اپنے
مضمون سے ان سطور کو حذف کرنا پڑا ۔

اگرچہ عام طور پر مولانا آزاد کے مضمون کی شدت سے
مخالفت ہوئی لیکن کئی اہل الرائے اصحاب کو آزاد سے اتفاق
بھی تھا ۔ مثال کے طور پر امرتسر کے ایک مسلمان نے اس
تحریک کی تائید کرتے ہوئے اپنے خیالات کا ان الفاظ میں
اظہار کیا :

''ہندوستان میں مثل مشہور ہے کہ زوال کے زمانے
میں تعلیم اور شاعری کی ترقی کی کوشش کی جاتی ہے
اور واقعہ بھی یہی ہے ۔ جب تعلیم اور فنون لطیفہ میں
انحطاط ہوتا ہے تو لوگ فطرت کی طرف توجہ کرتے
ہیں . . . آج ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی شاعری سے اپنے
قومی تعصبات اور خیال آرائی کو جو غیر قدرتی محبت
کو فروغ دیتی ہے ، خارج کریں اور اپنی شاعری کا
خاص مقصد یہ قرار دیں کہ وہ ترقی اور عروج کی
صداؤں پر لبیک کہے . . . لیکن افسوس اس بات کا ہے
کہ مشرقیوں نے اپنے آپ کو فطرت سے بہت دور کر
لیا ہے ۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان میں ایسے شاعر
موجود نہیں جنھوں نے مناظرِ قدرت کی نقاشی نہ کی ہو ۔

ان کی تعداد بہت کم ہے ، یہ سچ ہے ، لیکن انھوں
نے ایسے ایسے نقوش کھینچے ہیں جو ان کے مغربی
بھائیوں کے کارناموں سے کم نہیں ... ہمارا فرض ہے
کہ ہم تہذیب کے اعلیٰ مدارج سے فائدہ اٹھائیں اور زمانۂ
جدید جو سہولتیں پہنچا رہا ہے انہیں کام میں لا کر
اس طرح عمل کریں کہ آئندہ نسلیں ہماری س طرح
مشکور ہوں جیسے ہم گزرے ہوئے زمانوں کے مشکور
ہیں ۔ اس لیے ہم مسرت کے ساتھ لاہور کے مشاعرۂ
تہذیب کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ
اسی طرح کے مشاعرے پابندی سے منعقد ہوتے رہیں
گے ۔ (''پنجابی اخبار'' مورخہ ۹ مئی ۱۸۷۴ء)

''پنجابی اخبار'' کے اسی شمارے میں ایک اور تائیدی مضمون
شائع ہوا جس سے ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

''ہر قوم اپنے جذبات و احساسات کا شاعری کے ذریعے
اظہار کرتی ہے ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری
شاذ و نادر ہی عوام الناس کے خیالات کا مظہر ہوتی
ہے ، نہ دیہاتوں کے خیالات کی ، نہ شہریوں کی ، نہ
جاہلوں کی اور نہ عالموں کی ۔ شاعر کے خاص خاص
خیالات کو وہ ادا کرتی ہے لیکن قوم کے خیالات کا
اظہار نہیں کر پاتی ۔ شعرائے اردو ان چیزوں کا بالکل
ذکر نہیں کرتے جس سے یہاں کے باشندوں کو محبت
ہے ۔ وہ ان چیزوں کی تعریف یا مذمت کرتے ہیں
جنھیں ہندوستانی جانتے تک نہیں ۔ اس قسم کی تحریروں
کی اصلاح ضروری ہے ۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے
بحث مباحثے کی ضرورت نہیں ، صرف مولوی محمد حسین

کی تقریر پڑھنا کافی ہے ۔

سب سے پہلے غزل کی اصلاح ضروری ہے جس کا مضمون ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے ، اور یہ خامی صرف اردو میں جاگزیں نہیں بلکہ مشرق کی تمام اسلامی زبانوں میں پائی جاتی ہے ۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ یہ مشاعرہ جس کی ناظم صاحب تعلیمات نے بنیاد ڈالی ہے ، ہماری شاعری کی ترقی کی طرف رہنمائی کرے گا اور اس طرح شاعروں کو سخن وری کا ایک اور بڑا میدان مل جائے گا اور وہ نئی نئی تشبیہات اور استعارات استعمال کر سکیں گے ۔''

اسی اخبار میں ایک مضمون ''انتظام نظم اردو'' کے عنوان سے ۳۰ مئی کو شائع ہوا ۔ مصنف کو آزاد کے نقطۂ نظر سے اتفاق ہے ، لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ ان کا مضمون وحدتِ بیان سے عاری ہے ۔ نیز شاعری کا جو نمونہ انھوں نے پیش کیا ہے اس میں وہی عیوب دکھائی دیتے ہیں جن سے وہ شاعری کو آزاد کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

''تاریخ و قصص کی کتابیں ، نظم و نثر کی تمام تصانیف جو ہمارے نصابوں میں مقرر کی گئی ہیں وہ ہمیشہ عشقیہ مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں ۔ صرف مذہبی کتابیں اس سے مستثنیٰ ہیں ۔ ہم سررشتۂ تعلیم کے مشکور ہیں کہ ان کے ذریعے اب ہمیں بہت سی کتابیں حاصل ہو گئی ہیں جو ہمارے تمدن اور ہمارے حالات حاضرہ کے لیے فائدہ مند ہیں ۔ لیکن افسوس کہ اب تک شاعری کا کوئی مجموعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا جس میں یہ خوبیاں جن کی خواہش ہے ، موجود ہوں ۔ ہمیں توقع ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ایسا کلام بھی حاصل ہو جائے گا

جو ہمارے موجودہ حالات اور اُس ترقی کے موافق ہوگا
جو ہمارے پیش نظر ہے ۔

''اردو شاعری ایک ایسا سامان تجارت ہو کے رہ گئی
ہے جس کا کوئی خریدار نہیں ۔ اس کے باوجود کوئی
خوشی کی تقریب ہو ، یا ماتم کا جلسہ ، مسرت یا غم
کے اظہار کے لیے ہم شاعروں کی طرف رجوع کرتے
ہیں ۔ ہماری امید بھری نظر اُن لوگوں کی طرف ہے
جنھوں نے اردو شاعری کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے ۔
لیکن اب تک اس موضوع پر کسی مجلس یا اخبار میں
باقاعدہ طور پر کچھ نہیں کہا گیا تھا ۔ یہ تو سبھی کہہ
دیتے ہیں کہ اصلاح کی گنجائش ہے ۔ اس طویل اور
پرجوش تقریر میں جو محمد حسین نے انجمن پنجاب کے
ایک جلسے میں کی ، یہی نقص موجود ہے ۔ کبھی تو وہ
اس شاعری کی جو موجود ہے، تعریف کرتے ہیں ، کبھی
یہ کہتے ہیں کہ برج بھاشا کی تشبیہات و استعارات
استعمال کیے جائیں ، اور عربی فارسی کے صنائع ترک
کر دیے جائیں ۔ کبھی وہ انگریزی خیالات کے رواج
پر زور دیتے ہیں ، کیوں کہ اردو عربی و فارسی الفاظ
اور برج بھاشا کے الفاظ کے ملاپ سے بنی ہے اور
ہندو مسلم خیالات کا مجموعہ ہے ، اس لیے ان کی
رائے میں اب یہ ضروری ہے کہ انگریزی خیالات
اور الفاظ بھی استعمال کیے جائیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ
عشقیہ مضامین کو ترک کر دیا جائے اور بہار و خزاں
کا بالکل ذکر نہ کیا جائے ۔ بالآخر وہ شاعری کرنے
کے لیے ایک نمونہ بھی پیش فرماتے ہیں اور آخر میں وہ

خود بہار و خزاں کا ذکر کرتے ہیں ۔ اپنے قلب محزوں کی آہ و بکا کا نقشہ کھینچتے ہیں اور لیلیٰ مجنوں کا قصہ دہراتے ہیں ۔

یہ امر یقینی ہے کہ اگر ہم اپنی شاعری کے موضوعات نہ بدلیں تو ہماری بحث کی سرسبزی باقی نہیں رہ سکتی ۔ ہم فراق اور وصل کے خاص مضامین ادا کرنے کے لیے نئی تشبیہات اور تازہ استعارات کہاں سے تلاش کریں گے ؟ نظم و نثر کے لیے بالکل مختلف قسم اور نوع کے مضامین تلاش کرنے پڑیں گے ۔ ضرورت اس کی ہو گی کہ ہم بالکل جداگانہ زمین میں فصاحت و بلاغت کے بیج بوئیں ۔

''یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم موجودہ طرز تحریر کی خرابی کو کیوں کر رفع کر سکتے ہیں ۔ اس کا ذریعہ وہی ہے جس کا اظہار کیا جاچکا ہے : یعنی انعامات و اعزاز ۔ رہ گئیں ممانعتیں ، وہ اس طرح کی ہونی چاہئیں کہ شعرا بلا تکلف و تامل انھیں قبول کر سکیں ۔ ہماری سرزمین میں شاعری کا راستہ اس وجہ سے بالکل مسدود ہو گیا ہے کہ شاعری میں ہماری رسومات اور مذہبی باتوں کا ذکر نہیں کیا جا سکتا ۔ اس پورے رجحان کا بدلنا آسان نہیں ۔ اگر مخرب اخلاق مضامین ترک کر دیے جائیں تو یہی بہت کافی ہے ۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ اردو شاعری کی تمام خرابیاں رفع ہو جائیں گی اور وہ بہت زیادہ دلکش ہو جائے گی[۱] ۔''

---

۱ ۔ عزیز احمد : مقالات گارساں دتاسی ، بابت ۱۸۷۴ع ، اردو، اپریل ۱۹۴۰ع ، صفحہ ۲۸۰ ، ۲۸۲ (ملخص) ۔

علی گڑھ کے ایک مضمون نگار نے لکھا :

''وہ وقت قریب ہے جب اردو شاعری کی تکلیف دہ یکسانی اس ہمہ گیر طرز تحریر سے بدل جائے گی جس کی خواہش کی جاتی ہے۔ اور جس طرح سنسکرت ، عربی اور سب سے بڑھ کر انگریزی شاعری میں سب مضامین شاعری میں باندھے جاتے ہیں ، اردو میں بھی یہی عمل ہوگا۔ یہ اس طرح ہوگا کہ لوگوں کو اس زبان کی دل کشی کا ثبوت حاصل جائے گا۔ . . اردو شاعری میں نئی زندگی کی تحریک کی روح پھونک دینی چاہیے۔ مولوی محمد حسین کے خیالات ان لوگوں کے دلوں پر بھی اثر کر چکے ہیں جو ان کی تجاویز اصلاح پر ہنستے تھے اور جن کو انھوں نے ایک مثنوی میں عمل کا جامہ پہنایا ہے ۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مولوی صاحب مضامین تخیل کو متروک قرار دینا چاہتے ہیں یا حسن کے متعلق نازک خیالیوں کو پسند نہیں کرتے ، یا اردو شاعری کے استعارات و تشبیہات کو ناقص سمجھتے ہیں ؛ ان کی خواہش صرف یہ ہے کہ قدرتی جذبات اور فطری مناظر کی طرف توجہ کی جائے[1] ۔''

انجمن پنجاب کا دوسرا مشاعرہ ایک ماہ کے بعد ۳۰ مئی کو منعقد ہوا ۔ یہ گذشتہ مشاعرے سے زیادہ با رونق تھا ۔ بہت سی ممتاز شخصیتوں ، ممتاز عہدہ داران عدالت ، معزز رؤسا ، کالجوں اور مدارس کے اساتذہ اور طلباء ، پنجاب یونیورسٹی کے ممبر اور علم دوست حضرات نے اس میں شرکت کی ۔

---

۱ ۔ عزیز احمد : مقالات گارساں دتاسی ، بابت ۱۸۷۴ع ، اردو ، اپریل ۱۹۴۰ع ، صفحہ ۲۸۳ ۔

''جب سب لوگ جمع ہو چکے تو لاہور کالج کے مولوی الطاف حسین حالی نے اپنی نظم پڑھی جس کا عنوان ''برکھا رُت'' تھا ۔ اس کے بعد مولوی الطاف علی نے ، جو گورنمنٹ گزٹ کے اردو مترجم ہیں ، اسی موضوع پر ایک نظم ''ابر کرم'' پڑھی ... دونوں شعرا کے کلام میں الگ الگ قسم کی دل پذیر خصوصیت اور حسن کا بانکپن تھا ۔

''ان کے علاوہ پانچ اور شعرا کی پانچ نظمیں پڑھنے کے لائق ہیں ۔ یہ مجلس مشاعرہ اس قدر مفید ثابت ہوئی ہے کہ اس کی قوی امید ہے کہ آئندہ مشاعرے اور زیادہ کامیاب ہوں گے اور گورنمنٹ پنجاب کے مسٹر ہالرائیڈ کا نیک مقصد جو اس کے قیام سے وابستہ تھا ، پوری طرح حاصل ہو کے رہے گا ۔ اردو شاعری خیالات فاسد اور بیہودہ مضامین سے پاک ہو جائے گی اور ان کی بجائے دنیا کی چیزوں کی تفصیلی تصویریں پیش کی جائیں گی ۔

جب شعرا اپنی اپنی نظمیں سنا چکے تو ناظم صاحب تعلیمات نے اطلاع دی کہ مشہور ہندستانی ادیبوں کی ایک کمیٹی قائم کی جائے گی جو فیصلہ کرے گی کہ کون کون سی نظمیں انعام کی مستحق ہیں ۔ اس کے بعد یہ طے کیا گیا کہ آئندہ مشاعرے کا مضمون سرما یا زمستان ہوگا'[1] ۔

لیکن تیسرے جلسے کے فوراً بعد ہی محسوس کیا جانے لگا کہ انجمن کی فضا مکدر ہو چکی ہے ۔ مخالفت کی بنا نئی شاعری نہیں تھی بلکہ مولوی آزاد سے ذاتی عناد تھا ۔ دوسرے شعرا کی حسب قدرت تعریف بھی کی جاتی تھی اور ان کے

---

۱ - عزیز احمد : مقالات گارساں دتاسی ، اردو ، اپریل ۱۹۴۰ع ، صفحہ ۲۸۲ ، ۲۸۳ ۔

نقائص بھی بیان کیے جاتے تھے ، لیکن آزاد کی نظموں پر خصوصیت سے سخت تنقید کی جاتی تھی - ۴ جولائی کی اشاعت میں تیسرے مشاعرے پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیر ''پنجابی'' لکھتا ہے :

''مجمع کو دیکھ کر دلی کے اردوے معلی کے بازار کا دھوکا ہوتا تھا . . . دس یا بارہ شعرا ایسے بھی تھے جن کو پہلی بار اپنا کلام سنانے کا موقع ملا تھا - ان کے اشعار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلی اور پنجاب کے شعرا ناظم صاحب تعلیمات کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی دو تین مجلسوں کے بعد وہ شراب و ساقی کا تذکرہ ترک کر دیں گے اور مناظر قدرت کی تصویر کھینچیں گے - ہم اپنے اعلیٰ خیال شعرا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے طرز تحریر کو نہ بدلیں اور حسب سابق ہمارے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں - جدت پسندوں کی زیادہ قدر نہیں ہوتی ، کیوں کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کی نظموں کو پسند کر سکتے ہیں' -''

اس مضمون میں مولانا آزاد کو خاص طور پر ہدف ملامت بنایا گیا :

''اپنے نام کی مناسبت سے انھوں نے شاعروں کو ہر طرح کی آزادی دے دی ہے - انھوں نے دنیا بھر کے شاعرانہ مبالغوں اور ترکیبوں کو یک جا کر دیا ہے -

---

۱ - عزیز احمد : مقالات گارساں دتاسی ، اردو ، اپریل ۱۹۴۰ع ، صفحہ ۲۸۳ ، ۲۸۴ -

ان کی نظم کا تین چوتھائی حصہ تو ان کے اساتذہ کا ترجمہ ہے جو ایک جگہ ڈھیر کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جنھیں کبھی کسی نے نہ دیکھا اور نہ بیان کرنے کا قصد کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے خواب کی تصویر کھینچی ہے جس کی تعبیر ممکن نہیں۔ مثلاً کیا کبھی ہمارے ملک میں ایسی سردی ہوتی ہے کہ دریاؤں کا پانی یخ بن گیا اور بلا کشتی کے لوگ دریاؤں کے پار جانے لگے؟ ہم تو اپنی سرزمین کے مناظر کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے اور آزاد نے ان گاڑیوں کا ذکر کیا ہے جنھیں سرد ملک میں بارہ سنگھے کھینچتے ہیں، اور ان ممالک کا نقشہ کھینچا ہے جو ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سرما کی شدت سے شیطان کی سلطنت کا اندازہ ہوتا ہے۔''

حالی کی ''برکھا رُت'' پر ''پنجابی اخبار'' میں یوں تبصرہ کیا گیا[1]:

''جس کسی نے اسے پڑھا نہ ہو، چاہیے کہ اسے ضرور پڑھے اور دیکھے کہ کس نزاکت سے شاعر نے اپنے خیالات کو ادا کیا ہے۔ اس نظم سے سب محظوظ ہوئے، اور جس کسی کو ذرا بھی ذوق ہے وہ مبہوت ہو جائے گا اور اس کی خوبیوں کی قدر کرے گا۔ ہماری سرزمین کے اصلی حالات اس خاص انداز سے بیان

---

۱ - عزیز احمد : مقالات گارساں دتاسی، اردو، اپریل ۱۹۴۰ء، صفحہ ۲۸۴ -

کیے گئے ہیں جس کی نظیر کسی اردو مثنوی میں نہیں مل سکتی - شاعر نے مبالغوں ، عشقیہ تلمیحوں اور کسی ایسی چیز کو ، جو مخرب اخلاق کہی جا سکے ، بالکل استعمال نہیں کیا ہے - پھر بھی وہ شاعرانہ تخیل کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچ گیا ہے[۱] -''

اسی اخبار کی ۲۵ جولائی کی اشاعت میں آزاد کی مثنوی ''زمستان'' کا پورا جائزہ لیا گیا ہے جسے ہوبہو نیچے درج کیا جاتا ہے -

''ہمارے اخبار کے ایک بڑے مددگار نے مولوی محمد حسین کی مثنوی کا ریویو لکھ کر بھیجا ہے - ہم اس کو اس واسطے درج کرتے ہیں کہ آزاد اس مضمون سے مستفید ہو اور اپنی بگڑی ہوئی زبان اور پوچ خیالات کی درستی میں کوشش کرے ؛ وہ یہ ہے :

''مولوی محمد حسین کے کلام کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ؛ اس لیے کہ حضرت کو فضیلت کے اعتبار سے بھی اور پروفیسری کی وجہ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ اس جلسے کی ابتدا ان سے ہی ہوئی ، اعلیٰ درجے کا ہونا چاہیے - معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے کبھی شعر نہیں کہا - ابھی الف بے تے ہے ، اور انہیں مضامین پر مشق کرتے ہیں - استعداد تو سنا خاصی ہے ، ہو گی . . . کیوں نہیں ، کالج کے پروفیسر ہیں - پس مجھ کو آن کے کلام کے عیوب بتانے اور نقص جتانے ضرور پڑے کہ جلدی آن کی طبیعت درست ہو جائے -

---

۱ - عزیز احمد : مقالات گارساں دتاسی ، اردو ، اپریل ۱۹۳۰ع ، صفحہ ۲۸۵ -

خیر اگر محاسن شعری نہ ہوں تو کلام عیوب سے تو پاک ہو جائے ۔ مجھ کو جناب مولانا یہ نہ سمجھیں کہ میں اُستاد بن بیٹھا ہوں ۔ نہیں نہیں ، معاذاللہ ۔ جو پانچ چار سو آدمیوں کا اُستاد ہو ، بلکہ فضیلت کے اعتبار سے ملائک کے اُستاد بننے کی لیاقت رکھتا ہو ، میرا کیا منہ ہے جو میں اس کا مقابلہ کر سکوں ۔ میں نے تو اپنے نزدیک بھلائی کی ہے، مگر ایسا نہ ہو کہ اس کو برعکس سمجھیں ۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جناب مولانا انصاف سے ملاحظہ فرمائیں گے ۔ راقم نے صرف وہی غلطیاں لکھی ہیں جو بادی‌النظر میں معلوم ہو گئیں اور صریحی اور بدیہی ہیں ۔

''آ زمستان کہ تو ہے بادشہ برفانی''

زمستان کے بلانے کو اُس کا بادشاہ برفانی ہونا بھی کوئی وجہ ہے ؟ دوسرے مصرع میں لفظ برفانی میں یائے خطاب کہیے گا تو اردو والا کون مانے گا ؟ اور زائد ہے تو کیوں ہے ؟ اور نسبت کی ہے تو کہاں درست ہے ؟ شاہ انگلستانی و شاہ ایرانی بھی بولیے گا ؟

''شرق تا غرب ترا ملک ہے ہر طرف سفید''

کیا غضب ہے ! شرق تا غرب بچہ بھی نہیں بولتا ، شرق سے غرب تک اور شرق سے لے کر غرب تک اردو میں صحیح ہے اور از شرق تا غرب فارسی میں ۔ مدرسے کی بولی کی ہمیں خبر نہیں ۔

''گل و گلزار ہیں ویران نظر آتے سارے''

گلزار کی ویرانی صحیح ، مگر حضرت ! گل کی ویرانی کون بولتا ہے ؟ گل کیا اُجڑے گا ، مرجھانا کہیے ،

کھلانا فرمائیے ، سوکھ جانا لکھیے ۔

''یا الٰہی وہ جوانان چمن ہو گئے کیا،،

للہ مجھ کو بتلائیے کہ جوانان و مرغان کا قافیہ کیوں کر درست ہوسکتا ہے ؛ حضرت شاید آپ نے کبھی سنا ہو، یہ ایطائے جلی ہے جو ایک شعر میں قطعاً ممنوع ہے۔ دونوں میں الف نون جمع کا ہے اور اس کے حذف کے بعد جوان اور مرغ باقی رہتا ہے ۔ اگر آپ کے نزدیک جوان اور مرغ کا قافیہ درست ہے تو جوانان اور مرغان کا بھی ہوگا ، یہ بات آئندہ بھی یاد رکھیے گا ۔

''کان میں پوچھیے کس سے کہ رہا گل بھی نہیں''

گل کے کان میں کہنا تو درست ہو سکتا ہے کیوں کہ گل کو کان کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں مگر، گل سے کان میں پوچھنا آج ہی سنا ہے ۔ ہائے ہائے ، یہ فضیلت اور یہ موٹی غلطی !

''خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے''

جناب عالی ! جاڑے میں تو رطوبت بڑھتی ہے ۔ نزلہ ، زکام ، کھانسی انھی دنوں میں ہوتے ہیں ۔ دمے کی شدت اسی موسم میں ہو جاتی ہے ۔

''لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے''

'انگیٹھی' کہاں کی بولی ہے ۔ ہم لوگ بلکہ سارے اہل ہند ، انگیٹھی جلیبی کے وزن پر اشتمال نون کے ساتھ بولتے ہیں ، اور ہے بھی یونہی ۔ آپ نے بے جا تصرف کرکے لفظ کا کیوں خون کیا ؟

''ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں''

اوپر کے مصرع میں بھی کئی کانپتے ہیں غضب ہے ۔

کپکپی چھوٹی ہے کہ منہ سے برابر یہی جملہ نکلے جاتا ہے۔ جاڑے سے ہانپنا آپ ہی سے سنا ہے۔ یہ گرمیِ فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

"کہیں سُو سُو کہیں سی سی ہے کہیں سیٹی ہے"

آہا ہا، کیا بلاغت ہے! سردی کے مارے سُو سُو ضرور کرتے ہیں مگر سی سی وہ کرتا ہے جس کا منہ مرچوں سے جل جاتا ہے، اور سیٹی وہ بجاتا ہے جو کبوتر اڑاتا ہو، یا اُس شخص کو جو آواز پر لگا ہوا ہوتا ہے، پکارتا ہے۔ ان لفظوں کی تحقیق آپ نے سنی؟ فرمائیے صحیح ہے یا غلط؟ اب یاد رکھیے، آئندہ یہ غلطی نہ ہو۔

"گرد سب بیٹھے ہیں......الخ"

اس میں بھی وہی انگیٹھی کی غلطی ہے۔ غضب جلاتے ہو۔ ذرا تو سونچا کیجیے۔

"تن تو ٹھنڈے ہیں پڑے سینوں میں ہے آگ لگی"

سردی کی یہ شدت اور پھر سینے میں یہ گرمی۔ یہ عشق کی آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے ورنہ سینہ سب سے زائد سرد رہتا ہے۔

"دل میں ہے آگ لگی منہ سے اگلتے ہیں دھوئیں"

دھواں اگلنا کیا عجیب محاورہ ہے۔ صدقے آپ کی زبان دانی کے!

"تیرے افضال سخاوت تہ افلاک ہیں عام"

واہ واہ مرحبا! افضال سخاوت! کیا ترکیب ہے! یہ اضافت کیسی ہے؟ سخاوت کا فضل کیا؟ اس سے بڑھ کر ردیف کا خون کیا ہے۔ اول مصرع میں "افلاک

ہیں عام'' اور دوسرے میں ''پوشاک ہے عام'' ۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے ۔ اس سے تو بلا سے یوں لکھتے تو اچھا ہوتا : ''ترے انعام کا شہرہ تہہ افلاک ہے عام'' ردیف بھی ٹھیک ہو گئی ۔

''کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی''

حضرت سلامت ! محاورہ تو یہ ہے ''کبھی کے دن بڑے اور کبھی کے رات ۔''

''بزم احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے''

اب تو مجھ کو بے اختیار ہنسی آتی ہے ۔ خدا کے لیے اس فضیلت پر یہ خرافات ! اے حضرت صحبت احباب کہو ، یا بزم احباب ۔ بلا سے یوں ہی لکھتے ''ملتا احباب کی صحبت کا مزہ ہے تجھ سے ۔''

''شب سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزا''

یہ مولویت اور یہ تہذیب کا جلسہ اور یہ ہزل ، معاذاللہ ! معاذاللہ !

''یار حقے کے ترے دور میں لیتے ہیں مزے
دود تلخ اس کے سوا دور سے دیتے ہیں مزے''

ضعف تالیف اور ہزل سے قطع نظر ، المعنی فی بطن شاعر۔ شاید اب کے مشاعرے میں اس میں معنی ڈالیں گے ۔

''گھونٹ حقے کے یہ ہر دم نہیں ہم بھرتے ہیں''

کیا ستم ہے ، ایسے تربیت یافتہ ہو کر یہ خرافات مضامین لکھنے حضرت نے کیوں کر گوارا کیے؟ انجمن کا مشاعرہ نہ ہوا ، ککڑ والے کی دکان ہوئی ۔

''صوفی و رند کے جلسے کا تو ہی ساقی ہے''

کیوں صاحب ! صوفیوں کی مجلس یعنی خانقاہ میں بھی

ساقی ہوتا ہے ؟ شاید آپ کو بھی ساقی سے کام پڑتا ہوگا۔

''بے نہیں ہے یہ ہے تصویر خیالی اڑتی''

اول تو شراب کا ذکر حضرت کی ثقاہت اور اس جبہ و دستار پر نہیں پھبتا اور پھر اس مہذب مشاعرے میں ! پھر تصویر کا اڑنا کیا ، یہ عجیب محاورہ ہے ۔

''چائیں پی پی کے ترے سر کو دعا دیتے ہیں''

جان کو دعا دینا تو سنا ہے مگر سر کو دعا دینا اردو میں حضرت ہی کا محاورہ ہے ۔ دوسرے دعا کا استعمال ایسے موقع پر 'دینے' کے ساتھ ہے ، نہ 'کرنے' کے ساتھ ۔ ذرا تامل، کو تو کام فرمایا کیجیے ۔

''شب سرما میں اگر لطف ہے مے نوشی کا''

پھر وہی مستانہ روش پر چلے ! حضرت ذرا ہوش میں آئیے ۔

''بزم دربار میں ہیں صاحب فرماں آتے''

'بزم دربار! کیا اچھی ترکیب ہے ۔ قربان اس لیاقت و قابلیت کے ۔

''شجر طور کا عالم ہے بنانا آتا''

حضرت ہم نے تو عالم دکھانا سنا ہے ، عالم بنانا آپ کی گھڑت ہے ۔

''ساتھ ہے کوہ ہمالہ کو اٹھاتا لاتا''

ماسبق سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج کے نکلنے کا بیان ہے ۔ پھر کوہ ہمالہ کو اٹھا لانا کیا معنی ! کیا آفتاب پہاڑوں کو سر پر لیے پھرتا ہے ؟

''گرچہ ہر جا پہ ترے چلتے قوانین ہیں اور''

ہر جگہ تو ہم لوگ بولتے ہیں ، یہ 'ہر جا' کس گاؤں کی

بولی ہے اور 'ہر جا پہ' کی جگہ 'ہر جائے' کیوں نہ لکھا ؟ کہہ دیجیے کہ کاتب کی غلطی ہے - سہل چھوٹ جائیے گا -

''ایک جھوکا جو ترے حکم کا آ جاتا ہے
تو لباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے''

حضرت اس شعر کا قافیہ تو فرمائیے کون سا ہے ! یہی کہیے گا 'آ' اور 'بدل' - واہ واہ ، سبحان اللہ ! قافیہ اسی کو کہتے ہیں -

''زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک
کوہ سے کاہ تلک باغ کے اشجار تلک

کوہ اور کاہ کا مقابلہ کمیت یعنی مقدار اور وزن میں تو آتا ہے مگر اس کیفیت میں ایجاد بندہ ہے - حضرت یہ تو جانتے ہیں کہ کوہ کی زردی گھاس ہی کے اعتبار سے ہے - پتھر تھوڑے ہی زرد ہو جاتے ہیں - اسی طرح باغ کی دیواریں زرد نہیں ہوتیں ، وہ اشجار ہی تو زرد ہوتے ہیں - پھر مقابلہ اور اشتراک کیوں کہ صحیح ہوگا -

''زعفراں پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت''

کیا زعفران کسی لباس کا نام ہے ؟ ہاں زعفرانی پوش تو ہو سکتا ہے -

''جام گردوں میں ہے تو شیر جاتا کیوں کر''

ہم کو اس کے معنی ہی نہیں معلوم ہوئے -

''اور ہر میوہ ہے قدرت سے خدا ساز درست''

''قدرت سے خدا ساز درست'' نرالی ترکیب ہے -

''برف کا اسپ سبک خیز بھی ہوتا ہے وہیں''

'سبک خیز' سے معلوم ہوا کہ برف کا گھوڑا دوڑتا بھی ہے - حضرت کی طبیعت بڑی جولانیوں پر ہے - ماشاء اللہ !

''ہے کبھی دیو کی تصویر نمودار کھڑی''

'نمودار کھڑی' کیا اچھی ترکیب ہے - شاید کوئی کنجڑا قصائی بھی یوں نہ بولے گا - اور اس سے بڑھ کر دوسرے مصرع میں 'پری پرواز سے تیار کھڑی' ہے -

''اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی ابھی بھر جاتا ہوں''

یہ تو فرمائیے اس مصرع میں لفظ 'بھی' کیوں کر سما سکتا ہے - ماشاء اللہ طبیعت بھی نہایت موزوں ہے - ہے تو یوں کہ یہاں حضرت چو کڑی بھولے -

''شیر وابستۂ زنجیر بناتا ہے وہیں''

اوہو ! برف کا شیر زنجیر سے بھی بندھا ہوتا ہے - صاحب ، ہم نے تو نہ یہ باتیں دیکھیں نہ سنیں - ہمارے ملک میں تو برف کی مکھی بھی نہیں بنتی ، یہ شیر اور ہاتھی کہاں ! اگر انگلستان کے پہاڑوں میں ایسا ہوتا بھی ہے تو شیر وابستۂ زنجیر تو کوئی بڑا احمق بھی یقین نہیں کرے گا -

''اور کبھی صورت شیطان بنا دیتا ہے''

کیا صورت شیطان بنی ہے لاحول ولا قوۃ !

ان سب مضامین کا ریویو تو ''پنجابی اخبار'' میں ہو چکا ہے ، ہم نے تو صرف غلطیاں لکھی ہیں -

''خون بے جرم سے کرتا ہے اسے گلناری''

گلنار کی جگہ گلناری باندھ دیا ہے - ایسی غلطیاں تو

حضرت کو مباح ہیں ۔

''تیر سا دیدۂ عبرت میں چبھا جاتا ہے''

کیا خوب ، یوں کہیے کہ عبرت کی آنکھ کو پھوڑتا ہے ۔ اور تو معنی سمجھ میں نہیں آتے ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔

''پہلواں بے مے وبے جام شرابور ہیں مست''

اوپر کے مصرع میں ''شرابوں سے ہے مست'' ہے ۔ اس مصرع میں قافیہ پڑھا ہی نہیں جاتا ۔ ہم تو جانیں اس غلطی کو کاتب کے سر پر رکھیے ۔ کہاں تک یہ بوجھ اٹھائیے گا ۔

''قدم آگے کو رپٹ کر ہیں نکلتے جاتے''

ہماری تو یہ بولی نہیں ۔ ''آگے کو'' قصبات کے لوگ بولتے ہیں ۔ کیوں جناب ایڈیٹر صاحب ! مولوی صاحب کہاں کے رہنے والے ہیں ؟

''یہ اچھل جاتے ہیں اور آگے پھسل جاتے ہیں''

یہ کیا ؟ اچھل بھی جاتے ہیں اور پھسلتے بھی جاتے ہیں ؟

''دیکھ کاغذ ورق ہاتھ میں لہراتا ہے''

جناب ایڈیٹر صاحب ! ذرا آپ پوچھ دیجیے کہ یہ مصرع حضرت نے خواب میں فرمایا تھا یا بیداری میں ؟ ورق کو اگر مضاف نہ کریں تو مصرع موزوں نہیں ہوتا اور کرتے ہیں تو حضرت معنے فرمائیں ، اور اس اضافت کے جواز کا فتویٰ دکھائیں ؟ اس سے قطع نظر کیجیے تو بھی تو معنی کیا ہیں ۔ غرض کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا ۔

''اور قلم ھاتھ سے تھرا کے گرا جاتا ھے''

قلم ہاتھ کے تھرانے سے گرتا ہے یا خود قلم تھرا کر گر پڑتا ہے ۔ نازم بدیں دستار فضیلت ۔

''تپش عشق سے دل رھوے مرا نرم سدا''

صاحب ہم تو 'رہے' بولتے ہیں اور یہی لکھتے ہیں ۔ رہوے تو ٹکسال باہر ہے ۔

''انجمن پنجاب کا تیسرا جلسہ ۳ ستمبر کو منعقد ہوا ۔ بہت سے شاعروں نے اس میں شرکت کی اور بہتوں نے اپنا کلام اس میں پڑھنے کے لیے بھیجا ۔ مولوی محمد شریف ایڈیٹر ''طلسم حیرت'' مدراس کی بہت تعریف ہوئی ۔ الطاف حسین حالی کی نظم کو ، جو اس مشاعرے کی نظم کے موضوع ''حب وطن'' کے محرک تھے ، سامعین نے جو مجلس میں بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے ، نہ صرف دل چسپی بلکہ جوش اور سرگرمی سے سنا ۔ ان شعرا میں سے جنھوں نے خود اپنا کلام سنایا ، محمد حسین کا ذکر ہے ۔ ان کے انداز تحریر میں وہ خوبیاں موجود نہیں جن کو مصلحین رواج دینا چاہتے ہیں ۔ انھوں نے شراب و مستی و لالہ و گل کا بھی ذکر کیا ہے اور آن تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا ہے جو ان کی ذہانت سے وابستہ تھیں ۔

''حقیقت میں آزاد کی یہ مثنوی جس کا عنوان ''صبح امید'' ہے سخت تنقید کے قابل ہے ۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کے اس قابل شاگرد رشید کی نظم کے ہر شعر کو جانچا گیا ہے جو اپنے آپ کو انکسار سے ان کا سب سے حقیر شاگرد بتاتے ہیں ۔ ایسے استاد کے مقابلے

میں جو تفصیلات پر اس قدر نظر رکھتا تھا ، آزاد بہت
پیچھے ہیں اور اس شہرت کے مستحق نہیں جو ہندوستانی
انگریزیت دوستوں نے انہیں دے رکھی ہے ۔''

''پنجابی اخبار مورخہ ۱۵ اکتوبر میں آزاد کی مثنوی
''صبح امید'' پر جو تنقید شائع ہوئی ، وہ ''کوہ نور'' مطبوعہ
۱۷ اکتوبر میں نقل کی گئی ۔ اس پر مدیر ''کوہ نور'' نے
ایک مختصر سے نوٹ کا اضافہ کیا جس میں وہ اپنی اس سے
قبل کی اشاعت میں آزاد پر چند تعریفی کلمات پر پریشانی کا
اظہار کرتے ہوئے اپنی پرانی خوش اعتقادی کا کفارہ ان
الفاظ میں ادا کرتا ہے :

''پنجابی اخبار'' مطبوعہ ۱۰ اکتوبر میں ذوق کے کسی
لئیق شاگرد نے آزاد کی مثنوی ''صبح امید'' کا ریویو
کیا ہے ۔ اس سے جس قدر صاحب مضمون کی لیاقت کا
ثبوت ملتا ہے ، اس سے زیادہ آزاد صاحب کی
ہرزہ سرائیوں کا اظہار ہوتا ہے ۔
اکثر اہل علم و فضل تو آزاد کی علمی لیاقتوں کو
بھی کچھ وقعت نہیں دیتے ۔ مگر زمانے کی حالت
دیکھ کر ہم نے ان کو مولوی مان لیا تھا اور ان کی
طلاقت زبان کے صدقے میں ان کے کلام کو بھی ایک
دو مرتبہ 'پر زور' کہہ دیا ، جس سے شاید ایک آدھ بار
ایڈیٹر ''پنجابی'' نے بھی اتفاق رائے کیا ہے ۔ لیکن اس
ریویو نے ہماری تمام امیدیں قطع کر دیں ۔ عالی دماغ
نکتہ چین نے ایسے ایسے اعتراض کیے ہیں جو بالواقعہ
بدیہی ہیں اور یقیناً آزاد کی پریشاں خیالی ان کا مقابلہ
نہیں کر سکتی ۔ اعتراض مذکور اس قسم کے ہیں کہ

ان سے بے تامل آزاد کی فصاحت اور بلاغت بلکہ علمیت پر بھی حرف آتا ہے اور یہ بیان اس پر طرہ ہے کہ آزاد شیخ ذوق مغفور کے شاگرد ہیں جن کی شاگردی سے ان کو فخر تھا ۔

''ہماری رائے یہ ہے کہ آزاد صاحب کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں اور طبیعت بھی بری نہیں رکھتے ، مگر بلند پروازیاں ان کو سر اٹھانے نہیں دیتیں ۔ اگر سوچ سمجھ کر لکھا کریں تو ان کے کلام سے ہمارے مشاعرے کو شاید بہت عزت ملے ۔ ہم اپنے اخبار کے ناظرین کی تفنن طبع کے لیے مضمون مذکورۃالصدر ''منقولات'' میں نقل کرتے ہیں ۔

''اس سے پہلے کہ میں مثنوی پر کچھ لکھوں ، تھوڑا سا حال اپنا اور صاحب مثنوی کا گذارش کرتا ہوں ۔ بندہ دلی کا رہنے والا اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کا ایک ادنیٰ شاگرد ہے ۔ برسوں اپنا کلام استاد مرحوم کو دکھایا ہے اور بڑے بڑے معرکے کے مشاعروں میں ان کے ساتھ رہا ہے ۔ استاد کا کوئی نامی شاگرد ایسا نہیں ہے جس کو میں نہ جانتا ہوں ۔ استاد کے طرز کلام سے بھی مجھ کو کسی قدر آشنائی ہے ۔ باوجود ان سب باتوں کے میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے مولوی محمد حسین آزاد کو نہ کبھی استاد کے سامنے غزل لاتے دیکھا ، نہ ان کے ساتھ کسی مشاعرے میں پڑھتے سنا ۔ یہ اور بات ہے کہ مولوی محمد باقر استاد کے بڑے گاڑھے دوست تھے ۔ شاید اس لحاظ سے استاد ان کو اپنا پیارا بھتیجا جانتے ہوں ، مگر استاد کا بھتیجا ہونے سے

یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ان کے شاگرد رشید بھی بن جائیں ۔ خیر ہم نے ان سب باتوں پر خاک ڈالی ۔ کاش مولوی صاحب کو شاعری سے کچھ مناسبت ہی ہوتی ، تو بھی استادی شاگردی کا دعویٰ ان کے چہرے پر کھل جاتا ۔ جب یہ بھی نہیں تو میں حیران ہوں کہ یہ بزرگوار کیوں لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہوتے ہیں اور کس واسطے لوگوں سے اپنا خاکہ آڑواتے اور کس لیے دہلی اور اہل دہلی کا نام بدنام کرتے ہیں ۔ سنو صاحب ! یہ کچھ برا ماننے کی بات نہیں ہے ۔ آپ فاضل ، آپ منشی ، آپ پروفیسر ، آپ کی کتابیں سرکاری مدرسوں کی پڑھائی میں داخل ۔ جب اتنی فضیلتیں آپ میں جمع ہیں تو پھر کیا ضرور ہے کہ آپ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شریک ہوں ۔ اگر ایک شعر کہنا نہ آیا نہ سہی، اور بزرگیاں کیا تھوڑی ہیں ۔ اور اگر ایسا ہی شاعر بننے کا شوق ہے تو استاد مرحوم کے بڑے بڑے شاگرد اب بھی موجود ہیں، جیسے حافظ ویران ، نواب مرزا داغ وغیرہ ، انھیں کو اپنا کلام دکھا لیا کیجیے ، اور اگر یہ بھی نہیں تو مولوی فیض الحسن صاحب، جن سے تم نے مدت تک دلی میں پڑھا ہے ، اب وہ لاہور میں موجود ہیں ، انھیں سے مشورہ کر لیا کیجیے ۔ بھائی ! شاعری بڑا بے پیرا فن ہے ۔ تم کیا ہو ، ہم نے اس میں بڑے بڑوں کو سر کے بل گرتے دیکھا ہے ۔ آج تک جتنا تمھارا کلام چھپ چکا ہے ، اس میں ایسے مصرع بہت کم پائے جاتے ہیں جن کو سن کر انسان خاموش رہے ، ورنہ ہر شعر سن کر

بے تامل ہنسی آتی ہے -

''خصوصاً ''مثنوی امید'' میں تو تم نے ایسا بھکنا شروع کیا ہے کہ ساری مثنوی کو مجذوب کی بڑ کر دیا ہے - ساری مثنوی میں الفاظ ہی الفاظ نظر آتے ہیں ، معنی کا کہیں نام و نشان نہیں - اس کے علاوہ بیان ایسا پھسانڈا ہے جس کو سن کر دھنیے جولا ہے بھی ہنستے ہیں - اگر تم کو میرے کہے کا یقین نہیں آتا تو ذرا غور سے ان چند شعروں کو دیکھو جو بطور نمونہ کے ذیل میں لکھے جاتے ہیں :

کام کرتی تھی جہاں تک نگہ دور انداز
تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمن قدرت راز

دوسرے مصرع میں 'راز' کا حال نہیں کھلتا کہ کیا ترکیب کہیں - راز کی قدرت کس درخت کا نام ہے اور اگر مضاف نہیں تو پھر اس کو جملے سے کیا ربط ہوگا ؟

آرزوؤں سے کھلے ہیں گل رعنا یکسر
جن سے نکلیں گے ثمر ہائے تمنا یکسر

خدا جانے گل رعنا کس کی تمناؤں سے کھلے ہیں - ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں یوں ہوگا -
''آرزوؤں کے کھلے ہیں گل رعنا یکسر''- مگر اس میں یہ خرابی ہے کہ آرزو اور تمنا ایک ہی چیز ہے - پس آرزوؤں کے پھولوں سے آرزوؤں ہی کے پھل نکلنے کچھ بے معنی سی بات ہے -

گرچہ تھا پاؤں اٹھانے کا نہ یارا دل کو
کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو

عقل ہرچند یہ کہتی تھی کہ ہے دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت

پہلے شعر میں 'ایسا سہارا' کا لفظ سن کر سامع کو یہ انتظار ہوتا ہے کہ اگلے شعر میں اس سہارے کا اندازہ بیان کیا جائے گا، مگر دوسرا شعر سن کر اس کا دل سرد ہوجاتا ہے۔ شاید کاتب وہ شعر لکھنا بھول گیا جس میں سہارے کا بیان تھا۔

دل اس آواز پہ اس طرح کھچے جاتے ہیں
جیسے ذرے سوے خورشید اُڑے جاتے ہیں

میں نے آج تک کسی بازاری کو بھی اس طرح بات چیت کرتے نہیں سنا کہ بگھی اس طرح دوڑی جاتی ہے جیسے ریل اڑی جاتی ہے۔ یا تو یوں بولتے ہیں کہ گویا ریل اڑی جاتی تھی، یا یوں کہتے ہیں جیسے ریل اڑتی ہے، یا جیسے ریل اڑی جاتی ہو۔

اس طرف میرا دل زار بھی یوں آہ چلا
جیسے بلبل سوے گل کبک سوے ماہ چلا

پھر وہی ٹھوکر لگی ہے۔ دوسرے مصرع میں 'چلے' کی جگہ 'چلا' فرما گئے ہیں۔

مخمل سبز سے ہے سبزۂ تر ہا انداز
رنگ گل اُس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز

یا تو میں اس شعر کے معنی نہیں سمجھا، یا مولوی صاحب کو یہ مضمون یوں پورا ادا کرنا چاہیے تھا کہ مخمل سبز کی جگہ سبزۂ تر اور سبزۂ تر کی جگہ مخمل سبز آتا، ورنہ اس شعر کے معنی میرے نزدیک تو کچھ نہیں ہو سکتے۔ اور رنگ گل کی طرف

فعل جمع کو نسبت کرنا بھی تعجب سے خالی نہیں ۔

اک طرف عقل ہے ، اک سمت کو تدبیر کھڑی
آگے جام مئے غفلت لیے تاثیر کھڑی

معلوم نہیں کہ تاثیر کو یہ خدمت کس مناسبت سے سپرد کی گئی ہے ۔

غور کی راز نہفتہ میں بہت سی میں نے
شجر چتر پہ لیکن جو نظر کی میں نے

میں نے ساری لغت کی کتابیں دیکھیں مگر یہ نہ کھلا کہ 'شجر چتر' کون سے درخت کو کہتے ہیں ۔

دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال
دونوں پر کھولے ہوئے ہے یہ ہوائے اقبال

ہمائے اقبال سے مراد غالباً خود اقبال ہی ہوگا ۔ پھر نہیں معلوم کہ دوسرے مصرع میں وہ کون سا اقبال ہے جس کی خواہش میں خود اقبال پر کھولے بیٹھا ہے ۔

آ کہ آباد ترے دم سے ہے دائم دنیا
اور مثل ہے کہ بہ امید ہے قائم دنیا

اوپر سے یہ فرماتے چلے آئے ہیں کہ ہمائے اقبال نے مجھ کو بلایا ہے اور کہا کہ آؤ آزاد تم کو سایۂ اقبال میں لیوں اور یہ دربار شہزادیٔ امید کا ہے ۔ جب اس نے یہ کہا تو میرے منہ سے یہ مطلع موزوں نکلا ۔ وہ یہی مطلع ہے : آ کہ آباد . . . الخ ، معلوم نہیں کہ یہ کس کی طرف خطاب ہے اور کس کو بلاتے ہیں ؟ ظاہرا امید کی طرف خطاب معلوم ہوتا ہے ، لیکن جب یہ خود بلائے گئے ہیں تو پھر وہاں کس کو بلاتے ہیں ۔ امید تو وہاں موجود ہی ہے ۔

تار برق سے سوا حکم ترا چلتا ہے
دیکھا جس ملک میں واں سکہ ترا چلتا ہے

بھائی آزاد! شرم کی جگہ ہے - ذوق کا شاگرد اور دہلی کا رہنے والا اور مولوی محمد باقر کا بیٹا اور ایسی موٹی غلطی کرے جس کے ظاہر کرنے سے ہم کو خود شرم آتی ہے - حضور یہ تو ارشاد ہو کہ حکم کا قافیہ دوسرے مصرع میں کہاں ہے ؟ یہاں تو سہو کاتب کا عذر پیش نہ کیا جائے گا - ایسا لفظ کہاں سے لاؤ گے جو حکم کا قافیہ ہو سکے - بھائی ! تمھاری طبیعت کو شاعری سے بالکل مناسبت نہیں - بس بہت اپنا خاکہ اڑوا چکے، اب بازآؤ اور شاعروں کی فہرست سے اپنا نام کٹواؤ -

ایسا مست مے جرأت انھیں کر دیتی ہے
بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے

پیمانۂ دل خون سے بھر دینا معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے اور کیا معنی دیتا ہے ؟

کہ نشا آنکھوں پہ عینک ہے لگاتا گویا
سیر فانوس خیالی ہے دکھاتا گویا

'نشا' بر وزن 'دوا' سوا بازاریوں کے کوئی نہیں بولتا - صحیح لفظ نشہ بروزن چشمہ ہے اور اس طرح تمام شاعر باندھتے چلے آئے ہیں - اس کے علاوہ یہ شعر پہلے شعر کا بیان بھی نہیں ہو سکتا - آنکھوں پر نشہ عینک لگانا اور سیرفانوس خیالی دکھانا ، خدا جانے اس سے کیا مراد ہے - بھلا جرأت کا بیان کیوں کر ہو سکتا ہے -

دیتی ہے چشم تصور میں ہر اک کام دکھا

یعنی امید ہر اک کام کو تصور میں دکھا دیتی ہے -

پس یا تو چشم تصور کی جگہ عالم تصور میں کہنا چاہیے
تھا یا چشم تصور سے کہنا چاہیے ۔ چشم تصور میں
دکھا دینا کوئی نہیں بولتا ۔

دیکھتی چشم تصور ہے یہ جب داغ مراد
اور چمک اُٹھتے ہیں سینوں میں جو ہیں داغ مراد

'داغ مراد' میں نہیں جانتا کون سا داغ ہوتا ہے ؟

طائر دل پر پرواز ہیں پھیلائے ہوئے
اور ترا شوق لیے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

یہ امید سے کہتے ہیں کہ تیرا شوق دوڑائے لیے جاتا
ہے ۔ امید کا شوق تو نہیں دوڑاتا بلکہ مقصود کا شوق
دوڑاتا ہے ۔ امید کی تحریک دوڑاتی ہے ۔

جام دل خونِ شجاعت سے چھلک جاتے ہیں
نعرۂ اہل وغا تا بہ فلک جاتے ہیں

خونِ شجاعت سے اگر شجاعت کا مار ڈالنا مراد ہے تو
شعر کے معنی ، ورنہ خون شجاعت کے معنی ارشاد
ہوں ۔

آبِ شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں
اور جو مرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں

دوسرے مصرع سے شاید یہ مراد ہے کہ وہ موت کو
زندگی سمجھتے ہیں ۔ مگر اس مصرع سے یہ معنی کوئی
ہمیں سا روشن ضمیر سمجھے تو سمجھے ۔ ہاں اگر اس
کی جگہ یہ ہوتا کہ ہم جی جاتے ہیں تو بھی مضائقہ
نہیں تھا ۔

ہو گئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح
بلکہ پیوند ورق ہیں جزِ اصلی کی طرح

شاید جز اصلی تو صحیح نہ ہوگا - ہم نے تو جزو اصلی استاد سے پڑھا ہے -

جام ہمت جو اُسے تو نے ہیں پلوائے ہوئے
کوسوں اک دم میں لیے جاتی ہیں دوڑائے ہوئے

پہلے مصرع میں پلوائےہوئے خدا جانے کہاں کی بول چال ہے - ہم نے تو اپنی یاد میں کسی دلی والے کو اس طرح بولتے نہیں دیکھا کہ تو نے پلوائے ہوئے ہیں یا تو نے کھلائے ہوئے ہیں - مگر بھائی تم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے ، کہیں پنجاب یا ترکستان میں ایسا سنا ہوگا -

زور ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی
اتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

زور ہمت بڑھانا تو بے شک امید کا کام ہے ، مگر پانی کو آگے سے ہٹانا یعنی طالب کو مطلوب سے دور دور رکھنا تقدیر یا سوء تدبیر کا کام ہے ، نہ امید کا -

کہ جسے آب سمجھتا ہے نہیں آب ہے یہ
سرِ دریاے فنا موت کا گرداب ہے یہ

گرداب دریا کے بیچ میں ہوتا ہے ، کہ سر دریا پر ؟

جان پانی میں ہو اٹکی ہوئی دم سینے میں
وہ بھی پر ضعف سے آ کر رہی تھم سینے میں

دوسرے مصرع میں ترقی اور استثنا کچھ فائدہ نہیں دیتا ، کیونکہ دم کا سینے میں آ کر اٹک جانا جو پہلے مصرع سے ثابت ہو رہا ہے اور دم کا سینے میں آ کر تھم جانا جو دوسرے مصرع سے مفہوم ہوتا ہے ، دونوں ایک ہی مطلب پر دلالت کرتے ہیں - پس

دوسرے مصرع نے کچھ فائدہ نہ دیا ۔

ذکر فردوس ھیں تو نے انھیں سنوائے ھوئے
لطف ھردم ھیں وھیں پیش نظر آئے ھوئے

یہاں بھی وہی عجیب محاورہ بندھا ہوا ہے ، یعنی تو نے سنوائے ہوئے ہیں ۔ بھائی باہر رہ کر تم نے اپنے شہر کی بول چال بھی بھلا دی ۔

رند آزاد جو ھردم ھے گرفتار گناہ
بار عصیاں سے ھے بے چارہ گراں بار گناہ

بار عصیاں سے گراں بار گناہ ہونا اور بار گناہ سے گراں بار ہونا ایک ہی بات ہے ۔ میں نہیں جانتا یہ کہاں کی فصاحت و بلاغت ہے ۔

راقم

ذوق کا ایک ادنیٰ شاگرد از دہلی"

انجمن پنجاب کا مشاعرہ ۱۴ نومبر کو منعقد ہوا ۔ گارساں دتاسی نے اپنی کتاب میں اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :

"معلوم ہوتا ہے کہ جو نظمیں اس مشاعرے میں پڑھی گئیں معمولی سی تھیں ، خصوصاً محمد حسین آزاد کی نظم جو گذشتہ نظموں سے بھی پست تھی ۔ بر خلاف اس کے الطاف حسین حالی کی نظم ذوق سلیم کا اعلیٰ نمونہ تھی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشاعرے کا سہرا

اسی کے سر رہا' ۔''

آخر میں ہم دو مضمون درج کرتے ہیں ۔ ان سے ان بڑھتے ہوئے شکوک اور بدظنی پر روشنی پڑتی ہے جو مشاعرے کی بابت عوام میں پیدا ہو رہے تھے۔ ان کا تدارک نہ ہو سکا ، اس لیے یہ تحریک پیش از وقت ختم ہو گئی ۔

(۱)

''وہ معاوضہ جو ان شاعروں کو دیا جاتا ہے جو جدید طرز میں لکھتے ہیں اور جنہیں مشاعرے میں داد ملتی ہے ، زیادہ نگرانی کا مستحق ہے ۔ پہلے یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ ایک کمیشن کو مقرر کیا جائے جو آخر میں سب کو جانچے اور جو سب سے زیادہ مستحق ہیں انھیں نامزد کرے ، مگر یہ کمیشن ابھی تک مقرر نہیں کیا گیا ۔ ہمیں امید ہے کہ ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جائے گا جو صاحب ذوق اور زبان پر قدرت رکھتے ہوں ۔ پسندیدہ جدتوں کے حامی ہوں اور پوری طرح غیر جانب دار ہوں ۔ ہمیں اس امر کی شکایت ہے کہ سررشتۂ تعلیم پنجاب ان تصانیف کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا جو اس کے پاس بھیجی جاتی ہیں اور بجز ان چند لوگوں کی تصنیفوں کے جو سررشتۂ کے ممبر ہیں ، مصنفین کوئی معاوضہ نہیں پاتے ۔ ۔ ۔ اگر مشاعرے کے کمیشن کے اراکین بھی کتابوں کا معاوضہ دینے والے حضرات کے سے ہوں گے ۔ ۔ ۔ تب

---

۱ ۔ عزیز احمد : مقالات گارساں دتاسی 'اردو' ، اپریل ۱۹۴۰ع صفحہ ۲۸۷ ۔

تو شاعر اپنا وقت ضائع کریں گے اور داد بھی نہ پائیں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ کم از کم چار ایسے اراکین مقرر کیے جائیں جو اپنے فرائض بجا لانے کے قابل ہوں اور ان پر یہ لازم قرار دیا جائے کہ جو نظمیں بھیجی جائیں ان کے متعلق اس وقت تک کوئی رائے قائم نہ کریں اور اس وقت تک ان میں سے کسی نظم کو ترجیح نہ دیں جب تک کہ خاص ہندوستانی رسالوں کی رائے ان کے متعلق شائع نہ ہو جائے۔ مثلاً 'کوہ نور'، 'میوگزٹ' 'اودھ اخبار' وغیرہ کی رائے[1]۔''

'پنجابی اخبار' مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۷۴ع

(۲)

''اس مشاعرے کو شروع ہوئے چند ماہ ہوئے، اور بروقت شروع ہونے کے حکام نے ظاہر کیا تھا کہ اس مشاعرے کے جو عمدہ شاعر ہوں گے ان کو بہ شرط پسند اور کمیٹی کی تجویز سے انعام بلکہ کچھ ماہوار دیا جائے گا۔ سو اس میں کئی شاعر ایسے شریک ہوئے جن کی معاش شاعری وغیرہ پر منحصر ہے، اور کتنے ہی ایسے تھے کہ جو صرف اپنے شوق اور ناموری کے لیے شریک ہوئے تھے۔ چنانچہ ان شاعروں میں ایک شاعر زاد، مولوی محمد حسین صاحب جو کہ سررشتۂ تعلیم میں عربی کے پروفیسر ہیں اور بجائے خود اپنے تئیں

۱۔ عزیز احمد: مقالات گارساں دتاسی 'اردو'۔ اپریل ۱۹۴۰ع، صفحہ ۲۸۸، ۲۸۹۔

لاثانی تصور کرتے ہیں ۔ گو دو ایک اور شاعر اس مشاعرے میں ایسے تھے کہ جن کی حکام بھی تعریف کرتے تھے اور لوگوں کے نزدیک بھی اچھے خیال کیے جاتے تھے ، اور ان لوگوں کے روبرو مولوی محمد حسین آزاد کی کچھ دال نہ گلتی تھی اور نہ بے چارے کو شاعری میں رسوخ ہوتا تھا ۔ اور ادھر کئی اخباروں میں ان کی ایسی خبر لی گئی کہ ساری ہی شاعری کا قافیہ تنگ ہوگیا ۔ چنانچہ خاص کر ''پنجابی اخبار،، نے تو اپنا فرض سمجھ لیا ہے ، ہر مشاعرے کے جلسے کے بعد کچھ نہ کچھ آزاد صاحب کے حق میں ضرور ہی لکھ دیتا ہے جس کو اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں ضرور کسی ذاتی معاملے میں کبھی ناچاقی ہو چکی ہے جو ہمیشہ ایسا لکھ دیا کرتا ہے ۔ گو یہ سہی کہ بعض شعر آزاد کے قابل اعتراض کے ہوتے ہیں لیکن نہ ایسے کہ کل شاعروں کو چھوڑ کر صرف آزاد ہی کو دبانا ، لیکن ہاں خرابی یہ ہے کہ آزاد صاحب کا ایک تو عہدہ ایسا ہے ، دوسرے ان کی خود بینی نے یہ کر رکھا ہے ۔ اب تھوڑے عرصے سے آزاد صاحب نے ایسے طریقے اور ڈھنگ نامی شاعروں سے برتے کہ جو اچھے شاعر تھے انھوں نے اس مشاعرے میں مثنوی کہنا اور شریک ہونا موقوف کر دیا ۔ اور آزاد صاحب نے دو ایک شاعر جیسے خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہ سے ایک رنجیدگی ظاہر کی اور بلکہ صاحب سلامت بھی ترک کر دی ۔ آزاد صاحب کے اوصاف حمیدہ ایسے ہیں کہ جو شخص ان سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے ، وہ ان سے ویسا ہی

پیش آتا ہے ۔ ان کا یہ حال ہے کہ ظاہر میں تو ہر ایک سے بہت تپاک سے پیش آتے ہیں اور باطن میں حافظ خدا ۔ ہر ایک کی دوسرے سے کچھ نہ کچھ برائی کرنا ، جس سے اپنے تئیں کچھ فائدہ نظر نہیں آتا ، یہ ان کا ایک ضروری فرض ہے ۔ اب لاہور کے لوگ ان کو خوب پہچان گئے ۔ ظاہر میں تو اکثر لوگ راضی کر دیتے ہیں اور باطن میں ان کو سب حقارت سے دیکھتے ہیں ۔ اب کے تاریخ ۱۳ مارچ کو جو مشاعرہ انجمن میں ہوا تو کل شاعروں میں کوئی نامی شاعر نہ تھا ۔ اس سبب سے اب کے آزاد صاحب نے خوب چہک کر اور دل کھول کر اپنی مثنوی پڑھی ۔ گو اب کے جلسے میں آزاد صاحب سے بڑھ کر نامی شاعر اور کوئی نہ تھا لیکن اب کا جلسہ ایسا بے رونق تھا کہ سابق میں ایسا نہیں ہوا تھا ۔ نہ تو عمدہ کوئی شاعر تھا اور نہ عالی درجے کے شایقین تھے ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید دہلی نے دربار کے باعث جو اکثر لوگ دہلی کو چلے گئے ہیں ، یہ جلسہ بےرونق تھا ۔ رفیق نے اب کی دفعہ جو تہذیب کے مضمون کی مثنوی سنائی تو اس میں اخبار والوں کو بھی کچھ سنایا ، اور اس کے پڑھنے کے اوپر سیکرٹری صاحب نے استادہ ہو کر رفیق سے کہا کہ اخباروں کی بابت یا کسی خاص کی بابت کچھ پڑھنا نہ چاہیے ۔ جس پر رفیق کو ذرا طیش آیا اور سب کو منصف ٹھہرا کر برابر اس کو پڑھا کیا ۔ اور اس کے مضمون سے پایا جاتا تھا کہ وہ 'پنجابی اخبار' کو آوازہ صاف کس رہا تھا ۔ حقیقت میں انجمن کے جلسے میں

ایسا مضمون پڑھنا نا مناسب ہے ۔ آئندہ امید ہے کہ اگر آزاد صاحب کا قدم اس جلسے میں رہا تو کوئی نامی شاعر اس میں شریک نہ ہوگا ۔ سنا گیا ہے کہ ہما اور عطا اور رفیق کو ڈائرکٹر صاحب نے اپنی کوٹھی پر محمد حسین آزاد کی معرفت انعام دیا جو کہ ہر ایک کو ۱۵ روپیہ کے اندر ملا ۔ اب یہاں بھی یہ پایا جاتا ہے کہ جس کی سفارش آزاد صاحب نے کی اُس کو انعام ملا ۔ اور آزاد صاحب نے انعام تھوڑا خیال کر کے خود شاید لینا منظور نہ کیا ۔ اس جلسے کے واسطے بڑا افسوس یہ ہے کہ اب عمدہ شاعر اس میں شاید آئندہ شریک نہ ہوں گے اور جو کچھ گورنمنٹ کا منشا اس مشاعرے کے مقرر کرنے کا تھا وہ پورا نہ ہوگا ۔ اب اس مشاعرے میں آج کل لونڈے شاعر اکثر آتے ہیں ، کوئی کنجڑا ہے اور کوئی حلوائی وغیرہ ہے جن میں آزاد صاحب عمدہ شاعر تصور ہو سکتے ہیں ۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم بہلے لکھتے انجمن کے مشاعرے میں شاعر منتخب کیے جاویں تو بہتر ہے ، لیکن اب تو انتخاب کرنے کی کچھ ضرورت بھی نہیں رہی ، کیوں کہ اچھے شاعروں نے اس کی طرف توجہ اور شریک ہونا ہی چھوڑ دیا ہے ۔ بہتر ہے کہ ڈائرکٹر صاحب اس کے لیے کوئی عمدہ انتظام کریں اور عمدہ شاعروں کو اس مشاعرے میں شریک کریں ۔''

راقم ایس ۔ زیڈ ۔ اے ، از لاہور ۔ (’خیر خواہِ عالم‘
۱۵ اپریل ۱۸۷۵ع)

بزم مشاعرہ کی بابت جتنی بھی اطلاعات مجھے مل سکی ہیں انھیں اوپر قلم بند کر دیا گیا ہے - ان پر اضافہ کرنا آج کل قریب قریب ناممکن ہے - لیکن اگر مزید مواد دستیاب ہو بھی جائے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا ! صرف یہی کہ آزاد کی فلاں نظم پر کیوں کر تنقید کی گئی اور اس کے کون سے نقائص بیان کیے گئے ، مشاعرے کا آغاز کیوں کر ہوا ، اس میں کون سے مشہور شعرا نے حصہ لیا ، اس کے اجرا اور بقا میں گورنمنٹ کا ہاتھ کہاں تک تھا ، معاصرین نے اس کا کہاں تک ساتھ دیا ، اس کے اغراض و مقاصد پر معاندانہ یا ہمدردانہ تنقید ، آزاد سے بیزاری اور ان کی مخالفت — ان سب پر خاطر خواہ روشنی پڑ چکی ہے - تصویر کا کوئی بھی ایسا رخ نہیں جس کے لیے مزید روشنی درکار ہو -

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بزم مشاعرہ کی ناکامی کے کون سے اسباب تھے ؟

میری رائے میں بزم مشاعرہ کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ بہت حد تک پیش از وقت تھی - یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر دور کا ادب ان عصری احتیاجات کا جنھیں 'روح عصر' کہا جاتا ہے ، آئینہ ہوتا ہے - لیکن جس وقت بزم مشاعرہ کی بنیاد رکھی گئی اس وقت تک اس روحِ عصر کی تشکیل نہیں ہوئی تھی - اس میں شک نہیں کہ ان قدروں کی ، جن سے نئے عہد کی تعمیر ہونی تھی ، ایک دھندلا سا عکس افق پر نمودار ہو چکا تھا ، لیکن ابھی اس کے خد و خال نمایاں نہیں ہوئے تھے - بزم مشاعرہ انھی ادھورے نقوش کی عکاسی ہے - اور اگر آپ اس روح عصر کا پتا لگانا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو علی گڑھ تحریک کے

اغراض و مقاصد میں نظر آئے گی جس کی مظہر 'مسدس حالی' ہے ۔ للہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بزم مشاعرہ عام طور پر اس لیے ناکام رہی کہ اس کے عقب میں کوئی مضبوط حرکی جذبہ کارفرما نہ تھا ۔ بزم مشاعرہ میں ہمیں نئی قدروں کی جستجو کا ضرور پتا ملتا ہے لیکن وہ ابھی تک عالم وجود میں نہیں آئی تھیں ۔

ناکامی کی دوسری وجہ خود آزاد کی شخصیت ہے ۔ آزاد کی زندگی سے پتا چلتا ہے کہ ان میں احباب نوازی کی صلاحیت بہت کم تھی اور ان کی طبیعت میں شک کو بہت دخل تھا ، اس لیے لوگ ان سے بدظن ہو جاتے تھے ۔ بزم مشاعرہ میں بھی ایسا ہی ہوا ۔

ایک اور بات بھی قابل غور ہے ؛ آزاد بزم مشاعرہ میں سب سے آگے آگے تھے ۔ انھیں حکام اعلیٰ کا اعتماد حاصل تھا ، للہذا ان کے ہم عصر ان سے جلتے تھے اور انھیں نیچا دکھانے اور بدنام کرنے پر تلے ہوئے تھے ۔ خصوصاً جب آزاد نوجوان شعرا سے ، جو ان کے نقش قدم پر چلتے تھے ، مربیانہ سلوک کرتے تو اُن کی آتش رشک اور تیز ہو جاتی ۔ لیکن یاد رہے ان شعرا میں جنھوں نے بزم مشاعرہ سے قطع تعلق کر لیا تھا حالی بھی تھے ، اور جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ مولانا حالی جیسا فرشتہ خصلت شخص بھی بزم مشاعرہ سے مطمئن نہ تھا ، تو آزاد کے مخالفین کے شکوہ و شکایت اور وزن دار ہو جاتے ہیں ۔

آزاد عالم دیوانگی میں

اس مضمون کے ماخذ دو ہیں : اول وہ اطلاعات جو مجھے براہ راست آزاد کی تصانیف یا دوسرے طبع شدہ مواد سے حاصل ہوئیں ، اور دوسرا وہ پُر از معلومات عنایت نامہ جو مولوی خلیل الرحمان نے میرے سوال نامہ کے جواب میں ۱۷ دسمبر ۱۹۲۷ع کو مرحمت فرمایا ۔ چوں کہ یہ خط سراسر ذاتی معلومات اور عینی مشاہدات پر مبنی ہے اور اس کے مضامین کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے سے تغیر و تبدل کا احتمال تھا ، اس لیے میں نے متعلقہ اقتباسات کو جوں کا توں نقل کر دیا ہے ۔

مذکورہ بالا خط میں مولوی خلیل الرحمان نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :

''میں چیف کورٹ (متوفلی) میں نوکر ہوا اور یکم فروری ۱۸۸۹ع کو لاہور پہنچا اور اگست ۱۹۲۷ع میں ریٹائر ہوا ۔ مگر چیف کورٹ سے نہیں بلکہ ایجنٹ ریلوے کے دفتر سے . . . چیف کورٹ میں آغا ابراہیم مرحوم کے ماتحت کیا گیا ۔ یہ کہنا چاہیے کہ یکم فروری ۱۸۸۹ع ہی سے میرا تعلق مولوی آزاد صاحب مرحوم سے پیدا ہوا ۔ مجھے بچہ سا دیکھ کر آغا صاحب کی والدۂ محترمہ نے مجھ سے مادرانہ

سلوک کیا ۔ مولوی صاحب ذرا دیر آشنا تھے ۔ ان کی شفقتیں ہونے میں دیر لگی مگر شروع ہوئیں تو دیوانہ ہونے تک قائم رہیں ۔''

مولانا آزاد دماغی عارضے میں دو دفعہ مبتلا ہوئے ۔ پہلی مرتبہ سیر ایران سے چند سال پہلے جب ان کی صاحب‌زادی[۱] امۃالسکینہ عین عالم جوانی میں انہیں داغ مفارقت دے گئیں ۔ لیکن یہ دیوانگی دیر پا ثابت نہ ہوئی ۔ دوسری دیوانگی جس پر اس مضمون میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ، سفر آخرت تک ان کی رفیق رہی ۔

مولانا آزاد کی دیوانگی کا کھوج لگانا کچھ دشوار نہیں ۔ مولانا کی صحت باوجود ان مصائب اور حرماں نصیبیوں[۲] کے جن سے انہیں دوچار ہونا پڑا ، بہت اچھی تھی ۔ وہ قوی ہیکل اور توانا تھے ، لیکن تقریباً پچیس سال کی پیہم محنت شاقہ سے ان کے دماغی قویٰ مضمحل ہو گئے تھے ۔ سفر ایران کے

---

۱ - آزاد کی صاحب زادی میرے لاہور پہنچنے سے پہلے انتقال کرچکی تھیں - ان کا اکثر آزاد ، آغا اور آن کی والدہ مرحومہ سے تذکرہ آیا ۔ ماں باپ دونوں آبدیدہ ہوتے تھے ۔ واقعی بڑی قابل بی بی تھیں ۔ خود آزاد نے مجھ سے کہا کہ ان ہی کے مسودوں کو، بعد از اصلاح، میں کام میں لایا ہوں ۔ ریویو کے لیے آزاد کے پاس بہت سی کتابیں آتی تھیں ۔ وہ سب ان صاحب زادی کو دے دی جاتی تھیں ، اور ان ہی کے ریویو آزاد کے نام سے چھپتے تھے ۔ ان کی شادی پٹیالے کے خلیفوں کے خاندان میں ہوئی تھی ۔ (خلیل‌الرحمان)

۲ ۔ تمام زندگی میں ان کے ہاں سولہ بچے پیدا ہوئے ۔ ان میں سے صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی باقی رہے ۔ باقی سب چند سال کے ہو ہو کے رخصت ہو گئے ۔ (آغا محمد باقر)

بعد ان کی ادبی سرگرمیوں نے ایک مستقل اعصابی تناؤ کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ ان کے دل و دماغ پر ہر وقت یہ سوال مسلط رہتا تھا کہ جیسے بھی بن پڑے مجھے اپنی ناتمام تصانیف کو پورا کرنا چاہیے ۔ ان میں جو چیز سب سے زیادہ سوہان روح بن رہی تھی ، 'دیوان ذوق' کی ترتیب و اشاعت تھی ۔

مولانا آزاد کے ادبی انہاک کا پتا ان کی خط و کتابت سے چلتا ہے ۔ یہاں میں صرف دو تین اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا ۔ 'آب حیات' کی اشاعت کے بعد وہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

''اکثر ذوق و شوق کا وقت تھا کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اڑ گیا ۔ بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا ۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی . . . پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا ، لکھنا اور مٹانا ، بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا ۔ پھرتے چلتے ، جاگتے سوتے ، بچوں کے ہی خیالات میں رہا ۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے . . . جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا ، بہت کم سوتا تھا . . . اسی میں سے یہ اوراقِ پریشان نکالے اور 'آب حیات' کا جام بنا کر تمھاری ضیافت طبع کے لیے حاضر کیا ۔ اب افسوس ہے ، اور

افسوس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ میں تھک گیا، اور ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی - دل و دماغ فرسودہ ہو گئے - اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا - آخر کہاں تک، محنت کی بھی حد ہوتی ہے - کئی کتابیں اور رسالے مگر مسودے دھرے ہیں، کئی نا تمام پڑے ہیں - بہت سے خیالات دل کے دل ہی میں گرہ ہیں - اتنی طاقت نہیں کہ نکل سکیں . . . "[1]

"پرسوں اتوار کو یہاں ایک بہت بڑا جلسہ تھا . . . وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں ہے، اسے بھی تو پوچھو — وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دے دیا ہے - وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے - کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ 'دربار اکبری' لکھ رہا ہے مگر اکیلا ہے، کوئی رفیق و مددگار نہیں - کئی شخصوں نے کہا کہ پھر وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے، جو ہم سے ہو سکتی ہے ہم بھی کریں - میں درماندۂ تائید و تدبیر کیا کہوں کہ میرا کام سوائے خدا و مولیٰ کے مدد پذیر نہیں - یا علی مدد ! چار بجے ہیں، صبح قریب ہے، وقت تو قبول کا ہے، اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے . . . "[2]

---

۱ - مجموعہ مکتوبات آزاد، لاہور، ۱۹۲۳ع، صفحہ ۹۵، ۹۶ -

۲ - ایضاً صفحہ ۲۰، ۲۱ -

"عجب ہجومِ نت میں مبتلا ہوں . . . سوا مہینے سے میں دنیا و ما فیہا سے بےخبر ہوں ؛ میری حالت ایسی ہوگئی ہے کہ ہر شخص پوچھتا ہے کہ تم کچھ بیمار تھے۔ میری اپنی کتابیں نا تمام پڑی ہیں . . . اور میری جان انھیں میں لگی ہے ۔ (میں اپنی) تصانیف کو پورا کروں گا ، اپنے لخت جگر بچوں کو نیم جان تڑپتا نہ چھوڑوں گا . . . 'آب حیات' نے مجھے ہلاک کر دیا ۔ مجھ سے بے وقوفی ہوئی ہے ۔ دس مہینے کا کام تھا جو ڈیڑھ مہینے میں کیا ہے . . . "[1]

جب مولانا آزاد اپنے سفر ایران سے واپس آئے تو ان کی صحت بگڑ چکی تھی ۔ لیکن اپنی نا تمام تصانیف کا خیال انھیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔ خصوصاً 'دیوان ذوق' کی اشاعت نے ایک نیم مجنونانہ کیفیت پیدا کر دی تھی ۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

میں نے 'سخن دان فارس' کو نظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے ۔ چاہا کہ اب 'دربار اکبری' کو سنبھالوں مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی ، کیوں کہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں ، قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں ۔ اگر میں اُن کے باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے ،

---

۱ ۔ مجموعۂ مکتوبات آزاد ، صفحہ ۲۱ ، ۲۲ ۔ یہ دوسرے ایڈیشن کا ذکر ہے ۔

بے موت مر جائے گا۔ اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام
اور کیا ہوگا ! ان کے حال پر افسوس نہیں ، یہ میری
غیرت اور حمیت پر افسوس ہے[۱]۔"

دیوان ذوق کی ترتیب پر جو محنت آزاد کو صرف کرنی
پڑی ، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوتا ہے :

"ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں ۔ صدہا شعر
ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے ، دیوان مروجہ
میں کچھ چھپے ، اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے
کبھی کچھ سنے۔ پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے
تک کی یادگار ہیں ۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت سی تحریریں
ہیں ۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں . . . کٹے
پھٹے اشعار کا پڑھنا ، مٹے حرفوں کا اجالنا ، اس زمانے
کے حالات کو سمیٹنا ، حالتوں کا تصور باندھنا ، بھولے
بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا ، میرا کام
نہ تھا ۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل
حال تھی ۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا ۔ راتیں صبح
ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے ، جب یہ مہم
سر انجام ہوئی ہے[۲]۔"

---

۱ ۔ مجموعۂ مکتوبات آزاد ، صفحہ ۳۶ ۔
۲ ۔ دیوان ذوق ، مرتبہ آزاد ، صفحہ ۱ ۔ مولوی خلیل الرحمان نے
آزاد کو "دیوان ذوق" کی تربیت میں مشغول دیکھا تھا ۔ ان کی
منظر کشی ملاحظہ ہو :
"سخت گرمی ، جون کا مہینہ ۔ 'دیوان ذوق' کی ترتیب میں دن
رات کی (بلا مبالغہ) مصروفیت ۔ کتب خانے گیا تو ہر طرف سے دروازے
بند ۔ دستک دے کر ایک دروازہ کھلوایا اور فوراً بند کر دیا گیا ۔
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶ پر)

اس اقتباس میں آزاد نے اپنی اُن دشواریوں کو جن سے انھیں ''دیوان ذوق'' کو ترتیب دیتے ہوئے دوچار ہونا پڑا ، نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں انھوں نے اپنی دشواریوں کا پورا انکشاف نہیں کیا ۔ اصل یہ ہے کہ ذوق کی بیسیوں غزلیں اور چند قصائد یا تو آزاد کے پاس سرے سے موجود ہی نہ تھے یا ایسی خستہ حالت میں تھے کہ پڑھے نہیں جاتے تھے ۔ لیکن ان سب کا انھیں علم تھا ۔ ایک زمانہ تھا جب ان میں سے اکثر ان کے حافظے میں موجود تھے ، لیکن اب پیرانہ سالی میں یا وہ انھیں بھول چکے تھے یا ان کے دھندلے سے نقوش ان کے حافظے پر مرتسم تھے ۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انھیں ان کی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا ۔ لیکن استاد کی محبت انھیں مجبور کرتی تھی کہ جیسے بھی ہو انھیں نیست و نابود ہونے سے بچایا جائے ۔ میرے پاس ان غزلوں اور قصائد کے مسودے ہیں جنھیں میں ایک بسیط مقالے کی صورت میں پیش کرنے والا ہوں ۔ ان مسودوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جنھیں بلا مبالغہ بیسیوں بار کاٹا گیا ہے اور تصحیح در تصحیح کی گئی ہیں ۔ جو لوگ شاعرانہ کاوشوں سے واقف ہیں وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کام کس قدر صبر آزما ہوتا ہے ۔ آزاد کے لیے ان بھولے بسرے نقوش کو ازسر نو ابھارنا اور انھیں شاعرانہ زبان کے سانچے میں ڈھالنا آسان کام نہ تھا ۔ لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور گرتے پڑتے اپنی منزل مقصود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵ سے آگے)

اندر اندھیرا گھپ ۔ منت سماجت کر کے دروازہ کھلوایا ۔ دیکھا کہ رقعہ متذکرہ بالا کے پانچ چھ (یا زیادہ ، ٹھیک یاد نہیں رہا کہ کتنے) مختلف الٹ پھیر کے ساتھ ، مسودے میز پر پڑے ہوئے ہیں ۔''

تک پہنچ ہی گئے - اس محنت کی انھیں خوف ناک قیمت ادا کرنی پڑی - آزاد کی دیوانگی کا راز ''دیوان ذوق'' کی ترتیب میں مضمر ہے -

یہ امر کہ اس وقت آزاد کے دماغ میں فتور آ چکا تھا ، دو اور باتوں سے بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے - اول ان کی درویش پرستی اور دوسرے ''دربار اکبری'' کی اشاعت کی مجنونانہ مخالفت -

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے ، یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اول اول آزاد کو درویشوں سے قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی - اپنی تصانیف میں وہ کھلم کھلا ان کی ہنسی اڑاتے ہیں - لیکن دماغی انحطاط کے اس دور میں جو سفر ایران کے بعد شروع ہوتا ہے ، انھیں ان سے نہایت عقیدت ہو گئی تھی - مولوی خلیل الرحمٰن لکھتے ہیں : ''سائیں دھیان شاہ کے (ایک مجذوب جو میاں سلطان کی سرائے میں رہتے تھے) آزاد بہت معتقد تھے - قریباً روزانہ ان کے پاس جاتے تھے اور آغا کو اور مجھے بھی تاکید کرتے رہتے تھے - دو تین مرتبہ بہ جبر مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے -'' اسی طرح آغا محمد باقر اپنے مضمون ''شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد'' میں لکھتے ہیں کہ ''نویں کوٹ کے قریب ایک مجذوب سید بدھن شاہ چشتی رہتے تھے، آزاد کو ان سے بہت عقیدت تھی -''

'دربار اکبری' والا معاملہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے - اس تصنیف کو آزاد نے سالہا سال کی محنت سے تیار کیا تھا اور تمام وقت وہ اس کی اشاعت کے حسین خواب دیکھا کیے لیکن جب یہ تصنیف پایۂ تکمیل کو پہنچی تو

آزاد خود اس کی اشاعت کی شدید مخالفت کرنے لگے۔ اور مخالفت کی بنا بھی عجیب تھی۔ کہتے تھے میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ اکبر جیسے اولوالعزم شہنشاہ کی زندگی ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جائے اور چند سکوں کے عوض بازاروں میں بکتی پھرے۔ اس معاملے میں وہ کسی کی نہیں سنتے تھے اور مسودے کو دیکھنا تو درکنار، کسی کو اپنے کتب خانے کے نزدیک بھی نہیں آنے دیتے تھے۔ اور جب آخرکار ان کی تمام تر نگاہ داشت کے باوجود مسودہ ان کے کتب خانے سے نکال لیا گیا، تو ان پر دیوانوں کی سی حالت طاری ہو گئی۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ بدیں خوف کہ کہیں اسے چھاپ نہ دیا جائے، آزاد نے مسودے کو دریائے راوی میں ڈال دیا تھا۔ یہ بات سراسر غلط ہے۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ آزاد نے اسے دریا برد کرنے کی دھمکی دی ہو یا خیال ظاہر کیا ہو۔ بہرحال یہ دونوں باتیں ایک واضح حقیقت کا پتا دیتی ہیں۔ اگر آزاد کی درویش پرستی سے ان کی دماغی کمزوری کا ثبوت ملتا ہے تو ''دربار اکبری'' والے معاملے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس وقت ان کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا۔

اب دیوانگی کی کہانی مولوی خلیل الرحمان کی زبانی سنیے:

''اس کا قصہ اور شروعات گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم نے یہ بیان کیا کہ ہم نے بی۔ اے میں عربی لی تھی۔ مولانا کے پاس عربی بھی تھی۔ ہم نے ان کو بہت تنگ کیا، اس لیے وہ دیوانے بن بیٹھے۔ مگر یہ بالکل لغو ہے۔۔۔ صورت میرے نزدیک یہ ہے کہ ان

میں دیوانگی کا مادہ پہلے ہی تھا ۔ غدر کے مصائب کی یاد ، طبیعت کی بدگمانی ، بہو[1] سے شکایت وغیرہ وغیرہ ، رفتہ رفتہ کام کرتے رہے ۔ اس پر قیامت یہ ہوئی کہ 'دیوان ذوق' کی ترتیب شروع کر دی ۔ اس میں دن رات کا انہماک و استغراق رہا ۔ راتوں اسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے ۔ استاد کی غزلیں پوری کرتے ۔ گرمیوں میں اس پر محنت زیادہ ہوئی ۔ نیند میں کمی آ گئی ۔ دیوان تو جوں توں کر کے چھپ گیا ، مگر مراق کی کیفیت پیدا ہو گئی ، اور یہ حالت ہوئی کہ ایک مرتبہ میں اور مولوی ممتاز علی مرحوم ملنے گئے۔ ان دنوں وہ امام باڑے میں رہتے تھے ۔ میں مولانا سے ڈرنے لگا تھا ، کیوں کہ سخت مست کہہ بیٹھتے تھے۔ اب ایک لطیفہ یہ ہوا کہ صحن میں دو چارپائیاں بچھی تھیں ۔ ایک پر آزاد بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب از راہ ادب پائینتی بیٹھ گئے ۔ میں بھی دوسری خالی چارپائی پر پائینتی بیٹھا ۔ مجھ سے مولانا نے کہا کہ ''میاں! کس کے لیے وہاں بیٹھے ہو، سرہانے ہو بیٹھو۔'' میں نے فوراً تعمیل کی ۔ مولوی صاحب سے بھی انھوں نے دو تین مرتبہ کہا کہ ''آگے کو ہو بیٹھو'' ۔ انھوں نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا ''کہ اچھا بیٹھا ہوں''۔ آخر مولانا کو غصہ آ گیا ۔ وہ کہنے لگے : ''بیوقوف ، گدھا ، احمق! میری ادھواین ٹوٹی جا رہی ہے ، یہ کہتا ہے کہ اچھا بیٹھا ہوں ۔'' مولوی صاحب جھٹ اوپر

---

۱ ۔ آغا ابراہیم کی اہلیہ ۔

ہو بیٹھے، مگر بہت شرمندہ ۔ یہ لطیفہ تو ہو چکا ۔ اسی وقت چوڑھی آئی ۔ وہ جھاڑو دینے لگی ۔ اس سے بڑی گرد آڑی ۔ اب کیا تھا ، آزاد چیخ اٹھے اور باواز بلند فرمانے لگے کہ ''ابرو کی ماں ! کتنی دفعہ تم سے کہا ہے کہ چوڑھی کے آنے سے پہلے یہاں چھڑکاؤ کرا دیا کرو۔'' انھوں نے کہا ''ابھی بہشتی نہیں آیا ، چوڑھی سے کہہ دو کہ جھاڑو نہ دے۔'' اس کا جواب مولانا نے دیا کہ ''بہشتی نہیں آیا تھا تو تم ہی نے ذرا کھڑے ہو کر مُوت دیا ہوتا کہ گرد تو بیٹھ جاتی ۔'' آغا صاحب کی والدہ ماجدہ پر جو اثر ہوا ہو اس کا اندازہ آپ کر لیجیے ۔ انھوں نے پان دینے کے لیے مجھے بلایا تو وہ آنسوؤں سے رو رہی تھیں ۔ مجھ سے صرف اتنا کہا کہ ''بوڑھے ہو کر ان کی عقل بالکل خراب ہوگئی ۔ جو کچھ منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں ۔ میرا سفید چونڈا رہا کہ گیا ۔'' غرض جب ہم وہاں سے آٹھے تو گھر پہنچنے تک ہم دونوں کے درمیان یہی تذکرہ رہا ۔ میرے منہ سے یہ نکلا کہ کہیں پھر تو یہ پاگل نہ ہو جائیں گے ۔ مولوی ممتاز علی صاحب نے فرمایا کہ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو ۔

غرض بے خوابی اور بد خوابی اور مراق بڑھتا گیا ۔ ایک اور قیامت یہ ہوئی کہ انھی دنوں پلین شیٹ (Planchete) نکلی تھی ۔ آغا کہیں سے خرید لائے اور باپ سے اس کا ذکر کیا ۔ باپ نے دیکھنے کو

مانگی اور اس کا تجربہ کیا ۔ ہوتے ہوتے کہیں میر تقی کی روح کو بلاتے ہیں ، کہیں سودا کی ۔ اور ہر ایک کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں ۔ اب گھر والوں کو بھی شبہ ہوا اور چند ہی روز میں یقین ہو گیا ۔ دوا کھانے کو جو کہتے ہیں تو کسی طرح نہیں مانتے ، گالیاں دیتے ہیں ۔ چپکے چپکے حکیم بزرگ شاہ سے رجوع کیا گیا ۔ انھوں نے خاص طور پر توجہ کی ، مگر دوا کون کھاتا پیتا ۔ علاج یہ تجویز ہوا کہ نیند آنی چاہیے ۔ میں نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹری دوائیں مقدار میں بہت کم ہوتی ہیں ، ڈاکٹری علاج کیجیے ۔ ڈاکٹر رحیم خاں مرحوم نے بھی نیند ہی علاج تجویز کیا ۔ انھوں نے دوا بتلائی اور کہا کہ کسی کھانے میں ملا دیا کرو ۔ مولانا کو دہی مرغوب تھی ، اسی میں ملا دی گئی ۔ پھر کچھ شبہ ہوگیا تو وہ بھی چھوڑ دی ۔ مگر نیند نہ آنی تھی نہ آئی ۔ رات رات بھر ٹہلتے تھے ۔ شعریں پڑھتے تھے ۔ بڑے استادوں کو پکار کر عرض معروض کرتے تھے ۔ ان کی آواز سنتے تھے، جواب دیتے تھے ۔ اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا ۔ آغا نے درخواست دے کر برس روز کی رخصت دلوائی ۔ اتفاق سے حافظ کریم بخش اپنے مقدمے میں آئے ہوئے تھے ۔ انھوں نے تجویز کیا کہ دہلی لے چلو ، حکیم محمود خاں کا علاج کراؤ ۔ انتظار یہ ہوا کہ نیند آئے تو دہلی لے چلیں ۔ ایک دن ایسے سوئے کہ دہلی پہنچ کر خبر

ہوئی ۔ محمود خاں اور عبدالمجید خاں نے بھی اپنی بہت سی کی ۔ آزاد تھے کہ حافظ کریم بخش کے بدترین دشمن کہ میرے بال بچوں سے چھڑا کر مجھے یہاں لے آیا ۔ ایک دن منشی ذکاءاللہ کو بہت گالیاں دیں ، اور ان کو ہی ملازم ٹھہرایا ۔ غرض وہاں سے بھی مایوسی ہوئی ۔ پھر واپس لاہور لے آئے ۔ اکبری منڈی والا مکان بن چکا تھا ۔ اسی میں نیچے کی منزل میں رہے اور وہیں ختم ہو گئے ۔ اناللہ !

دیوانگی عجیب تھی ۔ پانچ دس منٹ ، بعض اوقات آدھا پونا گھنٹہ ، بہت اچھی طرح باتیں کر رہے ہیں ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پر کوئی اثر نہیں ۔ حافظہ اور دل اچھا ہے ۔ یکایک دیوانگی شروع ہو گئی ۔ لوگ دھوکے میں رہ جاتے تھے اور حیران ہوتے تھے ۔ یہی زمانہ تھا کہ ''دربار اکبری'' کا مسودہ نکالا گیا ۔ ایک روز ایک خاص کام کے لیے میں مولانا کے پاس گیا ۔ آغا ڈیوڑھی میں رہے ۔ مجھے دیکھتے ہی چور چور کا شور مچایا اور مسودے کی چوری لگائی ۔ میں واپس ہوا تو میرے پیچھے مولانا ! ، آغا کہیں چھپ رہے ۔ مولانا پولیس کی تلاش میں رہے ۔ میں بھاگ گیا ۔ تیسرے چوتھے روز اسی حیثیت سے پھر گیا ۔ آغا پیچھے رہے ۔ مجھے دیکھ کر بہت اخلاق سے پیش آئے ۔ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور اچھی طرح ہوش میں ۔ کچھ بگڑنے لگے تھے کہ اتفاقاً ایک بڑھیا آئی ۔ مولانا نے پوچھا ۔ 'مائی ! کی کہندی ایں' (مائی !

کیا کہتی ہو ؟) اُس نے کہا 'تھوڑی جئی مستی چاہیدی اے ، سر دھون لئی ۔ او صبون والا کدر گیا ؟ (تھوڑی سی مستی چاہیے سر دھونے کے لیے ۔ وہ صابن والا کدھر گیا ؟) [ڈیوڑھی میں ایک شخص صابن بنایا کرتا تھا ــ اور ''مستی'' اُس چیز کو کہتے ہیں جو صابن کے اوپر آ جاتی ہے ۔] مولانا از رہ شفقت اٹھ کر بڑھیا کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ ''مائی اب تو ہم بوڑھے ہو گئے ، اب مستی کہاں ؟'' وہ غریب شرمندہ ہو کر چلی گئی اور میں بھی موقع پا کر بھاگ گیا ۔ ایک اور واقعہ سن لیجیے . . .

مولوی صاحب کی صبح کی ہوا خوری ایسی حالت میں بھی بند نہیں ہوئی ۔ ایک روز میں دفتر کو جا رہا تھا کہ ہائی کورٹ کے سامنے جو نلکا سڑک پر ہے ، وہاں دور مولانا آتے نظر آئے ۔ میں سخت پریشان ہوا کہ برسوں سے نہیں ملا ہوں ، دیکھیے کیسے بنتی ہے ۔ مولانا نے مجھے دیکھ لیا اور کھڑے ہو گئے ۔ مجھ سے کہنے لگے کہ ''تم بہت عرصے سے نہیں ملے، کہیں باہر گئے تھے کہ یہیں ہو''۔ میں نے عذر کیا . . . کچھ اور باتیں بالکل ہوش کی کرتے رہے ۔

میرے ایک ایک لڑکے کی نام بنام خیریت پوچھی ۔ پڑھنے لکھنے کو پوچھا ۔ میں نے کہا کہ فلاں فلاں نے ایم ۔ اے کیا ہے ، ایک بی ۔ اے میں ہے وغیرہ ۔ سن کر بہت خوش ہوئے ۔ بہت مبارک باد دی ۔ عربی پڑھوانے پر زور دیا ۔ آدھا گھنٹہ گرفتار رکھا ۔ مجھے

دفتر کی جلدی ۔ شامت جو آئی تو پوچھ بیٹھا کہ ''آپ کی بھی بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی ۔'' بس پھر کیا تھا ، کہنے لگے کہ ''تو ایسا بے ایمان پاجی ہے ۔ تو نے میری کب خبر لی ، میرے اوپر کیا کیا بن گیا ، تو نے کروٹ نہیں لی ۔ پاجی ، پوچھتا ہے بہت دن سے زیارت نہیں ہوئی ۔ ارے تجھے خبر بھی ہے میرے ساتھ کیا دغا ہوئی ؟'' میں نے پوچھا کہ ''خیریت ؟'' کہنے لگے کہ ''میرے ساتھ ذکاءاللہ نے پھر دغا کی ۔ اس کی ماں کی ، اس کی بہن کی . . . میں ایک روز ہوا خوری میں دہلی پہنچ گیا ۔ ذکاءاللہ نے بڑی خاطر سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا ، اور اپنے مکان میں ٹھہرایا ۔ مجھے کیا معلوم کہ اس کے دل میں کیا دغا ہے ۔ اس کے مکان کے نزدیک ایک برات آ کر ٹھہری ۔ مجھ سے کہنے لگا کہ آزاد تو بھی برات دیکھ آ ۔ میں گیا ۔ برات والوں نے جو مجھے دیکھا تو شور مچایا کہ آزاد آیا ! آزاد آیا ! مجھے بڑی خاطر سے دولھا کے پاس بٹھا دیا ۔ مجھے کیا خبر کہ ذکاءاللہ نے ، اس کی . . . کیا فریب کیا ہے ۔ اب جو نکاح بندھنے لگا ، تو نکاح اور مہر کے ساتھ مجھے بھی باندھ دیا ، اور ایسا جکڑا کہ رسوں کے بندھنوں سے اب تک میرے بدن میں درد ہو رہا ہے ۔ جس طرح ہو سکا میں رسوں کو توڑ کر ابھی چلا آ رہا ہوں ۔'' نہ پوچھیے کہ مجھے کتنی ہنسی آئی ۔ یقین جانیے کہ ریل کے دفتر تک میں ہنستا ہی چلا گیا ۔ بار بار خیال ہوتا تھا کہ دیکھنے والے کیا

کہتے ہوں گے ۔''

مولانا آزاد کے آخری ایام کی حسرت ناک روئیداد سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی ایک نوشت میں ملتی ہے ۔ یہ ملاقات ۱۳ مارچ ۱۹۱۰ع کو ہوئی تھی :

''استاد مرحوم امام باڑہ کے برآمدے میں بیٹھے تھے اور جس ہیئت سے بیٹھے تھے اسے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا ۔ ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی ، جس کی چولی میں پورے بٹن بھی نہ تھے ۔ ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پاجامہ تھا ۔ سر پر مغلئی وضع کی چکٹ ٹوپی اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی ۔ ایک بوریے پر بیٹھے تھے ۔ ایک مٹی کی رکابی میں شوربہ تھا ، اور ایک چنگیر میں چپاتیاں تھیں ۔ چپاتی کا نوالہ بنا کر شوربے میں ڈبوتے تھے اور منہ میں رکھ لیتے تھے ، اور دیر تک چبا کر مشکل سے نگل جاتے تھے ۔ بوریے کے ادھر ادھر کچھ راکھ ، کچھ کوئلے ، کچھ کوڑا پڑا تھا ۔ میں نے کہا ''سبحان اللہ ، یہ وہی منظر ہے جو حضرت نے 'آب حیات' میں انشاءاللہ کے آخری دور میں لکھا تھا ۔'' مجھے دیکھ کر فرمایا ''تم کون ہو؟'' میں نے کہا ''حضرت میرا نام ناصرنذیر فراق ہے ۔ دہلی سے محض آپ کی زیارت کے واسطے لاہور آیا ہوں ۔'' فرمایا ''بھئی میں تمھیں نہیں پہچانتا ۔'' میں نے پھر عرض کیا ''میں آپ کا شاگرد ہوں ۔'' کہا ''ہو گے''۔ پھر فرمایا ''اچھا تم میرے شاگرد ہو تو گرما گرم جلیبیاں تو لے

آؤ۔‘‘ میں نے اسے بڑی سعادت سمجھا ۔ دوڑا دوڑا گیا ۔ گرم جلیبیاں تو نہ ملیں ، ٹھنڈی لایا اور لا کر سامنے رکھ دیں ۔ ایک جلیبی ہاتھ میں اٹھائی اور فرمایا ۔ ’’بھلا میرے ہلتے ہوئے دانتوں سے ٹھنڈی جلیبیاں کب کھائی جائیں گی ۔ اچھا ، اٹھا لو۔‘‘ میں نے اصرار کیا تو بگڑنے لگے۔ آغایوسف مرحوم نے کہا ’’زیادہ نہ کہیے، نہیں بھلا برا کہنے لگیں گے ۔‘‘ پھر کہا ’’اچھا جاؤ یہاں سے ۔‘‘ میں اور آغا یوسف مرحوم امام باڑہ کے صدر دروازے میں آ کر ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ آغا محمد یوسف مرحوم خاصدان میں پان میرے لیے لائے ۔ میں نے کہا ’’آغا صاحب مجھےمولانا کواس زدہ حالت میں دیکھ کر سخت افسوس ہو رہا ہے ۔‘‘ آغا محمد یوسف نے فرمایا ’’حضرت گور کا عذاب مردہ ہی خوب جانتا ہے ۔ اگر دسترخوان میں روٹی لائی جاتی ہے تو دسترخوان جلا دیتے ہیں ۔ چینی کی رکابیوں میں دال سالن دیا جاتا ہے ، انھیں توڑ کر پھینک دیتے ہیں ۔ تانبہ کی رکابیاں ، غوریاں دیجیے تو بازار جا کر بیچ آتے ہیں ، یا کسی راہ چلتے کو دے دیتے ہیں ۔ سینکڑوں برتن غارت ہو چکے ہیں ۔ اچھے اور ستھرے کپڑوں سے بیر ہے ۔ ادھر پہنائے اور آدھر پھاڑے ۔ چیتھڑے لگائے ، پھینک دیے ۔‘‘ اس عذر کو سن کر میں نے آغا صاحب سے معافی مانگی ۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ خلال کرتے ہوئے امام باڑہ میں سے چلے آتے ہیں ۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا ’’بھئی تم کب دہلی سے آئے ؟

واللہ ، میں نے تمھیں اس وقت نہیں پہچانا تھا ۔'' یہ کہہ کر تخت کے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئے اور مسکرانے لگے ۔ میں نے کہا ''آپ نے مجھے پہچان لیا؟'' فرمایا ، ''ہاں میاں تمھارا نام ناصرنذیر ہے ۔'' اس بات کو سن کر میں بہت خوش ہوا اور آغا یوسف حیران ہو گئے ۔ میں نے حضرت کے مزاج کو راہ پر دیکھ کر کہا ''میں نے ایک تازہ سلام کہا ہے ، وہ سنانا چاہتا ہوں ۔'' فرمایا ''پڑھو'' جوشعر پسند آتا تھا اس پر خوش ہو کر فرماتے تھے ''یہ خوب کہا ہے'' اور جو پسند نہ آتا تو فرماتے ''یہ کچھ نہیں ۔'' جب میں نے سلام کا مقطع بھی پڑھ دیا تو فرمایا ''تمھارا سلام تو سب ہی اچھا ہے ، مگر کہیں کہیں جو میں نے یہ کہہ دیا کہ یہ کچھ نہیں تو یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا ہے ۔'' میں نے کہا ''درست ہے ۔'' دیر تک باتیں کرتے رہے مگر کبھی کبھی بے ڈھنگے پن کی بھی لے جاتے تھے ۔ پھر ایک دفعہ ہی اٹھ کر بازار کی طرف چلے گئے . . . اس کے بعد پھر زندگی میں مولانا کو دیکھنا نصیب نہ ہوا . . .''

آخر میں بطور تتمہ دو لطیفے درج کیے جاتے ہیں جو سید امتیاز علی تاج صاحب نے عنایت فرمائے ہیں ۔ ان سے آزاد کی شکی طبیعت اور حالی سے بدظنی کی تائید ہوئی ہے :

۱۔ یاد نہیں کس سنہ کی بات ہے ، مگر میرا بچپن کا زمانہ تھا ۔ میں اپنے ریلوے روڈ کے مکان کے پھاٹک میں کھڑا تھا کہ چوک کی جانب سے مولانا آزاد آتے

دکھائی دیے ۔ ان کے جنون کا آغاز ہو چکا تھا مگر دیکھنے میں کوئی غیر معمولی بات ان میں نظر نہ آتی تھی ۔ لمبا کرتہ ، کالا چغہ ، کھلے پانچے کا پاجامہ ۔ گھر کے باہر ایک لیٹر بکس نصب تھا ۔ آ کر چپ چاپ اس کے قریب کھڑے ہو گئے ۔ میری طرف نظر اٹھائی تو میں نے سلام عرض کیا ۔ یاد نہیں کہ مولانا نے جواب دیا یا نہ دیا ۔ بہرحال میرے قریب آئے اور بولے ''ایک پان اندر سے لا دو''۔

میں نے کہا ''ابھی لاتا ہوں'' اور اندر بھاگا ۔ نہ جانے کس سے پان لگوایا اور کاھیا کے ڈھکنے میں رکھ کر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ آپ نے خوش ہو کر گلوری اٹھا لی ۔ مگر کھاتے کھاتے رک گئے ۔ گلوری کھول کر غور سے دیکھنے لگے کہ اس کے اندر کیا کیا ہے ۔ نہ جانے اس میں کیا نظر آیا ، ممکن ہے الالچی کے دانے ہوں ۔ برھمی سے بولے ''اس میں زہر ڈلوا کر لایا ہے ؟'' یہ کہہ کر غصے سے پان پھینک دیا اور سر جھکائے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل کھڑے ہوئے ۔

والد ماجد شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی صاحب مرحوم ومغفور بیان فرماتے تھے کہ جس زمانے میں مولانا آزاد دماغی عارضے میں مبتلا تھے تو ایک بار مسٹر ہالرائیڈ، ڈائرکٹر تعلیم پنجاب نے اُن سے دریافت کیا کہ مولانا کی آج کل کیا کیفیت ہے اور اُن کا اگر کوئی شغل ہے تو وہ کیا ہے؟ والد ماجد نے بتایا کہ مولانا کے صاحبزادے آغا محمد ابراہیم صاحب سے ایک بار صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ اگر طبیعت

میں سکون ہو اور جی چاہے تو کبھی کبھار کچھ لکھ لیتے ہیں لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ لکھتے کیا ہیں۔ ڈسک پر لکھنے کا کام کرتے ہیں اور جب اٹھتے ہیں تو ڈسک کو بڑی باقاعدگی اور احتیاط سے مقفل کر دیتے ہیں۔ مسٹر ہالرائیڈ نے تاکید کی کہ آغا صاحب کو اس بات کا خیال رکھنے کے لیے کہیے کہ مولانا اپنی یہ تحریریں جوش جنوں میں کسی روز تلف نہ کر ڈالیں۔ آزاد جیسے دانش ور کی زمانۂ جنون کی تحریروں کا بھی ایک ایک لفظ محفوظ رہنا چاہیے۔ ممکن ہے اُن کے مطالعے سے کوئی قابل قدر نتائج اخذ کرنے میں امداد مل سکے۔

والد ماجد نے یہ بات جب آغا محمد ابراہیم صاحب سے کہی تو اُنھوں نے بتایا کہ یہ اس لیے ممکن نہیں کہ مولانا کا ڈسک ہمیشہ مقفل رہتا ہے اور اُس کی کنجی اُن کے ازار بند سے بندھی رہتی ہے۔ چنانچہ ایسا موقع ملنے کی بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ڈسک کھول کر تحریریں نکالی اور محفوظ کر لی جائیں۔ مگر اس کے چند روز بعد آغا صاحب نے خود ہی والد ماجد کو بتایا کہ گھر میں ذکر کیا تو تحریریں ڈسک میں سے نکالنے کی ایک صورت سمجھ میں آئی ہے۔ مولانا غسل کے بعد جس روز لباس تبدیل کرتے ہیں تو غسل خانے میں جا کر اپنا میلا پاجامہ باہر پھینک دیتے ہیں کہ اُس کا ازار بند نکال کر دھلے ہوئے پاجامے میں ڈال دیا جائے۔ ایسے وقت کنجی سے ڈسک کھول کر تحریریں بہ آسانی نکالی جا سکتی ہیں۔

یوں ہی ہوا ۔ غسل کے بعد تبدیلی لباس کے اگلے موقع پر ازار بند ہاتھ آتے ہی اُس سے ڈسک کھول لیا گیا اور مولانا کا مسودہ اُس میں سے نکال کر ڈسک پھر بند کر دیا گیا اور ازار بند دھلے ہوئے پاجامے میں ڈال دیا گیا ۔ آغا محمد ابراہیم صاحب نے مسودہ لا کر ابا جان کے حوالے کر دیا ۔

چند روز بعد مولانا نے لکھنے کی نیت سے ڈسک کھولا اور اپنی تحریریں غائب پائیں تو ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ کس نے چوری کی ۔ چوری کب ہوئی ، کیوں کر ہوئی ؟ گھر سے کچھ سراغ نہ مل سکا تو گھبرائے گھبرائے سیدھے ابا جان کے پاس پہنچے ، فرمایا کہ وہ . . . . حالی میرا مسودا چرا لے گیا ہے ، جس طرح بھی بنے اُسے حاصل کرنے کی کوئی صورت فی الفور بتاؤ ۔ مولانا اتنے مضطرب تھے کہ ابا جان کو اندیشہ ہوا کہ اُنھیں خطرناک قسم کا کوئی دورہ نہ پڑ جائے ۔ چنانچہ انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی اور وعدہ کیا کہ جلد سے جلد مسودہ حاصل کر کے آپ کی خدمت میں پہنچا دیا جائے گا ۔

والد ماجد نے اُسی وقت مسودا ایک منشی کو دیا اور کہا کہ اس کی ایک نقل بہت جلد تیار کر دو ۔ نقل تیار ہوگئی تو اصل مسودہ تو اپنے پاس رکھا اور نقل لے کر مولانا کی خدمت میں پہنچے ۔ مولانا کو مسودے کی نقل ملی تو نہال ہوگئے ۔ ابا جان کو دعائیں دیں اور پھر زیادہ بات کیے بغیر مسودہ ڈسک پر رکھ ، ابا جان کے سامنے ہی اُس پر نظر ثانی شروع کر دی ۔ اصل

مسودے میں جو اعراب تھے ، وہ نقل میں نہ تھے ۔ مولانا نے اصل مسودے کے سب اعراب نقل میں لگا لیے ۔ ایک جگہ 'ہم' کا لفظ تھا ۔ اس کے اوپر تشدید اور زبر لگایا تو ابا جان نے کہا کہ یہ لفظ اگر 'ہم' ہے تو اس پر تشدید اور زبر آپ نے کیوں لگایا ؟ مولانا نے فرمایا کہ یہ لفظ 'ہم' نہیں بلکہ ''ہما'' ہے ۔ ابا جان نے پوچھا اس کے معنی کیا ہیں ؟ جواب دیا ، یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکتا ۔ غرض ذرا سی دیر میں ایک ایک لفظ پر وہی اعراب لگا دیے جو اصل میں تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے کا سارا مسودہ اصل کے مطابق بنا لیا ۔ یہی مسودہ بعد میں 'سپاک و تماک' کے نام سے شائع ہوا ۔

مولانا کی علالت کم و بیش بیس سال تک جاری رہی ۔ اس دوران میں جب تک ان میں سکت رہی ، دو باتیں قائم رہیں ۔ اول ، وہ باقاعدہ ہواخوری کے لیے جاتے تھے ۔ دوسرے ، ان کی تحریر کی عادت اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ وہ تقریباً آخر تک قائم رہی ۔ میں نے مولانا کی ان تحریروں کو دیکھا ہے ۔ نہایت خوبصورت خط میں لکھی ہوئی ہیں ، لیکن محض الفاظ کا ڈھیر ہیں ، نہ ربط ہے نہ معنی ۔

محمد حسین آزاد کا سفر ترکستان

اس سفر کے کوائف اور محرکات کا آج کل تو کیا ، اُن دنوں بھی کسی کو علم نہ تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد بے حد محتاط تھے ۔ دوسرے انھیں تاکید کی گئی تھی کہ اس سفر کے اغراض و مقاصد کسی پر ظاہر نہ ہوں ۔ اس لیے انھوں نے آخر تک انھیں صیغۂ راز میں رکھا ۔

آزاد نے یہ سفر کیوں اختیار کیا ؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ جنگ آزادی کے دوران میں اور اس کے بعد اُن کی زندگی کا جائزہ لیا جائے ۔

کچھ عرصہ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ آزاد کے والد ، مولوی محمد باقر ، اُن ان گنت بے گناہ لوگوں میں سے تھے جنھیں برطانوی جبر و تشدد اور بہیمانہ جوش انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا ۔ حقیقت اس کے برعکس ہے ۔ یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ جنگ آزادی کے دوران میں مولوی محمد باقر اور آزاد نے انقلاب پسندوں کا ساتھ دیا تھا اور اسی کی پاداش میں مولوی صاحب کو سزائے موت ملی ۔ رہا آزاد کا معاملہ ، تو یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنی گرفتاری کے احکام جاری ہونے سے پہلے ہی روپوش ہو کر دہلی سے نکل پڑے تھے ۔

۱۸۵۷ء کے بعد آزاد در بدر ٹھوکریں کھاتے ، مصیبتیں جھیلتے ، کس مپرسی کے عالم میں لاہور وارد

ہونے اور نہایت صبر آزما حالات کے بعد انھیں محکمۂ تعلیم کے دفتر میں ایک ادنلی سی ملازمت مل گئی ۔ ان دنوں پنجاب میں ایک نئی ادبی اور علمی زندگی جنم لے رہی تھی اور آزاد باوجود اپنی زبوں حالی کے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ اس ضمن میں ان کی ملاقات ڈاکٹر لائیٹنر سے ہوئی اور یہ رابطہ اتنا بڑھا کہ وہ ان کے زمرۂ احباب میں شمار ہونے لگے ۔ اور بعد میں جب وہ 'انجمن پنجاب' کے سیکریٹری مقرر ہوئے تو یہ ڈاکٹر لائیٹنر کی ہی مساعی کا نتیجہ تھا ۔

ڈاکٹر لائیٹنر اپنے عہد کی ممتاز ہستیوں میں سے تھے ۔ وہ بیک وقت گورنمنٹ کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے ۔ وہ ہنگری کے یہودی النسل باشندے تھے ۔ معلوم نہیں پہلے پہل کب پنجاب آئے لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ پنجاب کے پہلے انگریزی اخبار 'انڈین پبلک یونین' کے ایڈیٹر اور مالکوں میں سے تھے ۔ اس کام میں سر لیپل گرفن ان کے شریک کار تھے ۔ یہ وہی اخبار ہے جسے بعد میں 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' کا نام دیا گیا ۔

ہندوستان آنے سے پہلے ڈاکٹر لائیٹنر لنڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کے مددگار استاد تھے اور جنگ کریمیا کے دوران اول درجے کے ترجمان تھے ۔ ان کا شمار اعلی درجے کے زبان دانوں اور ماہرین لسانیات میں ہوتا تھا ، اور انھیں عربی اور ترکی میں مہارت تامہ حاصل تھی ۔

ڈاکٹر لائیٹنر کی تمام ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں آزاد ان کے دست راست تھے ۔ آزاد کی غیرمعمولی صلاحیتوں

سے کسے انکار ہو سکتا ہے ، لیکن لائیٹنر کی سر پرستی سے
آن کا رسوخ بڑھ گیا اور انھیں اپنی قابلیتوں کے اظہار کا
موقع ملا ۔

۱۸۵۷ع کے چند سال بعد آزاد کو نہ صرف فارغ البالی
حاصل ہوچکی تھی بلکہ ادبی حلقوں میں ان کا نام عزت سے
لیا جاتا تھا ۔ نیز 'انجمن پنجاب' کے سیکرٹری کی حیثیت سے
ان کے انگریزی حکام سے بھی مراسم پختہ ہو رہے تھے۔ ان تمام
باتوں کے باوجود جنگ آزادی کے عواقب کا خوف ایک آسیب
کی طرح ان کے ذہن پر چھایا رہتا تھا ۔ انھیں خوف تھا کہ
اس واقعے میں ان کی شمولیت کا راز فاش ہوگیا تو بنا بنایا
کھیل بگڑ جائے گا ۔ اور یہ خدشہ موہوم نہ تھا ۔ جب
تک آزاد گمنام رہے، کسی شخص نے آن سے تعرض نہ
کیا ۔ لیکن جب وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے تو ان کے
بعض اقارب کا جذبۂ رقابت بھڑک اٹھا ۔ ان کے ایک عزیز
نے جو لاہور میں ملازم تھے ، ان کے خلاف رپورٹ جڑ دی
کہ آزاد جو گورنمنٹ کا خیرخواہ بنا پھرتا ہے ، اس نے اپنے
باپ کی طرح غدر میں انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا ۔ اس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ آزاد کے خلاف خفیہ طور پر تفتیش شروع ہوگئی ،
اور شملہ میں آن کی طلبی ہوئی تاکہ وہ اپنے اوپر عاید شدہ
الزامات کا جواب دیں ۔ اس سے آزاد کے اوسان خطا ہوگئے ۔
انھیں یقین تھا کہ وہ مواخذے سے بچ نہ سکیں گے ۔ اس پریشانی
کے عالم میں انھیں صرف ایک شعاع امید نظر آئی ــــ ڈاکٹر
لائیٹنر ــــ چنانچہ آنھوں نے اپنا سارا حال انھیں کھہ سنایا اور

ان سے اعانت طلب کی ۔ ڈاکٹر لائیٹنر اپنے دوستوں کی مدد اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ انھوں نے اُن کی مدد کا بیڑہ اٹھایا اور جو کہا تھا کر دکھایا ۔ آزاد کو جواب دہی کے لیے شملہ تو جانا پڑا لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا ۔

اس کے بعد بھی آزاد ملک کی اُن ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ، جن کی تحریک حکومت کی طرف سے ہوتی تھی، نہایت انہاک سے حصہ لیتے رہے تاکہ ان کی وفاداری کا خیال حکام کے دلوں پر پختگی سے مرتسم ہو جائے ۔

حسنِ اتفاق ہے کہ انھیں جلد ہی ایک ایسی خدمت سرانجام دینے کا موقع مل گیا جس نے انھیں سرکاری شبہات سے ہمیشہ کے لیے نجات دلوا دی ۔

ان دنوں روس کا بڑھتا ہؤا رسوخ ہندوستانی سیاست کے لیے ایک مستقل کابوس تھا ۔ اندیشہ تھا کہ وہ وسط ایشیا کے ممالک کو اپنے حیطۂ اقتدار یا اختیار میں لا کر ہندوستان پر حملہ آور ہوگا ۔ چنانچہ اس کے سد باب کے لیے برطانوی حکومت نے ایران اور افغانستان سے معاہدے کیے ۔ روس نے پہلے پہل خیوا کے حکمران پر یہ الزام لگایا کہ وہ روسی باشندوں کو غلام بنا کر فروخت کرتا ہے اور اس پر حملہ کر دیا ، لیکن یہ حملہ ناکام رہا ۔ جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسط ایشیا میں قدم بڑھائے اور ۱۸۶۴ع میں بمقام لاہور لارڈ لارنس اور سفیر خجند کی ملاقات ہوئی ۔ تین سال بعد بخارا کا سفیر بھی ہندوستان آیا ۔ لیکن یہ سفارت بھی ناکام رہی اور روس نے بخارا اور خجند پر قبضہ کر لیا ۔

برطانوی گورنمنٹ ان مخمصوں میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی - تاہم وہ خواہاں تھی کہ روس کے جارحانہ اقدامات سے جو واقعات ان ممالک میں رونما ہو رہے تھے اُن کے متعلق قابل وثوق معلومات حاصل کرلے - لہٰذا یہ فیصلہ ہؤا کہ ایک خفیہ مشن ان ممالک میں بھیجا جائے جو ان کا دورہ کرے اور ان کے سیاسی حالات پر رپورٹ پیش کرے - یہ وفد تین چار اشخاص پر مشتمل تھا - پنڈت من پھول اس کے سربراہ تھے - آزاد کا انتخاب انھی کے ایما پر ہؤا تھا -

آزاد کے لیے یہ منصوبہ دو وجہ سے اہم تھا - ایک یہ کہ انھیں ترکستان اور اسلامی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملے گا ، دوسرے یہ سیاسی خدمت سرانجام دے کر وہ گورنمنٹ کے مقربین خاص میں داخل ہو جائیں گے ، اور انھیں 'غدر' کے عواقب سے نجات حاصل ہوگی -

اس خفیہ مشن کی تفصیلات کا آج تک کسی کو علم نہیں کیونکہ سب اراکین پر ان معاملات کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی کڑی تاکید کی گئی تھی - جہاں تک زاد کا تعلق ہے ، وہ اس معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ بہ الفاظ مولوی خلیل الرحمان (مؤلف 'اخبار اندلس') ، انھوں نے ان کا ذکر اپنی اہلیہ تک سے نہ کیا ہوگا -

معتبر ذرائع سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ اس سفر میں مولانا آزاد نے ایک آزاد منش فقیر کا روپ دھارا - ایک دو جگہ نانبائی کا کام کیا اور کچھ عرصہ مرغینان میں طلبہ کو تعلیم دیتے رہے - پنڈت من پھول اور آزاد نے اس ضمن میں کیا کام کیا ، اس کا کسی کو علم

نہیں ، ہاں اس کام کی نوعیت پر ایک 'سوال نامہ' سے روشنی پڑتی ہے ، جو آزاد اور دوسرے ممبروں کو دیا گیا تھا ۔ ذیل میں اس نایاب مسودے کی ایک نقل پیش کی جاتی ہے ۔ اس میں ممالک اور شہروں کے نام نہیں دیے گئے ، بلکہ ان کے پہلے حروف پر اکتفا کیا گیا ہے :

'ک' میں ان کی اصل حیثیت کیا ہے ؟ کتنی فوج ان کی اس ملک میں ہے؟ بہ تفصیل سوار ، پیادہ و توپ خانہ — فوج ان کی اصلی 'ر' ہے ، یعنی آدمی سپاہ کے سکن ہائے گرد ونواح سنٹ پیٹس برگ سے ہیں یا مسلمان سپاہی جو اضلاع توابع 'ر' حدود متصلہ 'ک' میں بھرتی کیے گئے — افسر اور سپاہی ایک ہی قوم سے ہیں یا افسر عیسائی ہیں اور سپاہی ماتحت مسلمان ؟

'ر' نے کیا قلعے بنائے ہیں اور ان پر توپیں چڑھائی ہیں ، بڑی بڑی پلہ کی یا وہ فقط مضبوط سرائے ہیں جو واسطے حفاظت سوداگران و مسافران از غارت گران بنائی گئیں ؟ کیا یہ تعمیرات بہت بنائی ہیں ؟ عموماً کتنے آدمی ہر جگہ مامور ہیں ؟

کیا 'ر' نے 'ک' والوں کو بالکل شکست دی ہے یا وہ دونوں اب تک لڑ رہے ہیں ؟ اگر لڑ رہے ہیں تو 'ک' والے اس لایق ہیں کہ خاطر خواہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ 'ر' کا کریں یا ضرور شکست کھاویں گے ؟ لڑائی کا سبب کیا ہوا ہے ؟ آیا یہ بات ہے کہ 'ر' چاہتے ہیں کہ 'ک' کو فتح کر کے متصرف ہو جاویں یا فقط 'ر' کا یہ مطلب ہے کہ 'ک' والوں کے حملہ ہائے اور دست درازی اپنی سرحد سے روکیں ۔

کیا 'ک' والے پہلے 'ر' کے ملک میں غارت گری نہیں
کرتے تھے اور لوگوں کو پکڑ کر بھی لے جاتے تھے
جیسے ترکمان خراسان کی حدود پر کرتے ہیں ؟ کیا
'ر' نے کسی قدر ملک 'ک' پر تسلط کر لیا ہے اور
جو کر لیا ہے تو کتنا اس کا مالیہ وصول کرتے ہیں
اور اس میں 'پلس مقرر کر رکھا ہے اور بند و بست
اس کا اپنے طور کر رکھا ہے ؟ 'ر' نے 'ک' میں اپنی
طرف سے کوئی گورنر مقرر کر رکھا ہے اور جو کیا
ہے تو اس کا نام کیا ہے ؟ وہ عیسائی ہے یا مسلمان ؟
'ک' میں بہ سبب لڑائی سلسلہ تجارت کس طرح پر ہو رہا
ہے ، آیا سست ہے یا بدستور ؟ سوداگران کی حفاظت
کرتے ہیں اور اُن سے بہ حسن سلوک پیش آتے ہیں
یا بر عکس ہوتا ہے ؟ 'ر' رعایائے ملک متصرفہ
جدیدہ کی تالیف قلوب کرتے ہیں یا ان کے ساتھ
بد سلوکی کرتے ہیں ؟ یارقند کے لوگوں کی عموماً
لڑائی کی بابت کیا رائے ہے جو مابین 'ر' اور 'ک'
کے ہے ؟ کیا ان کو اندیشہ پیدا ہوگیا ہے اور وہ یہ
امید کرتے ہیں کہ 'ر' ہمارے ملک یارقند پر بھی
حملہ کریں گے ؟ 'ک' میں کوئی باترتیب گورنمنٹ
ملکیہ لوگوں میں ہے یا نہ؟ اگر ہے تو اس کے خان یا
سردار کی عمر اور سیرت کیا ہے؟ وہ لئیق آدمی مستعد
اور دلیر جس پر لوگوں کو بھروسا ہو ، ہے یا نہ ؟
'ک' میں سپاہی ملکیہ لوگ ہیں یا اپنی فوج ہے؟ جہاں
تک ہو سکے تعداد ہر ایک کی دریافت کرو — کیا
بیشتر سپاہ سواران ہمراہیان سرداران ملک سے ہیں ؟

خان 'ک' کے پاس کوئی توپ ہے؟ اگر ہے تو کس پلہ کی اور کس حجم کی اور عموماً اس کی کتنی مار ہے اور کیوں کر کھینچی جاتی ہے؟ اگر گھوڑوں سے کھینچی جاتی ہے تو فی توپ کے گھوڑے لگائے جاتے ہیں ؟ کوئی میگزین باروت اور گولہ بھی رکھتے ہیں؟ اگر نہیں رکھتے تو گزارہ کیوں کر کرتے ہیں ؟ سوار اور پیادہ کے پاس کیا کیا ہتھیار ہیں ؟ کھلے ہوئے میدان میں 'ر' سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور لڑ سکتے ہیں یا فقط ان کو اچانک چھاپہ مار کر حملوں سے حیران کر سکتے ہیں ؟ چونکہ حال میں خبر پہنچی ہے کہ خان 'ک' یا تو مسند سے معزول کیا گیا اور نظر بند کیا گیا یا مارا گیا اور قبچاقیوں نے اس کو ہٹا کر ملک حوالہ شاہ 'ب' کو دیا ۔ اس کا حال مفصل فی الامکان دریافت ہونا چاہیے اور یہ بھی تحقیق ہونا چاہیے کہ اس کا اثر غالباً بہ نسبت رابطہ 'ر' اور 'ب' ان دونوں ملکوں میں کیا ہوگا ؟ علاوہ اس کے یورپ میں یقین ہو رہا ہے کہ 'ر' نے اپنی قدیمی قلعہ والی حد بڑھا دی ہے ، 'ک' کا کچھ ملک لے کر — اس نئی حد کی لین حتی الامکان تحقیق ہونی چاہیے ۔ جو قلعے اس حد پر بنائے گئے ، کہاں کہاں اور کتنے قلعے ہیں اور کس قدر ملک اس طرح سے 'ک' سے نکل کر 'ر' میں شامل ہو گیا ؟ اور چونکہ معلوم ہوتا ہے کہ کشغر ، یارقند ، ختن میں جو اب تک چین کے ماتحت تھے ، مسلمانوں نے سرکشی کرکے ختائیوں سے کسی اور اپنے سرداروں کی گورنمنٹ مقرر

کر دی ہے ، اس کے صحیح حالات تحقیقات ہونے چاہئیں ۔ اور جو مابین ان ملکوں کے آپس میں واسطہ ہے اور درمیان 'ک' اور 'ب' اور ؟ کے جو کچھ اور واسطہ ہو سب تحقیقات کرنا چاہیے ۔ اور ان کی مرضی اور خواہش اور امکان درباره تجارت کیسے ہے ؟ اور نیز یہ کہ چین والے پھر سلطنت اپنی قائم کرنے والے ہیں یا نہ؟ اور کابل اور 'ک' کے درمیان ملک بدخشاں جس میں کان بہت ہیں اور ایک ایلچی حال میں بمع تحفہ جات پاس پاس 'ک' پشاور کے آیا ، اس کے حالات بھی شامل تحقیقات ہونے چاہئیں ۔ اور اس کی آمدنی اور پیداوار اور اس کا برتاو ریاستہائے متصلہ کے ساتھ کیا ہے ؟ تحقیق ہونا چاہیے ۔

اس سفر کے سلسلے میں جو ثقافتی ، ادبی اور تاریخی اور جغرافیائی معلومات آزاد نے حاصل کیں ان کا بالتفصیل ذکر ہمارے مضمون 'سخن دانِ فارس اور اس کے ماخذ' میں آئے گا ۔

نیرنگ خیال اور اس کے مآخذ

اگر 'نیرنگ خیال' کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا محمد حسین آزاد اسے لکھتے وقت ایک شدید ذہنی الجھن میں مبتلا تھے ۔ یہ کشمکش کچھ اسی قسم کی ہے جو ہارڈی کے اکثر کردار زندگی کی آن پر آزمائش گھڑیوں میں محسوس کرتے ہیں جب مدت العمر کی بد نصیبی کے بعد انھیں اپنی زندگی میں امید کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ اس وقت ان کی عقل سلیم اور فطری انصاف پسندی اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کی تمام روئداد ، جس کا بیشتر حصہ جنسی کمزوریوں سے عبارت ہوتا ہے ، کہہ سنائیں ۔ لیکن ان کے بڑھتے ہوئے جذبات اور زندگی کی خواہش یا تو انھیں ان واقعات کو چھپانے پر مجبور کرتی ہے یا وہ انھیں ایسے ادھورے اور مبہم طریقے سے بیان کرتے ہیں جس سے ان کا مفہوم اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتا ۔ بعد میں جب یہ واقعات آشکار ہوتے ہیں تو ان کا اثر طرفین پر ناخوش گوار ثابت ہوتا ہے ۔

بعینہ یہی حالت آزاد کی ہے ۔ وہ 'نیرنگ خیال' کے ماخذ پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت کچھ کہہ بھی گئے ہیں ، لیکن ایسے انداز میں کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے ، پھر بھی کوئی شخص اب تک ان کے اصلی مفہوم سے آگاہ نہیں ہو سکا ۔

'نیرنگ خیال' مصنف کی طبع زاد تصنیف خیال کی جاتی ہے ، بجز اس کے کہ اس کا مواد غالباً ڈاکٹر لائیٹنر نے بہم پہنچایا تھا ۔ یہ رائے شیخ عبدالقادر نے (جو بعد میں سر کے خطاب سے مفتخر ہوئے) آزاد کے متعلق اپنے ایک خطبے میں ظاہر کی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

''میں نے بعض لوگوں کی زبانی سنا ہے — اور غالباً اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ہے — کہ مصنف کو اس کتاب کا ڈھانچا ڈاکٹر لائیٹنر سے ہاتھ آیا جو بذات خود یونانی اور انگریزی ادبیات کا عالم تھا ۔ اس نے آزاد کو اپنے خزانۂ معلومات سے معتدبہ طور پر بہرہ مند کیا اور مولانا مرحوم نے اسی مواد کی بنا پر 'نیرنگ خیال' کی عمارت تعمیر کی ۔''

اس کتاب کے متعلق آزاد کے اپنے بیان تین ہیں اور سب کے سب برسبیل تذکرہ اور مبہم ۔ وہ اس کے 'مقدمہ' میں لکھتے ہیں :

''یہ چند مضامین جو لکھے ہیں ، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں ۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا ، ہاتھوں نے اسے لکھ دیا ۔''

اگر اس طویل اور پیچیدہ عبارت کو سیدھی سادی نثر میں ادا کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو باتیں مجھے بتائی گئی ہیں ، میں نے انھیں قلمبند کیا ہے ۔ بہ الفاظ دیگر ، آپ نے ان مضامین کو ترجمہ نہیں کیا بلکہ

محض اس مواد پر حاشیہ آرائی کی ہے جو انھیں مہیا کیا گیا۔
اسی 'مقدمہ' میں وہ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

''انگریزی میں یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسوم قدیم کی باتیں اب تک انشاپردازی کا جزو ہیں۔ رومی و یونانی ستارہ ہائے فلکی اور اکثر قوائے روحانی کو دیوتا مانتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں بڑے بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشم سخن ہر بات میں ان کے قصوں پر اشارے کرتی جائے، مگر اردو کے باغ نے فارسی و عربی کے چشموں سے پانی پایا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا کا گزر نہیں، اور یہ سخت دشواری ہے، کیوں کہ اگر لکھنے میں کچھ تصرف کریں تو ترجمہ نہ رہا، اور اگر اصل کی رعایت کی تو کتاب معمائے دقیق ہو گئی، نہ کہ رفیق تفریح۔''

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ آزاد ان مشکلات کا ذکر کر رہے ہیں جو یونانی علم‌الاصنام کی بھرمار کی وجہ سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت پیش آتی ہیں۔

تیسرا بیان 'علمیت اور ذکاوت کے مقابلے' کے فٹ نوٹ میں دیا گیا ہے جو ان الفاظ پر مشتمل ہے :

''انگریزی میں وٹ (Wit) اور لرننگ (Learning) کا مباحثہ تھا۔

میں نے وٹ کے واسطے بہت خیال کیا، کوئی لفظ نہ ملا، ناچار ذکاوت لکھ دیا۔''

مجھے ان مضامین کے انگریزی سے ماخوذ ہونے کا شبہ اس صریح مشابہت سے پیدا ہوا جو آزاد کے مضمون 'سیر زندگی'

اور جانسن (Johnson) کے "The Voyage of Life" میں
ہے - جب میں نے ان کا موازنہ کیا تو آزاد کا مضمون
انگریزی مضمون کا آزاد ترجمہ ثابت ہوا - اٹھارھویں صدی
عیسوی وہ زمانہ ہے جب انگریزی زبان میں تمثیلی موضوعات
پر مضمون لکھنے کا مشغلہ اپنے پورے زور پر تھا - چنانچہ
جب میں نے اس صدی کی نثر کا مطالعہ کیا تو میرا شک
یقین کے درجے تک پہنچ گیا - مجھے معلوم ہوا کہ
'نیرنگ خیال' کے تمام مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ ہیں -
ان میں اصل سے جس حد تک استفادہ کیا گیا ہے ، اس کا درجہ
مختلف ہے - ان میں سے اکثر بامحاورہ ترجمہ ہیں ، اگرچہ بعض
جملوں میں کسی قدر حاشیہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے -
اور ایک دو مقامات پر اصل سے قصداً انحراف کیا گیا ہے -
مثلاً 'سیر زندگی' کا آخری حصہ یا 'شہرت عام اور بقائے
دوام کا دربار' کا پہلا اور تیسرا پیرا آزاد نے اصل پر اضافہ
کیے ہیں - 'شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار' اور
ایڈیسن (Addison) کے مضمون میں ، جس سے وہ ماخوذ
ہے ، صرف یہ فرق ہے کہ ایڈیسن اپنے مضمون میں مشاہیر
یورپ کا ذکر کرتا ہے ؛ اس کے برعکس آزاد کا مضمون
مشرقی مشاہیر پر مشتمل ہے - دوسرے لفظوں میں مضمون
کا درمیانی حصہ آزاد کا اپنا ہے اور باقی حصے ایڈیسن سے
ماخوذ ہیں -

اب میں آزاد کے مضامین اور ان انگریزی مضامین کے
نام فرداً فرداً پیش کرتا ہوں جن سے وہ ترجمہ کیے گئے ہیں :

(۱) "آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور — 1. "An Allegorical History of Rest and

Labour"—Johnson رفتہ رفتہ کیا ہو گیا ۔"

2. "Truth—Falsehood and Fiction : an Allegory"—Johnson (۲) "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ۔"

3. "The Garden of Hope"—Johnson (۳) "گلشن امید کی بہار ۔"

4. "The Voyage of life"—Johnson (۴) "سیر زندگی"

5. "The Endeavour of Mankind to get rid of their Burdens, a Dream—Addison (۵) "انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا ۔"

6. "The Conduct of Patronage"—Johnson (۶) "علوم کی بد نصیبی ۔"

7. "An Allegory of Wit and Learning"—Johnson (۷)"علمیت اورذکاوت کے مقابلے۔"

8. "Paradise of Fools"—Parnell—"*The Spectator*", No. 460 (۸) "جنت الحمقا ۔"

9. "False Wit and Humour"—Addison—"*The Spectator*", No. 35 (۹) "خوش طبعی ۔"

(۱۰) ''نکتہ چینی ۔'' — 10. "An Allegory on Criticism"—Johnson

(۱۱) ''مرقع خوش بیانی ۔'' — 11. "Allegory of Several Schemes of Wit"—Addison—"*The Spectator*", No. 63.

(۱۲) ''سیر عدم ۔'' — 12. "*The Spectator*",—No. 501—Addison

(۱۳) ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار ۔'' — 13. "Vision of the Tables of Fame"—Addison—*The Tatler*,—No. 81.

آپ پوچھیں گے کہ جب اکثر لوگوں کی رائے میں مولانا انگریزی سے نا آشنا تھے ، یا انھیں کم از کم انگریزی زبان پر اس قدر عبور نہ تھا کہ وہ ان مضامین کا اپنی زبان میں ترجمہ کر سکتے ، تو پھر انھوں نے ان کا ترجمہ کیسے کیا ؟ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں کہ آزاد انگریزی نہیں جانتے تھے ۔ اگر ان کی تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انھیں انگریزی زبان پر اپنے معاصرین کے اندازے سے کہیں زیادہ قدرت حاصل تھی ۔ یہ درست ہے کہ ہمارے پاس آزاد کے انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہونے کی کوئی بلا واسطہ اور قطعی شہادت نہیں ۔ مولوی خلیل الرحمان کا بیان ہے کہ ''آزاد انگریزی تو سمجھ سکتے تھے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے ، انھیں اس پر زیادہ عبور نہ تھا ۔'' چوں کہ اس مسئلے کے

متعلق ہمارے پاس کوئی معاصرانہ شہادت نہیں ، اس لیے ہمیں چار و ناچار ان کی تصانیف اور ادبی سرگرمیوں ہی سے بالواسطہ شہادت تلاش کرنی پڑتی ہے -

یہ امر کہ آزاد انگریزی زبان سے واقفیت رکھتے تھے ''نیرنگ خیال'' کے اُن اقتباسات سے ظاہر ہے جنھیں میں اوپر پیش کر چکا ہوں - اس رائے کی تائید میں ہمیں اس کتاب سے اور بھی شہادت ہاتھ آتی ہے - مولانا فرماتے ہیں :

''میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغِ شوق روشن کیا ہے - بڑی بڑی کتابیں ان مطالبَ پر مشتمل ہیں جنھیں یہاں essay (ایسے) جواب مضمون کہتے ہیں -''

اس خیال کی مندرجہ ذیل امور سے مزید تائید ہوتی ہے :

۱ - آزاد نے انگریزی سے چھ یا اس سے زیادہ نظمیں اردو میں ترجمہ کی ہیں -

۲ - جیسا کہ ''آب حیات'' اور ''سخندان فارس'' کے مباحثات سے ظاہر ہے ، آپ کو لسانیات کی تاریخ کا علم تھا - مولانا حالی کا بیان ہے کہ آپ نے یہ تمام مواد انگریزی کتابوں سے حاصل کیا - وہ ''آب حیات'' پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مصنف نے اس تذکرے کے اول میں دو مضمون زبانِ اردو اور نظمِ اردو کی تاریخ پر لکھے ہیں - پہلا جو زبانِ اردو سے متعلق ہے ، اس میں انگریزی مؤرخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کر کے مدد لی ہے -

۳ - ''سخندان فارس'' کے پہلے حصے کا وہ جزو جس کا تعلق تقابلی لسانیات اور ہند ایرانی صوتیات سے ہے، انگریزی کتابوں سے حاصل کیا گیا ہے - اسی طرح ''سخندان فارس'' حصہ دوم سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد نے ژند، پاژند اور اوستا کے متعلق اپنی بیشتر معلومات انگریزی گرامروں اور ڈکشنریوں سے حاصل کی ہیں - پاژند کے سلسلے میں وہ نہ صرف ویسٹ صاحب (West) کے ''مینوے خرد'' کے ترجمے کا ذکر کرتے ہیں، بلکہ اس سے بعض کوائف اور اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں -

۴ - وہ اپنے ایک مکتوب میں ڈاکٹر لائٹنر کو لکھتے ہیں:

''میں کئی دن سے سنتا ہوں کہ ''سنینِ اسلام'' میں کسی عالم نے بہت غلطیاں نکالی ہیں - آج ایک بات سنی کہ سنین اسلام کی ترکیب ہی غلط ہے - مجھے ضبط کی طاقت نہ رہی - چنانچہ اس ضرورت نے مضطرب کر دیا اور یہ مختصر عرضداشت انگریزی میں لکھتا ہوں -''[1]

میری رائے میں اکثر خود آموز لوگوں کی طرح آزاد مرحوم انگریزی زبان اچھی طرح سمجھ سکتے تھے، اگرچہ اسے بول یا لکھ نہیں سکتے تھے - آج بھی ہمارے ہاں ہزاروں لوگ موجود ہیں جو المانی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں سے اچھا خاصا ترجمہ کر لیتے ہیں، اگرچہ انہیں بول نہیں سکتے اور نہ ان میں لکھ سکتے ہیں -

ذیل میں ''نیرنگ خیال'' اور آن انگریزی مضامین

---

۱ - تائید مزید کے لیے دیکھیے: 'سخن دان فارس پر مزید روشنی -'

کے ، جن سے اس کے مضامین ماخوذ ہیں ، اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں ۔ ان سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ ''نیرنگ خیال'' کے مضامین انگریزی سے ماخوذ ہیں ۔

۱

آغاز آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا ؟
اور رفتہ رفتہ کیا ہوگیا ؟

سیر کرنے والے گلشنِ حال کے اور دوربین لگانے والے ماضی اور استقبال کے روایت کرتے ہیں کہ جب زمانے کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا تو تمام اولادِ آدم مسرتِ عام اور بے فکریِ مدام کے عالم میں بسر کرتے تھے ۔ ملک ملک فراغ تھا اور خسرو آرام ، رحم دل ، فرشتہ مقام گویا ان کا بادشاہ تھا ۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا ، نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا ۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری اسی میں ادا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گلزاروں میں گلگشت کرتے تھے ۔ ہری ہری سبزے کی کیاریوں میں لوٹتے تھے ، آب حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے ۔ ہمیشہ وقت صبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا ۔

۲

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

عہد قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے ؛ شہسواری ، تیراندازی اور راست بازی ۔ شہسواری اور تیراندازی تو بے شک سہل

آ جاتی ہوگی ، مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم
ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے ،
اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغِ دیوزاد آ کر ان
کے دلوں پر تیشۂ جادو مارتا تھا ، تو یہ اس چوٹ سے اس
کی اوٹ میں بچ جاتے تھے -

۳
گلشنِ امید کی بہار

میں ایک رات اپنے خیالات میں حیران تھا اور سوچ
رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا
ہو جاتا ہے جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے ، اور
زمانۂ آئندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لیے امید و بیم
اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے - یکایک آنکھ
لگ گئی - دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغِ نوبہار میں ہوں
جس کی وسعت کی انتہا نہیں - امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا
ہے - آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے ،
تمام عالم رنگین و شاداب ہے - ہر چمن رنگ و روپ کی
دھوپ سے چمکتا ، خوشبو سے مہکتا ، ہوا سے لہکتا نظر آتا
ہے - زمین فصلِ بہار کی طرح گل ہائے گونا گوں سے بوقلموں
ہو رہی ہے اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے
بھر رہے ہیں - یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم
طاری ہوا کہ سر تا پا محو ہو گیا - جب ذرا ہوش آیا تو
ان چمن ہائے دل کشا کو نظرِ غور سے دیکھنے لگا اور ایسا
معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف
زیادہ ہو - پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے
چمکیلے پھول کھلے ہیں - آبِ زلال کے چشمے دھوپ کی

چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت
جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی
آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے، یہاں خوب زور شور سے
چہکا رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے
ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں۔ مگر
یہاں سے جو نظر اٹھائی تو اور ہی طلسمات نظر آیا؛ یعنی
دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں ان کے تیار
میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اور آگے بڑھنے
کو للچایا، چنانچہ قدم اٹھایا۔ مگر جوں جوں آگے بڑھتا
گیا زیادہ حیران ہوتا گیا، کیونکہ جو ہریاول سامنے سے
لہلہاتی دکھائی دیتی تھی، پاس پہنچ کر اس کی رنگت
پھیکی پڑگئی اور میوے تو گر ہی چکے تھے۔ بلبلیں جو
چہچہے بھر رہی تھیں، وہ آگے آگے اڑتی چلی جاتی تھیں۔
اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا اور جو بہاریں تھیں
وہ بھی ہر قدم پر سامنے ہی تھیں، مگر تو بھی ہاتھ نہ
آ سکیں۔ گویا میرے شوقِ آرزو کو دہکاتی تھیں کہ جوں
جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

۲

سیرِ زندگی

ایک حکیم کا قول ہے کہ زندگی ایک میلہ ہے اور اس
عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں اس کے
تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے
تو جوان ہوئے اور پھر پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ
کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر

وہی ہے ۔ جب اس فقرے پر غور کیا اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصور کیا تو مجھے انواع و اقسام کے خیالات گزرے ؛ اول تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنٰی ادنٰی چیز کا محتاج ہے ۔ پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طالب گار ہوتا ہے، ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے، اور جو کہ اس کے برخلاف ہے اس کا عاشق زار ہوتا ہے ۔

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیرتی پھرتی ہے ۔ لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعۃً درد و مصیبت کی فریاد ، خوشی کے ولولے ، ڈر کی چیخیں ، ہواؤں کے زور ، پانی کے شور ایسے اٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا ۔

۵

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب کہا ہے کہ ''اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اپنے تئیں بد نصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے ۔''

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے ؛ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے ، تو ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا ۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی ۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے ؛ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں ۔

۶

علوم کی بد نصیبی

(آغاز مطلب)

علوم و فنون نے دیکھا کہ مدت گزر گئی ہمارے مرید اور خدمت گذار فقط اپنی ارادتِ دلی سے انسان کے فائدوں کے لیے محنت کر رہے ہیں اور جس صدقِ دلی سے جانفشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں اس کا صلہ کچھ بھی نہیں ملتا ۔ بلکہ جن بے لیاقتوں کو جوہرِ کمال سے کچھ واسطہ نہیں اور انسان کی نفع رسانی کی بھی کچھ پروا نہیں رکھتے ، وہ کامیابی اور عیش و عشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں ۔ سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطانِ آسمانی کے دربار میں عرضی کی ۔ خلاصہ جس کا یہ کہ انصاف و عدالت کے بہ موجب تمام مریدانِ خدمت گذار کو بمقتضائے انصاف ، عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں ۔ دربار میں مشتری صدرِ اعلیٰ تھا اور عطارد میر منشی ۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور ادائے خدمت میں مشقتیں تھیں ، سب جتائی اور دکھائی گئیں اور حق تلفیوں کا دعویٰ کیا گیا ۔ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت عالمِ خاک میں علوم و فنون

کی کوششوں اور کارگزاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں کیا ۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہو گئے ہیں کہ یقین ہے چند روز میں دنیا کو چھوڑ کر عالم بالا کی طرف چلے آئیں ۔ اور اگر وہ دنیا میں نہ رہے تو حضرت انسان ، جنھوں نے یہ شان و شوکت بنائی ہے ، حیوانوں سے بدتر رہ جائیں گے ۔ پھل پھلاری، گھاس پات چرتے پھریں گے ۔ جنگلوں کے جانور بن جائیں گے، اور جو ان سے زیادہ وحشی ہوں گے وہ انھیں پھاڑ کھائیں گے ۔

۷

علمیت اور ذکاوت کے مقابلے

کہتے ہیں کہ اقلیمِ خیال میں ایک وسیع ولایت تھی جس کا نام ملکِ فصاحت اور وہاں کے بادشاہ کا لقب ملک الکلام تھا ۔ بادشاہِ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں ۔ ایک کا نام فرحت بانو اور دوسری کا نام دانش خاتون تھا ۔ دانش خاتون کا ایک بیٹا تھا ۔ یہ سیدھا سادہ شخص ، حسنِ متانت میں باپ کا خلف الرشید اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا ۔ اسے علم کہتے تھے ۔ فرحت بانو کی بیٹی ذکاوت تھی ۔ یہ باپ کے سبب سے خوش بیانی میں اسم با مسمیٰ اور اور ماں کے اثر سے زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختے کو شرمندہ کرتی تھی ۔ چوں کہ فرحت بانو اور دانش خاتون دونوں سوکنیں تھیں ، دونوں بچوں نے بگاڑ کا دودھ پیا تھا ، اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی ۔ یعنی ابتدا سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں کہ ایک ، ایک کو خاطر میں نہ لاتا تھا ، بلکہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھا ۔ باپ نے دیدۂ دور اندیش سے ان کی نا اتفاق

کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لیے تھے ۔ اس لیے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنائیت کی گرمیِ محبت سے ملائم ہوں ۔ آخر صورت یہ نکالی کہ اپنی نظر محبت کو دونوں میں تقسیم کر دیا ۔ مگر باپ کی شفقتِ منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا ۔ کیوں کہ ماؤں کی طرف کی عداوت دور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی ، اور بچپنے کے خیالات کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ بہت دور تک پہنچ گئی تھی ۔ چنانچہ نئے نئے موقع جو پیش آتے تھے، ان میں عداوت مذکور اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی ۔

۸

جنت الحمقا

دنیا میں اکثر قباحتیں اور حماقتیں ایسی ہیں کہ ہم سب ان میں آلودہ ہیں مگر معلوم نہیں ہوتیں ۔ درحقیقت وہ ہماری رسائیِ فہم سے بہت اونچے طاق پر رکھی ہیں ، اور کچھ ایسے ڈھب سے سجائی گئی ہیں کہ ہر بدی عین خوبی نظر آتی ہے ۔ لطف یہ ہے کہ وہ آلودگی ہمیں کچھ بری معلوم نہیں ہوتی ، بلکہ بجائے اس کے رفع کرنے یا چھپانے کے خود دکھاتے ہیں اور آرزوئیں کرتے ہیں کہ اپنی قباحتوں میں ترقیاں کریں اور انھیں میں ہماری قدر دانیاں ہوں ۔ چنانچہ سینکڑوں واہیات، ہزاروں لغو خیالات ، نئے مسخراپن ، ظرافتوں کے چمن ہیں کہ وہی ہماری تفریحِ طبع اور خوش دلی کا سرمایہ ہو رہے ہیں اور یہ رنگینیاں ہمیں ایسے ایسے رنگوں میں رنگین کرکے ابنائے جنس کے سامنے جلوہ دیتی ہیں کہ ہم بھی انھیں میں خلعت افتخار لیتے ہیں ۔ اس فخرِ بیہودہ اور خیالِ بے بنیاد کی خوشی میں خدا جانے کیا لطف دیکھا ہے

کہ سیانے دنیا داروں نے اس کی دل فریبیوں کا اشارہ کرنے
کے لیے ایک لطیف اصطلاح چھانٹی ہے ، یعنی 'جنت الحمقا'۔

۹

خوش طبعی

خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ
وہ کیا شے ہے ؟ البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں
ہے ؟ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں تو
افلاطون حکیم الٰہی کی طرح کنایے اور استعارے سے بیان
کروں ۔ اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اس سے
وہ صفتیں منسوب کروں جو کہ نسب نامۂ مندرجہ ذیل میں
درج ہیں ۔ یہ واضح ہو کہ سچ خوش طبعی کے خاندان کا
بانی مبانی ہے ۔ اس گھرانے میں حسنِ ادب ایک نہایت معقول
شخص تھا ۔ اس کا بیٹا حسنِ بیان ہوا ۔ اس نے ایک اپنے
برابر کے خاندان میں شادی کی ۔ اس کی دلھن کا نام
خندہ جبیں تھا کہ آٹھ پہر ہنستی ہی رہتی تھی ۔ چنانچہ اس
کے گھر میاں خوش طبع پیدا ہوئے۔

چوں کہ خوش طبع سارے خاندان کا لب لباب تھا اور
بالکل مختلف طبیعت کے والدین سے پیدا ہوا تھا ، اس لیے اس
کی طبیعت بوقلموں اور گوناگوں تھی ۔ کبھی تو نہایت
سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا تھا اور کبھی رنگین
بانکا بن جاتا تھا ۔ کبھی ایسا بن کر نکلتا گویا قاضی‌القضات
یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں اور کبھی ایسے مسخرے بن
جاتے کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھاتے ۔ لیکن چوں کہ
ماں کے دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے اس لیے کسی حالت میں

ہو ، اہل محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا ۔

۱۰

نکتہ چینی

مصنف اپنی تصنیف میں یا تو نئے نئے مطالب اور تازہ مضامین سے دلوں کو شگفتہ کرتا ہے یا مطالبِ معلوم کو بنا سنوار کر نئی آرائش و زیبائش سے سامنے لاتا ہے ۔ کبھی نئی روشنی کا جلوہ دے کر دیدۂ نظر باز کو عجائب و غرائب تماشے دکھاتا ہے ۔ کبھی دیکھی بھالی چیزوں کو نئے رنگ دے کر اور موقع مقام بدل کر انھی میں تازگی اور دل ربائی کے انداز پیدا کرتا ہے ۔ بلکہ ایسے رنگ برنگ کے پھولوں سے سجاتا ہے کہ ہر چند ایک دفعہ طبیعت ان کی گلگشت کر چکی ہو ، مگر خواہ مخواہ پھر دیکھنے کو جی چاہتا ہے ، اور جن چمنوں پر عقلِ سبک سیر جلدی گزر گئی ہو یا سرسری نظر کرگئی ہو ، اس کا دوبارہ دل میں اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے ۔

۱۱

مرقعِ خوش بیانی

جس شغل میں مدت تک انسان کی دل لگی رہی ہو اس سے بالکل دل کا اٹھا لینا بہت دشوار ہے ۔ ہر چند دل کو اس کی یاد سے حرکت نہ دیں مگر اس میں آپ ہی آپ خیالات پیدا ہوتے ہیں ۔ جیسے سمندر میں مد و جزر آ کر ٹھہر جاتا ہے ، اور ہوا کے جھونکے بھی تھم جاتے ہیں ۔ مگر پانی گھڑیوں پڑا لہرایا کرتا ہے ، اسی طرح آج مجھے خیال ہوا ؛ یعنی پچھلی رات باقی تھی جو بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی ۔

۱۲

سیر عدم

جب کوئی نہایت چاہیتی چیز ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور معلوم ہو کہ اب ہاتھ نہ آئے گی تو کیا دل بے قرار ہوتا ہے - جان صحرائے تصور میں کیسی اس کے پیچھے بھٹکتی پھرتی ہے - مگر جب تھک کر ناچار ہو جاتی ہے تو اداس بے آس ہو کر آتی ہے ، اور اپنے ٹھکانے پر گر پڑتی ہے - عقل و فہم البتہ دلِ غمگین کو سہارا دے سکتے ہیں ، مگر دل ایسا بھولا بھولا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا اور جو غذا اس کے جی کو بھاتی ہے اسی کو ڈھونڈتا ہے - در حقیقت یاد جو دل کی ہمسائی ہے ، وہ ہمیشہ غم کو خانۂ دل میں بلاتی ہے اور ایام گذشتہ میں جو مزے اٹھائے ہیں ، یا دولت کھو کر عیش اڑائے ہیں ، ان کی گزری ہوئی بہاروں کے افسانے سناتی ہے - کسی کو اس دولت و عظمت کا غبار اڑتا دکھاتی ہے جس کی سواری گزر گئی ، کسی کو اقربا کی آوازیں اور دوستوں کی باتیں سناتی ہے ، جو شہر خموشاں میں پڑے سوتے ہیں ؛ کبھی عزیزوں کی صورتوں اور طبیعتوں کی تصویریں دکھاتی ہے ، کبھی پیاروں کے پیار اور ان کی محبتوں کے افسانے سناتی ہے ، دل نے حسرت و اشتیاق کو بھی اپنے گوشے میں رکھ چھوڑا ہے - وہ ان باتوں سے ایسے پھولتے اور پھلتے ہیں کہ دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے - مگر زمانہ اور اس پر وقت کا گزر جانا حالاتِ مذکورہ کو کچھ کچھ کمزور کرتا ہے - ساتھ اس کے یا تو عقل و فہم آ کر حسرت و اشتیاق کو دباتے ہیں یا کوئی اور باہر کا

شوق ان سے بھی زبردست آتا ہے وہ ان کا زور گھٹاتا ہے -

۱۳

شہرتِ عام اور بقاے دوام کا دربار

بقاے دوام دو طرح کی ہے ؛ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لیے فنا نہیں - دوسری وہ عالمِ یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں - حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا تو ثواب آخرت کے لیے یا دنیا کی نام وری اور شہرت کے لیے ہوئے - لیکن میں اس دربار میں انھی لوگوں کو لاؤں گا جنھوں نے اپنی محنت ہاے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہاے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا - اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے راہ نما تھے ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں - مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں ان کی حق تلفی نہ ہو جائے - کیوں کہ جن بے چاروں نے ساری جاں فشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا، ان کے حصے میں کسی طرح کا نقص ڈالنا سخت ستم ہے -

1

In the early ages of the world, as is well known to those who are versed in ancient traditions, when innocence was yet untainted, and simplicity unadulterated, mankind was happy in the enjoyment of continual pleasure, and constant plenty, under the protection of Rest ; a gentle divinity, who required of her worshippers neither altars nor sacrifices, and whose rites were

only performed by prostrations upon turfs of flowers in shades of jasmine and myrtle, or by dances on the banks of rivers flowing with milk and nectar.

2

It is reported of the Persians, by an ancient writer, that the sum of their education consisted in teaching youth *to ride, to shoot with the bow, and to speak truth.*

The bow and the horse were easily mastered, but it would have been happy if we had been informed by what arts veracity was cultivated, and by what preservatives a Persian mind was secured against the temptations to falsehood.

3

I was musing on this strange inclination which every man feels to deceive himself, and considering the advantages and dangers proceeding from this gay prospect of futurity, when, falling asleep, on a sudden I found myself placed in a garden, of which my sight could descry no limits. Every scene about me was gay and gladsome, light with sunshine, and fragrant with perfumes; the ground was painted with all the variety of spring, and all the choir of nature was singing in the groves. When I had recovered from the first raptures, with which the confusion of pleasure had for a time entranced me, I began to take a particular and deliberate view of this delightful region. I then perceived that I had yet higher gratifications to expect, and that at a small distance from me, there were brighter flowers, clearer fountains, and more lofty groves, where the birds, which I yet heard but faintly, were exerting all the power of melody. The trees about me were beautiful with verdure, and fragrant with blossoms; but I was tempted to leave them by the sight of ripe fruits, which seemed to hang only to be plucked. I therefore walked hastily forwards, but found, as I proceeded, that the colours of the field faded at my approach, the fruit fell before I reached it, the birds flew still singing before me, and though I pressed onward with great celerity, I was still in sight of pleasures of which I could not yet gain the possession, and which seemed to mock my diligence, and to retire as I advanced.

4

"Life," says Seneca, "is a voyage, in the progress of which we are perpetually changing our scenes : we first leave childhood behind us, then youth, then the years of ripened manhood, then the better and more pleasing part of old age." The perusal of this passage having excited in me a train of reflections on the state of man, the incessant fluctuation of his wishes, the gradual change of his disposition to all external objects, and the thoughtlessness with which he floats along the stream of time, I sunk into a slumber amidst my meditations, and, on a sudden, found my ears filled with the tumult of labour, the shouts of alacrity, the shrieks of alarm, the whistle of winds, and the dash of waters.

5

It is a celebrated thought of Socrates, that if all the misfortunes of mankind were put into a public stock, in order to be equally distributed among the whole species, those who now think themselves to be most unhappy, would prefer the share they are already possessed of, before that which would fall to them by such a division. Horace has carried this thought a great deal further in the motto of my paper which implies that the hardships and misfortunes we lie under are more easy to us than those of any other person would be, in case we change conditions with them.

As I was ruminating upon these remarks and seated in my elbow-chair, I insensibly fell asleep; when on a sudden, methought that there was a proclamation made by Jupiter that every mortal should bring in his griefs and calamities, and throw them together in a heap.

6

The Sciences having long seen their votaries labouring for the benefit of mankind without reward, put up their petition to Jupiter for a more equitable distribution of riches and honours. Jupiter was moved at their complaints, and touched with the approaching miseries of men, whom the Sciences, wearied with perpetual ingratitude, were now threatening to forsake, and who would have been reduced by their departure to feed in dens upon the mast of trees, to hunt their prey in deserts, and to perish under the paws of animals stronger and fiercer than themselves.

7

Wit and Learning were the children of Apollo, by different mothers : Wit was the offspring of Euphrosyne, and resembled her in cheerfulness and vivacity : Learning was born of Sophia, and retained her seriousness and caution. As their mothers were rivals, they were bred up by them from their birth in habitual opposition, and all means were so incessantly employed to impress upon them a hatred and contempt of each other, that though Apollo, who foresaw the ill effects of their discord, endeavoured to soften them, by dividing his regard equally between them, yet his impartiality and kindness were without effect ; the maternal animosity was deeply rooted, having been intermingled with their first ideas, and was confirmed every hour, as fresh opportunities occurred of exerting it. No sooner were they of age to be received into the apartments of the other celestials, than Wit began to entertain Venus at her toilet, by aping the solemnity of Learning, and Learning to divert Minerva at her loom, by exposing the blunders and ignorance of Wit.

8

Our defects and follies are too often unknown to us ; nay, they are so far from being known to us, that they pass for demonstrations of our worth. This makes us easy in the midst of them, fond to show them, fond to improve them, and to be esteemed for them. Then it is that a thousand unaccountable conceits, gay inventions, and extravagant actions, must afford us pleasures, and display us to others in the colours which we ourselves take a fancy to glory in. Indeed there is something so amusing for the time in this state of vanity and ill-grounded satisfaction, that even the wiser world has chosen an exalted word to describe its enchantments, and called it 'The Paradise of Fools'.

9

It is indeed much easier to describe what is not humour, than what is : and very difficult to define it otherwise than as Cowley has done wit, by negatives. Were I to give my own notions of it, I would deliver them after Plato's manner, in a kind of allegory, and by supposing Humour to be a person, deduce to him all

his qualifications, according to the following genealogy. Truth was the founder of the family, and the father of Good Sense. Good Sense was the father of Wit, who married a lady of collateral line called Mirth, by whom he had issue Humour. Humour therefore being the youngest of this illustrious family, and descended from parents of such different dispositions, is very various and unequal in his temper ; sometimes you see him putting on grave looks and a solemn habit, sometimes airy in his behaviour and fantastic in his dress ; insomuch that at different times he appears as serious as a judge, and as jocular as a Merry-Andrew. But as he has a great deal of the mother in his constitution, whatever mood he is in, he never fails to make his company laugh.

10

The task of an author is, either to teach what is not known, or to recommend known truths by his manner of adorning them ; either to let new light in upon the mind, and open new scenes to the prospect, or to vary the dress and situation of common objects, so as to give them fresh grace and more powerful attractions, to spread such flowers over the regions through which the intellect has already made its progress, as may tempt it to return, and take a second view of things hastily passed over, or negligently regarded.

11

It is very hard for the mind to disengage itself from a subject on which it has been long employed. The thoughts will be rising of themselves from time to time, though we give them no encouragement ; as the tossings and fluctuations of the sea continue several hours after the winds are laid.

12

How are we tortured with the absence of what we covet to possess, when it appears to be lost to us ! What excursions does the soul make in imagination after it ! and how does it turn into itself again, more foolishly fond and dejected at the disappointment ! Our grief, instead of having recourse to reason, which might restrain it, searches to find a further nourishment. It calls upon memory to relate the several passages and circumstances of satisfaction which we formerly

enjoyed ; the pleasures we purchased by those riches that are taken from us ; or the power and splendour of our departed honours ; or the voice, the words, the looks, the temper, and affections of our friends that are deceased. It needs must happen from hence that the passion should often swell to such a size as to burst the heart which contains it, if time did not make these circumstances less strong and lively, so that reason should become a more equal match for the passion, or if another desire which becomes more present did not overpower which I had when I fell into a kind of vision.

13

There are two kinds of immortality : that which the soul really enjoys after this life, and that imaginary existence by which men live in their fame and reputation. The best and the greatest actions have proceeded from the prospect of the one or the other of these ; but my design is to treat only of those which have chiefly proposed to themselves the latter as the principal reward of their labours. It was for this reason that I excluded from the tables of fame all the great founders and votaries of religion and it is for this reason also that I am more than ordinarily anxious now to do justice to the persons of whom I am now going to speak ; for since fame was the only end of their enterprises and studies, a man cannot be too scrupulous in allotting them their due proportion of it.

''سخندان فارس'' پر مزید روشنی

(۱)

اس مضمون کا مقصد ''سخندان فارس'' کا علمی یا ادبی جائزہ نہیں ، بلکہ صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ اطلاعات جو اس تصنیف کے حصۂ دوم کے چھٹے ، ساتویں اور کسی حد تک پہلے باب میں مندرج ہیں اور جن کا تعلق اہلِ ایران کی زندگی ، رسم و رواج اور موسمیات تک ہے ، کہاں سے اور کیسے حاصل کی گئی ہیں ؟ اور وہ کس حد تک ایرانی تاریخ و تمدن اور جغرافیائی حالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں ؟

بادی النظر میں یہ جستجو کچھ بے کار سی دکھائی دے گی ، کیوں کہ جس قرینے اور خوش اسلوبی سے یہ مواد پیش کیا گیا ہے ، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف سنی سنائی باتیں نہیں لکھ رہا ، بلکہ اپنے ذاتی مشاہدات پیش کر رہا ہے - یہ تصاویر کچھ ایسی کشش رکھتی ہیں کہ ان کے نقوش ہمیشہ کے لیے قاری کے ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں - ظاہر ہے ایسے حقیقت آگیں مرقعات محض تخیل کی بنا پر تیار نہیں ہو سکتے - ہم محسوس کرتے ہیں کہ آزاد نے جو کچھ دیکھا ہے ، وہی لکھا ہے -

علاوہ ازیں مصنف نے جا بجا نہایت واضح الفاظ میں اپنے ذاتی تجربات کا بھی ذکر کیا ہے ، جس سے یہ نظریہ کہ مصنف چشم دید واقعات اور حالات بیان کر رہا ہے ، مزید

تقویت حاصل کر لیتا ہے - ادبی اور لسانیاتی اعتبار سے آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ اس حقیقت کا کشف کرنا اور اس کا ثبوت بہم پہنچانا ہے کہ کسی زبان کی تشکیل میں اس کے جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی ماحول کو کتنا دخل ہوتا ہے۔ قدرتی اور ثقافتی ماحول اور لسانیاتی خصوصیات کی یہ تطبیق مستقل طور پر مصنف کے پیش نظر رہی ہے اور جب کبھی اور جہاں بھی، اسے یہ مماثلت دکھائی دیتی ہے، وہ پکار اٹھتا ہے کہ دیکھو! ایرانی زندگی کی فلاں خصوصیت کس خوبی سے اہل ایران کی زبان میں منعکس دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے نکات ملاحظہ ہوں:

۱ - ''بہرحال ایسے مضامین بار بار میرے اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ کسی زبان کا شائق جب تک برس دو برس تک خود اس ملک میں جا کر نہ رہے گا، تب تک نہ رمزِ سخن کو پا سکے گا، نہ زبان کا لطف حاصل کر سکے گا۔ ۔ ۔''

(صفحہ ۱۸۸)

۲ - ''میرے دوستو! جب تک ایسے ملکوں میں جا کر حالاتِ مذکورہ کو آنکھوں سے نہ دیکھے تب تک شعر مذکور اور اس قسم کے اشعار کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔'' (صفحہ ۱۸۰)

۳ - عزیزانِ وطن! جب تک ممالکِ سرد سیر میں رہ کر موسموں کی حالتیں آنکھوں سے نہ دیکھی ہوں، اکثر کتابوں کے خاص خاص مقاموں کا مزہ نہیں آتا، بلکہ سمجھ میں نہیں آتے۔ ۔ ۔''

(صفحہ ۱۸۷)

۴ - 'بوستان' میں شیطان کی تصویر اور شیطان کی گفتگو کی حکایت پڑھ کر میں حیران تھا - جب وہاں (ایران کے حماموں میں) جا بجا ایسی تصویریں دیکھیں ، اس حکایت کا مزہ آ گیا . . .'' (صفحہ ۱٦۷)

علاوہ ازیں ذیل کی تصریحات ملاحظہ ہوں :

(الف) میں ایک فصل بہار میں اسی ملک (ایران) میں تھا - چاندنی رات میں (بلبل) صحن کے درخت پر آن بیٹھتی تھی اور چہکارتی تھی تو دل پر ایک عالم گذر جاتا تھا . . . کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر اڑا دیا . . .'' (صفحہ ۱۸۲)

(ب) ''ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اسی ملک میں تھا -'' (صفحہ ۱۹۰)

(ج) ''کوہستان خراسان و ایران کے کوے دیکھے - چیل سے ذرا چھوٹے ہوتے ہیں -'' (صفحہ ۳۱ ، حصہ اول)

(د) ''ایران میں طلبا کو کتب الٰہیات عربی زبان میں پڑھتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ دیکھو ! خاک ایران کے فرزندوں کو اپنے بزرگوں کے مال کی خبر نہیں -'' (صفحہ ۱۴)

(س) ''اب کہ چالیس پچاس برس سے طہران دارالسلطنت ہے ، ۱۸۸۶ع کا جاڑا میں نے وہیں بسر کیا -'' (صفحہ ۱۷۸)

(ش) ''اب حال یہ ہے کہ مجتہدانِ حقیقی یعنی علمائے دیندار
کو تو بادشاہی معاملات کی کچھ پروا ہی نہیں ۔
علمائے دنیا دار عالمِ بے اختیاری میں تڑپتے ہیں ، کچھ
کر نہیں سکتے ۔ میں نے خود دیکھا ، چپکے چپکے
کہا کرتے ہیں : ''سلطنت اور حکم سلطنت حق امام
کا اور خزانۂ دولت مال امام کا ہے ۔ جب امام حاضر
نہیں تو ہم علماء وارث امام ہیں ۔'' (صفحہ ۱۳۱)

ان واضح تصریحات کی موجودگی میں قاری لا محالہ اس
نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ ابواب چشم دید واقعات پر مبنی
ہیں ۔ ان داخلی شواہد کے علاوہ ایسے خارجی شواہد بھی
جا بجا ملتے ہیں جن سے مندرجہ بالا نظریے کی تائید ہوتی ہے
اور ہم لازماً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ تمام بیانات مصنف
کے ذاتی مشاہدے کی پیداوار ہیں ۔ مثلاً مولوی عبدالحق
''مرحوم دہلی کالج'' میں لکھتے ہیں :

''مسٹر ٹیلر اور مسٹر سٹینر جان بچا کر بھاگے ۔ ۔ ۔ ۔
بہ ہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آئے اور
اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں گھس گئے ۔ اس
نے انھیں مولوی محمد باقر صاحب ، مولوی محمد حسین کے
والد ماجد کے گھر پہنچا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے روز
جب ان کے امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں عام
ہو گئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو ہندوستانی
لباس پہنا کر چلتا کیا ۔ مگر ان کا بڑا افسوس ناک
حشر ہوا ؛ غریب بیرم خان کی کھڑکی کے پاس جب
اس سج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اور اتنے

لٹھ برسائے کہ بے چارے نے وہیں دم دے دیا ۔ بعد میں مولوی محمد باقر صاحب اس جرم کی پاداش میں سولی چڑھائے گئے . . . مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا . . . مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اور کئی سال تک سر زمین ایران میں بادیہ پیمائی کرتے رہے ۔ جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آئے ۔''

یہ بیان درست نہیں کیوں کہ آزاد نے ''آب حیات'' (صفحہ ۱۵۲) میں لکھا ہے کہ وہ ۱۸۵۸ع میں لکھنؤ میں تھے ۔

بہرحال مولوی عبدالحق کے جاننے کے لیے یہ کافی تھا کہ ۱۸۵۷ع کے بعد آزاد ایران گئے تھے اور ''سخن دان فارس'' کا مواد انھوں نے وہیں سے حاصل کیا ہوگا ۔

اسی طرح آغا طاہر ''مکتوبات آزاد'' کے صفحہ ۱۳۰ پر لکھتے ہیں :

''ڈاکٹر لائٹنر ۱۸۷۶ع میں سنٹرل ایشیا میں پولٹیکل خدمات پر بھی گئے تو مولانا (آزاد) کو ساتھ لے گئے ۔''

مولوی خلیل الرحمان نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا :

''وہ (آزاد) پنڈت من پھول اور لائٹنر کے ہمراہ ایران اور ترکستان گئے ۔ آزاد اور من پھول نے فقیری بھیس کیا . . . آزاد نے ترکستان میں تنور بھی جھونکا اور روٹیاں بھی پکائیں ۔''

''سخن دان فارس'' (صفحہ ۴) پر آزاد لکھتے ہیں :

''انھیں کے لیے بمبئی گیا - پھر ایران تک سفر کیا - موبدوں اور دستوروں سے ملا -''

''نگارستان فارس'' کے اشتہار میں آغا طاہر لکھتے ہیں :

''مشرق زبانوں کے محقق نے ہندوستان اور پنجاب سے نکل کر ترکستان اور ایران تک تحقیق کا دامن پھیلایا - آخری سفرِ ایران کے بعد اپنے سفر کے حالات مولانا نے ایک دل چسپ لکچر میں خود بیان کیے ہیں -''

علاوہ ازیں وہ ''تمہید'' میں لکھتے ہیں :

''آپ نے ایران کے بھی سفر کیے، اور یہ آزاد کا جگر اور حوصلہ تھا کہ سفر کی مصیبتیں اور تکلیفیں جھیل کر فارس کی سر زمین میں پہنچے اور ''سخن دان فارس'' کا تحفہ بنایا -''

مولانا کی دیوانگی پر ان کی خدمات کے متعلق ایک رپورٹ محکمۂ تعلیم پنجاب میں تیار کی گئی تھی - اس میں لکھا ہے :

''اس کے بعد انھوں نے سنٹرل ایشیا اور ایران میں سفر کیا ، اور مولانا کی کچھ سیاسی خدمات بھی تھیں - اس سلسلے میں وہ وسط ایشیا اور ایران گئے - ایران کا سفر انھوں نے دوبارہ کیا . . . دوسرا سفر غالباً ۱۸۸۵ع میں کیا -''

اس رپورٹ کے ساتھ مولانا آزاد کے صاحب زادے آغا محمد ابراہیم کی ایک درخواست بھی انگریزی میں منسلک ہے ،

جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے :

''مولانا وسط ایشیا اور ایران تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے متنوع خدمات انجام دی ہیں ۔ یہ خدمات ایسی رازدارانہ نوعیت کی ہیں کہ ان کے متعلق کوئی سرکاری بیان ارسال کرنا مناسب نہ ہوگا ۔''

اس بارے میں رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے ان کی ملازمت کی تفاصیل دیتے ہوئے لکھا ہے :

''اس کے بعد وہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۵ع سے ۲۷ مارچ ۱۸۶۶ع تک یعنی تقریباً ۸ ماہ تک سنٹرل ایشیا اور ایران کے سفر پر رہے ۔''

پنڈت دتاتریہ کیفی نے مولانا کی وفات پر ''ادیب'' مارچ ۱۹۱۰ع کے شمارے میں لکھا :

''مولانا آزاد گورنمنٹ ہند کی پولٹیکل خدمات کے متعلق دیگر ممالک پر بھی کبھی کبھی مامور ہوئے تھے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ دو دفعہ افغانستان ، تاتار اور ایران گئے ... ان کی صحت عرصے[1] سے فرسودہ ہوگئی تھی ... اس پر ایران کے دوسرے سفر کی تکالیف ایزاد ہوئیں ۔''

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ بیانات ادھورے اور مبہم ہیں ۔ لیکن انھیں جانتے ہوئے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ مندرجہ بالا ابواب کا مواد ایران جا کر ذاتی تجربے سے حاصل کیا گیا ہے ۔

اب اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ آزاد ''سخن دان فارس'' کی تصنیف سے پہلے واقعی ایران تشریف

۱۔ 'عرصہ سیامت' غلط ہے ۔ دیکھیے صفحہ ۱۷۴ ۔

لے گئے تھے تو سارا معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یہ کتاب ایک معما بن جائے گی اور اس کی واشد کے لیے ہمیں مزید تحقیق سے کام لینا ہوگا ۔

اس مسئلے کو خاطرخواہ طور پر حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ''سخن دان فارس'' کی مختصر تاریخ درج کی جائے اور اس کے بعد آزاد کی دونوں سیاحتوں کا ، جن کا ذکر اوپر آیا ہے ، مجمل حال لکھا جائے ۔

سخن دانِ فارس : اس کتاب کے دو حصے ہیں ؛ پہلا حصہ دو لکچروں پر مشتمل ہے جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سنسکرت اور قدیم فارسی متحدالنسل زبانیں ہیں ۔ یہ دونوں لکچر ۱۸۷۶ع میں، رفاہ عام پریس لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ۔ دوسرا حصہ گیارہ لکچروں پر مشتمل ہے جو ۱۸۷۲—۷۳ع تک میں دیے گئے ۔ لیکن یہ مسودے کی حالت میں پڑے رہے ۔ ۱۸۸۵ع میں ایران سے مراجعت پر آزاد نے ان پر نظر ثانی شروع کی اور یہ کام اگست ۱۸۸۷ع میں ختم ہوگیا ۔ لیکن آزاد کی دیوانگی کی وجہ سے اس کی طباعت نہ ہو سکی ۔ آخرکار آزاد کے صاحب زادہ آغا محمد ابراہیم نے ۱۹۰۷ع میں اسے مفید عام پریس سے چھپوادیا ۔

آزاد کا پہلا سفر : یہ وسط ایشیا سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کی غرض و غایت اور تفاصیل بالکل معلوم نہ تھیں ۔ میں نے پہلی بار اپنے مقالہ[1] ''آزاد — اس کی حیات اور تصانیف'' مرتبہ ۱۹۳۹ع میں اس سفر کی نوعیت اجمالاً بیان کی تھی ، جس کا ماحصل یہ ہے :

۱- یہ مقالہ ۱۹۳۹ع میں انگریزی میں لکھا گیا تھا ۔

ان دنوں (۱۸۶۴ع کے بعد) روس کا بڑھتا ہوا رسوخ ہندوستانی سیاست کے لیے ایک مستقل کابوس تھا ۔ خیال کیا جاتا تھا کہ روس وسط ایشیا کے اسلامی ممالک کو اپنے حیطۂ اقتدار یا اختیار میں لاکر ہندوستان پر حملہ آور ہوگا ۔ چنانچہ اس کے سدباب کے لیے برطانوی حکومت نے ایران اور افغانستان سے معاہدے کیے ۔ روس نے پہلے خیوا کے حکمران پر یہ الزام لگایا کہ وہ روسی باشندوں کو غلام بنا کر فروخت کرتا ہے اور اس پر حملہ کر دیا ۔ لیکن یہ حملہ ناکام رہا ۔ جنگ کریمیا کے بعد روس نے پھر وسط ایشیا میں قدم بڑھائے اور ۱۸۶۴ع میں روس بڑھتے بڑھتے خیوا ، خجند اور بخارا کی حدود تک پہنچ گیا ۔

ان ممالک نے انگلستان اور ہندوستان سے مدد طلب کی ۔ چنانچہ ۱۸۶۴ع میں بمقام لاہور لارڈ لارنس اور سفیر خجند کی ملاقات ہوئی ۔ تین سال بعد بخارا کا سفیر بھی ہندوستان آیا ، لیکن یہ سفارت بھی ناکام رہی اور روس نے بخارا اور خجند پر قبضہ کر لیا ۔

برطانوی حکومت ان مخمصوں میں نہیں پھنسنا چاہتی تھی ؛ تاہم وہ خواہاں تھی کہ روس کے جارحانہ اقدامات سے جو واقعات ان ممالک میں رونما ہو رہے ہیں اُن کے متعلق قابلِ وثوق معلومات حاصل کرے ۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ ایک خفیہ مشن ان ممالک میں بھیجا جائے جو دورہ کر کے وہاں کے سیاسی حالات پر رپورٹ مرتب کرے ۔ یہ وفد تین چار اشخاص پر مشتمل تھا ۔ اس کا سربراہ پنڈت من پھول[1] کو مقرر کیا گیا ۔ آزاد کا انتخاب انھی کے ایما سے ہوا ۔

۱۔ دہلی کالج کے طالب علم تھے ۔ جنگ آزادی کے بعد پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی ہو گئے تھے ۔

اس سفر کا آغاز ستمبر ۱۸۶۵ع میں ہوا اور یہ نومبر ۱۸۶۶ع میں ختم ہوا ۔ آزاد لاہور سے کابل گئے ، وہاں سے دریائے جیحون عبور کرکے بخارا اور سمرقند گئے ، وہاں سے خجند ، کوکان اور مرغینان گئے ۔ یہ سب علاقے دریائے سیحون کے جنوب میں واقع ہیں ۔ پھر دریائے سیحون عبور کرکے تاشقند گئے ۔ غالباً واپسی پر بدخشاں کا سفر اختیار کیا جس کی نہایت دلچسپ روداد ''دربار اکبری'' میں درج ہے ۔

سیاحت ایران : اس کی تفصیلات ''سیر ایران'' میں درج ہیں ۔ ''لکچر'' اور ''روز نامچہ'' سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ایران پہلی بار تشریف لے جا رہے ہیں ۔ لکھتے ہیں :

> ''شیراز کے دیکھنے کا ارمان تھا ۔ ایک عمر کے بعد خدا نے پورا کیا ۔ اللہ اللہ ! خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن . . . اس کے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو ۔''

اور :

> ''جاڑے کا موسم ۔ کوہ کوہ برف سر پر لیے چلا آ رہا تھا ۔ بڑھاپے نے خوف کے لحاف سے دبک کر کہا کہ شیراز تو دیکھ لیا ، اصفہان کو دیکھو اور آگے بڑھو کہ تلاش کی منزل ابھی دور ہے ۔ غرض بارہ دن کے بعد اصفہان جا اترا . . . ایک وسیع سڑک سامنے آئی جسے سفید دیوداروں کی بلند قطاروں اور سر بفلک چناروں اور دو نہروں نے متوازی خیابانوں میں تقسیم کیا ہے ۔ بے اختیار زبان سے نکلا کہ زہے

سلاطینِ صفویہ ! بادشاہی ہو تو ایسی ہو ۔ خیابان مذکور میں کئی میل چل کر وہ دریاے وسیع آیا جسے زندہ رود کہتے ہیں ۔ یہاں کتابوں میں اس کا نام پڑھ کر مزے لیا کرتا تھا ، اب دیکھا ۔ شہر اصفہان کی وسعت فی‌الحقیقت بہت فراخ ہے ۔ یہ شہر سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے . . . اصفہان سے پندرہ منزلیں طے کر کے طہران میں داخل ہوا . . .'' وغیرہ ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آزاد کی پہلی سیاحت صرف وسط ایشیا تک محدود رہی اور انھیں ایران جانے کا موقع پہلی بار ۱۸۸۵—۸۶ع میں ملا تو ملک ایران کی بابت وہ تمام چشم دید اطلاعات جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ، اور جن سے چھٹا اور ساتواں لکچر بھرے پڑے ہیں ، مصنف کو کیسے حاصل ہوئی تھیں ۔ یاد رہے کہ ایران پر یہ لکچر ۱۸۷۲—۷۳ع کے دوران میں دیے گئے تھے اور آزاد ایران ۱۸۸۵ع میں گئے تھے ۔

یہاں آزاد کی حمایت یا بریت میں کہا جائے گا : یہ درست ہے کہ یہ لکچر ۱۸۷۲—۷۳ع کے درمیان دے گئے تھے اور اس وقت تک آزاد ایران نہیں گئے تھے ، لیکن جیسا کہ آزاد نے خود لکھا ہے :

''جب بندۂ آزاد ایران سے آیا . . . مصلحت نے کہا کہ اس وقت ادھر کے خیالات تازے ہیں ۔ سب سے پہلے اسے (سخندان فارس) پورا کرنا چاہیے ۔ ناچار نظرثانی شروع کی ۔'' (تمہید سخندان فارس)

اس نظریے کے مطابق ایران کی بابت یہ تمام بیانات اصل نسخے میں موجود نہ تھے - سیاحت سے واپسی پر آزاد نے انھیں کتاب میں داخل کیا - لیکن یہ محض خیال آرائی اور خوش فہمی ہے - "سخندان فارس" کا مسودہ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد کے پاس موجود ہے اور میں نے اسے غور سے دیکھا ہے - یہ درست ہے کہ کہیں کہیں آزاد نے اصل پر بسیط اضافے کیے ہیں لیکن یہ اضافے[1] بیشتر علمی ہیں اور ذاتی تاثرات یا مشاہدات سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں - وہ بیانات جن کا میں ذکر کر رہا ہوں یا تو جوں کے توں اصل مسودے میں موجود ہیں یا ان میں نہایت مختصر اضافے کیے گئے ہیں -

مثال کے طور پر ذیل کی اطلاعات اصلی مسودے پر بڑھائی گئی ہیں :

"ایران میں طلبا کو کتب الٰہیات عربی زبان میں پڑھتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ دیکھو ! خاک ایران کے فرزندوں کو اپنے بزرگوں کے مال کی خبر نہیں - یہ اُن کے ہی علوم ، اُن کے ہی مطالب ، اُن کے دلائل ہیں اور عرب کے اُستادوں سے عربی الفاظ میں سیکھ رہے ہیں - کسی کو خیال نہیں آتا کہ یہ ہمارے گھر کا مال ہے - ایک زمانہ ہوگا کہ یہ مطالب اسی خاک پر اپنے الفاظ میں پھیل رہے ہوں گے . . ." (صفحہ ۱۴۳)

"اب کہ چالیس پچاس برس سے طہران دارالسلطنت ہے ، ۱۸۸۵ع کا جاڑا میں نے وہیں بسر کیا - سردی موذی نہیں -" (صفحہ ۱۷۸)

". . . . اور جی بے چین ہو جاتے ہیں - میں ایک

۱- یہ اضافے آگے قوسین میں دیے گئے ہیں -

فصل بہار میں اسی ملک میں تھا ۔ چاندنی رات میں (بلبل) صحن کے درخت پر آن بیٹھتی تھی اور چہکارتی تھی، تو دل پر ایک عالم گزر جاتا تھا ۔ کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی ۔ کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر اڑا دیا ۔'' (صفحہ ۱۸۲)

یہ درست ہے کہ علمی مسائل کو ذہن نشین کرنے کے لیے یا ان بیانات کی مزید وضاحت کی خاطر آزاد نے بعض مقامات پر تفاصیل اور مثالیں بڑھا دی ہیں ۔ لیکن تمام کتاب میں مجھے ایک بھی ایسی اطلاع نہیں ملی جو بالکل نئی ہو اور جو اصل مسودے میں موجود نہ ہو ۔

اگر میرا طرز استدلال درست ہے تو پھر ہمیں اس معمے کا حل ڈھونڈنا ہے کہ ذیل کے بیانات (اور کتاب میں اسی نوعیت کے کئی بیان موجود ہیں) آزاد کو کیسے دست یاب ہوئے یا انھوں نے ان کا کیسے مشاہدہ کیا :

''اب حال یہ ہے کہ مجتہدانِ حقیقی یعنی علماے دیندار کو تو بادشاہی معاملات کی کچھ پروا ہی نہیں ۔ علماے دنیا دار عالمِ بے اختیاری میں تڑپتے ہیں . . . میں نے خود دیکھا چپکے چپکے کہا کرتے ہیں : ''سلطنت اور حکمِ سلطنت حق امام کا اور خزانہ دولت مال امام کا ہے ۔ جب امام حاضر نہیں تو ہم علما وارثِ امام ہیں ۔ بادشاہ نے ہمیں بے دخل کر رکھا ہے ۔'' (صفحہ ۱۴۱)

اصفہان کا ذکر کرتے ہوئے پہلے لکچر میں لکھتے ہیں :

''ان کی مہمان نوازی، ان کے آدابِ محفل، ان کی تعظیم و تکریم کے طریقے، ان کے گھروں کی آرائش، آج تک

علم تدبیر المنزل کے لیے نمونہ ہیں کہ کسی آئندہ لکچر میں ان کی تصویر کھینچ کر دکھاؤں گا ۔" (صفحہ ۲۰)

جب وہ خود "سیر ایران" مصنفہ ۱۸۸۶ع میں رقم طراز ہیں کہ "شیراز تو دیکھ لیا ، اصفہان کو دیکھو اور آگے بڑھو کہ تلاش کی منزل یہی ہے ۔" تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ۱۸۷۲ع میں وہ اُن اطلاعات کا کیسے ذکر کر سکتے ہیں جو انھیں پہلی بار ۱۸۸۶ع میں دست یاب ہوئیں ۔ لیکن یہ اطلاعات ان کے چھٹے اور ساتویں لکچر میں موجود ہیں ۔

علاوہ ازیں یہ معلوم کرنا ہے کہ مندرجہ ذیل اطلاعات آزاد نے کیسے حاصل کی تھیں :

"بازاروں کے ذکر میں یہ بات اہل وطن کو جتانے کے قابل ہے کہ خراسان (اور ترکستان) کے گانو گانو میں ہفتہ بہ ہفتہ یا ہفتہ میں دو دفعہ بازار لگتا ہے ۔ چو کوسی ، پنچ کوسی گانو کے لوگ ، کوئی گھوڑے پر ، کوئی گدھے پر ، کوئی پا پیادہ اندھیرے منہ گھروں سے چل کھڑے ہوتے ہیں ۔ اُن میں ہر قسم اور ہر پیشے کے لوگ ہوتے ہیں ۔ آٹھ نو بجے تک وہاں آن پہنچتے ہیں ۔ ادھر سے گانو کا بچہ بچہ بلکہ عورتیں بھی برقع اوڑھ اوڑھ کر نکلتی ہیں ۔ اپنا اپنا مال دیتے ہیں ، مبادلے میں اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لے جاتے ہیں ۔ گھوڑا ، گدھا ، گائے ، بھینس ، بکری ، دنبہ ، مرغی ، انڈے تک موجود ہوتے ہیں ۔ بڑھئی ، جلاہا ، درزی ، تیلی وغیرہ وغیرہ ، ہر قسم کا پیشہ ور اپنی چیزیں لاتا

ہے - باغ اور سر درختی والے اپنے میوے ، زمیندار اپنے غلے ، بلکہ اُن کا بھس تک لے آتے ہیں - گانو کی عورتیں اپنا کاتا ہوا سوت ، سی ہوئی ٹوپیاں لے نکلتی ہیں اور خدا کی شان ہے کہ کوئی کم بخت ہی ہوگا جو ناکام پھر کر جاتا ہوگا -" (صفحہ ۵۶-۱۵۵)

"ایران کے بازاروں میں (اور اکثر قہوہ خانوں میں) ایک شخص نظر آئے گا کہ سرو قد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق و شوق میں مست اسے گھیرے ہوئے ہے - وہ ہر مطلب کو نہایت وضاحت کے ساتھ نظم و نثر سے مرصع کرتا ہے اور صورت ماجرا کو اس تاثیر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے - کبھی ہتھیار بھی سجے ہوتا ہے - جنگ کے معرکے یا غصے کے موقع پر شیر کی طرح بپھر کھڑا ہوتا ہے - خوشی کی جگہ اس طرح گاتا ہے کہ سننے والے وجد کرتے ہیں - غرض کہ غیظ و غضب ، عیش و طرب یا غم و الم کی تصویر فقط اپنے کلام سے نہیں کھینچتا بلکہ خود اس کی تصویر بن جاتا ہے - اسے حقیقت میں بڑا صاحب کمال سمجھنا چاہیے ، کیوں کہ اکیلا آدمی اُن مختلف کاموں کو پورا پور ادا کرتا ہے جو کہ تھیٹر میں ایک سنگت کر سکتی ہے -" (صفحہ ۱۵۸)

"خصوصیاتِ ملک کے ذکر میں اگر وہاں (ایران) کے حماموں کا ذکر نہ کیا تو کچھ کہا ہی نہیں - بڑے بڑے کمرہ در کمرہ اور حجرہ در حجرہ لداؤ کی عمارتیں ،

چونہ گچ کی دیواریں ، زمین بھی اسی سے پختہ یا سلوں کا فرش ، نامی بادشاہوں کے دربار اور ملاقاتوں کے جلسے ، ان کے جنگی معرکے سب عالم تصویر میں عیاں ہوتے ہیں ۔ 'بوستاں' میں شیطان کی تصویر اور شیطان کی گفتگو کی حکایت پڑھ کر میں حیران تھا ۔ جب وہاں جا بجا ایسی تصویریں دیکھیں ، اس حکایت کا مزا آ گیا ۔ حمام میں اکثر دوست آشنا مل کر جاتے ہیں ۔ پہلے کمرے میں داخل ہوتے ہیں ، سماوارچی چاء تیار لیے بیٹھا ہوتا ہے ۔ وہاں بیٹھ کر ایک حقہ پیا ۔ ایک ایک پیالی چاء کی پی ۔ مزاج میں گرمی آئی ۔ دوسرا کمرہ 'جامہ کن' کہلاتا ہے ۔ وہاں جا کر کپڑے اتارے ۔ ایک حقہ اور پیا اور طبیعت گرمائی ۔ پھر حمام کے کمرے میں داخل ہوئے ۔ طبیعت میں عجیب فرحت اور مستی پیدا ہوتی ہے کہ بغیر شعر خوانی اور ترنم کے رہا نہیں جاتا ۔ تماشہ یہ ہے کہ ان کمروں میں معمولی آواز سے بھی باتیں کرو تو ایسی گونجتی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی ۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ سکندر نامہ میں : ع "سرودی بگرمابہ در گفتہ گیر" کا یہ مطلب ہے ۔ ایک ایک آدمی کو کئی کئی حامی لپٹ جاتے ہیں ۔ کوئی پانی ڈالتا ہے ، کوئی کیسہ کر کے ملتا ہے ، کوئی مشتمال کرتا ہے ، کبھی بٹھا کر اور کبھی لٹا کر ، کبھی دائیں کروٹ اور کبھی بائیں کروٹ ۔ اس اس طرح کل کل دباتے ہیں کہ عمر بھر کی کلفتیں اتر جاتی ہیں ۔ نہانے کے بھی کئی کئی کمرے ہوتے ہیں ۔ سب میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے

حوض بھرے ہوئے۔ ہر کمرے میں پانچ پانچ چھے چھے آدمی بیٹھے نہا رہے ہیں اور سب کے سر منڈے ، گول گول یکساں ہانڈیاں عجب بہار دیتی ہیں - پہر بھر سے کم نہانے کا لطف نہیں ۔ نکلتے ہیں تو پھر اسی طرح کمرہ بہ کمرہ ٹھہرتے ہوئے اور دم لیتے ہوئے نکلتے ہیں ۔ دفعتاً نکلیں تو خدا جانے لقوہ ، فالج ، ذات الجنب کیا بیماری ہو جائے۔ نکلتے ہوئے بھوک کا یہ زور ہوتا ہے کہ پیٹ میں آگ لگ اٹھتی ہے ۔ وہیں کسی دکان میں چلے گئے، روٹی ، کلے پائے ، کباب ، شب دیگ لے کر کھائی اور لمبی لمبی ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے گھر چلے آئے ۔" (صفحہ ۶۸-۱۶۷)

"آفتاب آخر حوت پہ پہنچا اور موسم میں تبدیلی نظر آئی ۔ دل گھبرانے لگتے ہیں ، آمد بہار کی تاثیر سے زمین سانس لیتی ہے ، در و دیوار کے مسامات سے گرمی نکلتی معلوم ہوتی ہے ۔ اسے کہتے ہیں "زمین نفس دزده؟ میگیرد" - پھر چند روز کے بعد کچھ اس سے زیادہ ہوتا ہے کہ در و دیوار میں پسینہ سا بہتا ہے ۔ تب کہتے ہیں کہ "زمین نفس آشکار میگیرد" ساتھ ہی بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے ۔ ۲۱ یا ۲۲ مارچ کو نوروز ہوتا ہے ۔ یا تو درختوں پر پتوں کا نام نہ تھا ، سب شاخ بلور بنے کھڑے تھے اور زمین آسمان برف ہی برف نظر آتے تھے ، یا برف باری موقوف ہو جاتی ہے ۔ آٹھ دس دن کے بعد کبھی ایک آدھ دفعہ کوئی ہلکا سا جھالا پڑ گیا، پڑ گیا، ورنہ برف برطرف ، زمستان موقوف ۔ جہاں ہوتی ہے پانی ہو ہی جاتی ہے ۔ نہریں ، حوض ،

تلاؤ وغیرہ بلکہ اکثر دریا کہ جم کر آئینہ ہوگئے تھے وہ پگھلنے لگتے ہیں - نہروں کی نالیوں میں چپکے چپکے پانی سرسرانے لگتا ہے (پھر حوضوں کے اوپر کا تختہ کنارے کنارے سے پگل جاتا ہے - گویا حوض نے دھن کھول دیا - کناروں پر سبزہ - اور سبزہ میں کلیاں آجاتی ہیں - نظامی :

دھن نا کشادہ لب آبگیر
کہ آید لب غنچہ را بوے شیر

میرے دوستو! جب تک ایسے ملکوں میں جا کر حالتِ مذکور کو آنکھوں سے نہ دیکھیے، تب تک شعر مذکور اور اس قسم کے اشعار کوئی کیا سمجھ سکتا ہے -

اکثر شارح اور محشّیوں نے صفحے سیاہ کیے ہیں اور اصل مطلب کے سایے تک نہیں پہنچے - پھر دیکھ لو! انشا پردازی نے اپنے ملک کی حالت اور موسم کی کیفیت کو کیوں کر ظاہر کیا ہے) -

زمیندار اپنے کھیتوں پر آتے ہیں، باغ والے باغوں میں پہنچتے ہیں - باغیچے سب کے پاس ہیں - بعض کے گھروں میں چھوٹے چھوٹے خانہ باغ ہیں - غریب اپنے دوست آشناؤں کو لے کر انگوروں کی داربستیں باندھتے ہیں - درختوں کو چھانٹتے ہیں - کیاریاں صاف کرتے ہیں - درخت جو سوکھی جھاڑیاں نظر آتے تھے، ان میں پھر جان آتی ہے - اس طرح کہ آج صبح کو دیکھا ٹہنیوں پر برف نہیں رہی - کل صبح کو دیکھا تو سبزی کی تحریر معلوم ہوئی - دوسرے دن دیکھا تو ہری ہری کونپلیں - مگر سبزی بھی ایسی صاف شفاف کہ

آنکھوں میں طراوت آئے ۔ جس درخت کی طرف دیکھو زمرد کی ٹہنیاں بن گئیں ۔ آٹھ دس دن میں ہرا بھرا درخت لہلہا رہا ہے ۔ باغ و گلزار میں بلکہ گھر گھر کی کیاریوں میں گلاب کھل گیا ہے ۔ (در و دیوار پر سبزۂ خود رو بھی آگا تو ایک گل خود رو لیے آگا ۔ لوگ گھروں میں سکڑے بیٹھے تھے ، نکل کھڑے ہوئے ۔ بند کام جاری ہو گئے ۔ آسودہ حال لوگ گھوڑوں پر چڑھے ، دوست آشناؤں کو لے کر باغوں میں گئے ۔ بہاریں منائیں ۔ عورتیں بھی باغوں اور کھیتوں میں گئیں اور دل خوش کرنے لگیں ۔ جس شخص کے دل پر یہ خیالات چھائے ہیں ۔ خاقانی کے بہاریہ قصیدے کا اسی کو مزہ آئے گا :

نو روز برقع از رخ زیبا بر افگند
برگستوان بہ دلدل شہبا بر افگند)

نوروز اپنے رخِ رنگین سے برف کا برقع الٹ دیتا ہے ۔ یا پری روؤں کے رخِ زیبا سے کہ جو برف کے سبب سے لحافوں میں دبکے بیٹھے تھے ۔ ہر طرح لطف زیاد بر زیاد ہے ۔

ادھر گلاب کھلا ، ادھر بلبل ہزار داستان اس کی شاخ پر بیٹھی نظر آئی ۔ بلبل نہ فقط پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے اور چہچہے کرتی ہے ۔ اور گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہے کہ بولتی ہے ، بولتی ہے ، بولتی ہے ۔ حد سے زیادہ مست ہوتی ہے تو پھول پر منہ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کرکے زمزمہ کرتی رہ جاتی ہے ۔ تب معلوم ہوتا ہے

کہ شاعروں نے جو اس کے اور بہار کے اور گل و لالہ
کے مضمون باندھے ہیں ، وہ کیا ہیں اور کچھ اصلیت
رکھتے ہیں یا نہیں ؟ وہاں گھروں میں نیم کیکر کے
درخت تو ہیں نہیں - سیب ، ناشپاتی ، بہی ، انگور کے
درخت ہیں - چاندنی رات میں کسی ٹہنی پر آن بیٹھتی
ہے اور اس جوش و خروش سے بولنا شروع کرتی ہے
کہ رات کا کالا گنبد پڑا گونجتا ہے - وہ بولتی ہے اور
اپنے زمزمے میں تانیں لیتی ہے - اور اس زور شور سے
بولتی ہے کہ بعض موقع پر جب چہہ چہہ چہہ کر کے
جوش خروش کرتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا
سینہ پھٹ جائے گا - اہل درد کے دلوں میں سن کر درد
پیدا ہوتا (اور جی بے چین ہو جاتے ہیں - میں ایک
فصل بہار میں اسی ملک میں تھا ، چاندنی رات میں صحن
کے درخت پر آن بیٹھتی تھی اور چہکارتی تھی تو دل پر
ایک عالم گذر جاتا تھا - کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی -
کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر
اڑا دیا) - یہ موسم دلوں میں جوش پیدا کرتا ہے -
چنانچہ جب چاندنی رات ہوتی ہے تو چند آشنا ، ہم طبع،
ہم نفس زندہ دلی کی امنگ میں آ کر کہتے ہیں: ''بیائید
امشب شب گل کنیم -'' باغ جاتے ہیں ، رات کو وہیں
رہتے ہیں ، بہار مناتے ہیں اور زندگی کی بہاریں لوٹتے
ہیں''- (صفحہ ۸۲-۱۷۹)

یہاں ایک بات قابل غور ہے ؛ اگر آزاد کا تمام بیان
ذاتی مشاہدے پر مبنی تھا تو اس میں ''میں ایک فصل بہار
میں اسی ملک میں تھا'' اصل پر بڑھانے کی کیوں ضرورت

محسوس ہوئی ؟ ظاہر ہے کہ یہ اضافہ سیاحتِ ایران کے بعد مسودے پر نظرثانی کرتے ہوئے کیا گیا ۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس سے پہلے آپ نے ایران کا وہ حصہ ، جس کی آب و ہوا وہ بیان کر رہے ہیں ، نہیں دیکھا تھا ؟ کیوں کہ اگر انھوں نے وہاں کی سیاحت پہلے بھی کی تھی تو اس اضافے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ؟

اگر اس بیان سے قاری کی تشفی نہ ہو تو ذیل کا اقتباس اسے ضرور قائل کر دے گا :

''ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اسی ملک (ایران) میں تھا ۔ برفیں پڑ رہی تھیں ۔ دو مہینے برابر سفر کرنا پڑا ۔ (دریائے سیحوں رستے میں ملا ۔ اس پار سے اس پار تک ایک تختہ آئینے کا تھا ۔ شتری اور اسپی قافلے ، پیادہ اور سوار ، برابر چلے جاتے تھے) ۔ میں ایک بلند کنارے پر کھڑا دیکھتا تھا ۔ چیونٹیوں کی سی قطار عجب بہار دیتی تھی ۔ رستے میں کئی منزلیں ایسی ملیں کہ جہاں سرا یا مکان کچھ نہ تھا کہ جہاں ذرا سر تو چھپا بیٹھیں ۔ زمین پر کمر کمر برف چڑھی تھی اور ادھر ادھر پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے ۔ ہم نے ایک پتھر کی آڑ میں برف ہٹا کر زمین نکالی ۔ ادھر ادھر سے دو چار لکڑ گھسیٹ لائے ، ان میں آگ سلگا لی ، بستر کرکے پڑے اور گٹھڑی ہو کر سکڑ رہے ۔ غنیمت یہ ہے کہ رات کو ہوا بند ہوتی ہے ۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے بعد اٹھ کر چائے بناتے ، ایک ایک پیالی پی کر سینے گرم کرتے ۔ اور پھر پڑ رہتے تھے ۔'' (صفحہ ۱۹۰-۹۱)

اس واقعے سے آزاد ایران کے موسم سرما کی شدت ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں - لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا آپ اس وقت ایران میں تھے ؟ دریاے سیحون ایران سے کالے کوسوں دور ، خجند اور کوکان کے شمال سے ہوتا ہوا بحیرۂ ارال میں گرتا ہے - یہ وسط ایشیا کا وہی علاقہ ہے جہاں آزاد پرچہ نویس کی حیثیت سے ۱۸٦۵ع میں تشریف لے گئے تھے - آزاد نے یہاں وسط ایشیا کی سردی کا سماں ایران سے منسوب کر دیا ہے -

آمدم بر سر مطلب ؛ میں نے آزاد کے پہلے ، چھٹے اور ساتویں ابواب کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آزاد نے جن رسم و رواج ، زندگی کے طور طریق اور موسموں کی خصوصیات کا مشاہدہ وسط ایشیا میں کیا ، انھیں ایران سے منسوب کر دیا ہے -

آزاد ۱۸۸۵ع سے پہلے کبھی ایران نہیں گئے تھے - لیکن ان لکچروں سے سات آٹھ سال پہلے وہ وسط ایشیا ہو آئے تھے ، اور وہاں کی بود و باش اور آب و ہوا کی خصوصیات کا انھیں پورا علم تھا - چنانچہ ان لکچروں میں ، جو ایران سے متعلق ہیں ، انھوں نے انھی تأثرات اور معلومات کو استعمال کیا ہے - آزاد نے ایسا کیوں کیا ؟ اس کا جواب اس مضمون کے آخر میں دیا جائے گا -

میں محسوس کرتا ہوں کہ سیاحتِ وسطِ ایشیا کی بابت خاص و عام جن غلط فہمیوں میں مبتلا تھے اور اسے سیاحتِ وسطِ ایشیا اور ایران کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ، اس میں ضرور آزاد کا اپنا بھی ہاتھ تھا - ایک تو وہ نہایت محتاط واقع

ہوئے تھے اور چھپانا چاہتے تھے کہ وہ وسط ایشیا ایک سرکاری مشن پر گئے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے خود اسے سیاحتِ ایران و توران بتایا ہوگا تاکہ لوگوں کے اذہان وسط ایشیا سے ایران کی طرف منعطف ہو جائیں ۔ علاوہ ازیں ان لکچروں سے ، جن میں وہ ایران میں اپنے ذاتی مشاہدات کا بار بار فخریہ اظہار کرتے ہیں ، اس امر کی اور بھی تصدیق ہوگئی ہوگی کہ اس سیاحت میں آزاد کی منزلِ مقصود ایران تھی ، نہ کہ وسط ایشیا ۔

اس طویل بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آزاد نے سیاحتِ وسطِ ایشیا کے مشاہدات کو ایران پر منطبق کر دیا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ مواد جو سیاحتِ وسط ایشیا سے تعلق نہیں رکھتا لیکن ان ابواب میں موجود ہے ، وہ انھیں کہاں سے ملا ؟ اس کی کیفیت اس مضمون کے اگلے حصے میں بیان کی جائے گی ۔

(۲)

''سخن دان فارس'' کے ان ابواب کا دوسرا اہم ماخذ مالکم[۱] صاحب کی ''تاریخ ایران'' ہے ۔ ان اطلاعات کے علاوہ ، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ، تقریباً تمام اطلاعات جو ''سخن دان فارس'' کے ان ابواب میں درج ہیں ، اسی تصنیف سے ماخوذ ہیں ۔ لیکن تین اقتباسات کے سوا ، جہاں آزاد نے اس تصنیف کی طرف اشارہ کیا ہے ، انھوں نے کہیں بھی اس سے استفادے کا ذکر نہیں کیا ۔ جیسا کہ آپ دیکھیں گے یہ اطلاعات بیشتر لفظی یا آزاد ترجمے پر مشتمل ہیں ۔ ہاں کہیں کہیں خوفِ طوالت سے آزاد نے مالکم کی طویل اطلاعات کا ماحصل

۱ ۔ جان مالکم برطانوی سفیر کی حیثیت سے ۱۸۰۰ع میں ایران گئے تھے ۔ ''تاریخ ایران'' (۱۸۱۵ع) دو ضخیم جلدوں میں ہے ۔

اپنے الفاظ میں درج کر دیا ہے۔ ذیل میں ''سخن‌دان فارس'' اور مالکم کی ''تاریخ ایران'' کے متوازی اقتباسات کو اسی ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے جس میں وہ ''سخن‌دان فارس'' میں درج ہیں :

''کرمان شاہاں کے پہاڑوں میں کوسوں تک پرانے ویرانے پڑے ہیں ، وہ شاہان قدیم کے جاہ و جلال کی مٹی ہوئی تصویریں ہیں ۔ انھی میں ایک مقام طاقِ بستان مشہور ہے اور دست کاریوں کے نقش و نگار میں ایک جگہ شاہ پور ذوالاکتاف کی تصویر ہے ۔ جو عبارت اس پر منقوش ہے ، ترجمہ اس کا یہ ہے :

''بندۂ خدا شاہ پور عزیز شہنشاہِ ایران و آایران کہ بہ سلسلۂ آسمانی پسر بندۂ خدا ہرمزد عزیز شہنشاہ ایران و آایران است و آن بہ سلسلۂ آسمانی پسر بزرگ شہنشاہ نرسی است ۔''

اس سے مراد ہے شاہ پور عزیز شہنشاہ ایمانیاں و غیر ایمانیاں ۔ کیونکہ ایر (مومن) آایر (غیر مومن) کو کہتے تھے ۔ اور یہ معنے ملا فیروز پارسی نے مالکم صاحب کو بتائے تھے ۔'' (صفحہ ۸)

At a distance of six miles from the modern city of Kermanshah the excavations from the rock, which are termed Tauk-e-bostan, present us with some figures... There are a variety of other sculptures at the Tauk-e-bostan; and the labour and knowledge of a French scholar has, by explaining a Pehlivi inscription, enabled us to identify two figures that are cut out of the

face of the rock, as Shahpoor Zoolactaf, and his son, Baharam.

1. Silvester de Sacey...had made the following translation of this inscription...

"This figure is that of a worshipper of Hormuzd, or God, the excellent Shahpoor, king of kings, of Iran and An-Iran, a celestial germ of a heavenly race, the son of the adorer of God, the excellent Hormuzd ; a king of kings, of Iran and An-Iran, a celestial germ of a heavenly race, grandson of the excellent Narses, king of kings."

I gave this inscription to Moullah Firoze, a learned priest of the Parsees at Bombay (writes Malcolm) and he assured me that the translation of de Sacey was correct. (Vol. I, pp. 257-259)

''قصر شیریں اور خرابۂ شاپور - خرابۂ استخر کہ شیراز کے پاس ہے اور اس کے علاوہ اکثر پہاڑوں میں شاہانِ قدیم کی شکارگہیں اور دربار منقوش ہیں - سواری اور سواری کے جلوس اور فوجیں چلی جاتی ہیں - ان سے فقط صنعت اور دستکاری کی باریکی ہی نہیں روشن ہوتی، بلکہ پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے، جو یکساں وردیاں پہنے جاتے ہیں، وہ خبر دیتے ہیں کہ ہمارے ملک کی جنگی فوج باقاعدہ تھی اور ہم قواعد جنگ کو علمی اصول سے کام میں لاتے تھے -'' (صفحہ ۱۸)

یہ بیان آن چار تصاویر پر مبنی ہے جو مالکم کی ''تاریخ ایران'' میں صفحہ ۲۵۸ اور ۲۵۹ کے درمیان لگائی گئی ہیں - پہلی دو تصویریں فوج اور رسالوں کی ہیں جن میں فوجی یکساں وردیاں پہنے کھڑے ہیں اور تیسری

اور چوتھی شکارگاہ کی تصاویر ہیں ۔

''طاق بستان کی تصویروں میں ایک مقام پر شاہپور اور اس کا باپ آمنے سامنے کھڑے ہیں ۔ ایک حلقے کو دونوں پکڑے ہیں ۔ اس سے کرۂ زمین کا اشارہ ہوگا ۔ ایک طرف زرتشت کی تصویر ہے ۔ اس کے چہرے سے پُر نورآفتاب کا تاج شعاعیں پھیلاتا ہے ۔'' (صفحہ ۱۸)

یہ تصویر ''تاریخ ایران'' کے صفحہ ۲۵۸ اور ۲۵۹ کے درمیان درج ہے ۔ مندرجہ بالا مضمون کا ماخذ ذیل کا اقتباس ہے :

We discover, in another part of this sculpture, a reptesentation of two sovereigns holding a ring, or circle .... A figure, supposed to be the prophet Zoroaster, stands by their side : his feet rest upon a star, and his head is covered with a glory, or crown of rays .... There is no doubt that this sculpture was executed in the reign of Baharam ... and that the figures represent that monarch, and his father, Shahpoor. The ring which they grasp is probably meant as a type of the world. (Vol. I, p. 259).

اوپر ذکر آیا ہے کہ ایک دو جگہ آزاد نے مالکم کی ''تاریخ ایران'' کا حوالہ دیا ہے ۔ ان میں سے ایک اقتباس یہ ہے :

''سیستان : خاندان رستم کا ملک موروثی ہے ۔ اگرچہ تمام بیابان ہے اور اکثر نیستان ہوگیا ہے ۔ لیکن کھنڈر اور خرابے اور ویرانوں کے نشان گواہی دیتے ہیں کہ دریائے ہیرمند کے کنارے کنارے دور تک

آبادی کو رونق دیتا چلا جاتا تھا ۔ اور مقاموں اور قبیلوں کے نام وہاں کے تاریخی حالات کی تصدیق کرتے ہیں ۔ ایک افسر انگریزی نے ۱۸۰۱ع میں علاقۂ مذکور میں سیاحت کی ہے ۔ اس نے سیستان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ شہر مذکور اپنے ویرانوں اور خرابوں کے بموجب چاہیے کہ کسی زمانے میں اصفہان کے برابر پھیلا ہوا ہو۔" (صفحہ ۲۰)

Seistan, the hereditary principality of the family of Roostum, is now almost a waste : but the remains of great cities along the fruitful banks of the Helmund, bear ample testimony to its former prosperity and glory : and the names of every spot, and of every family, tend to confirm those traditions which inform us that this region, which is now abandoned to a few wretched tribes, . . was once the proud abode of princes and of heroes.

The late Captain Christie . . . travelled through this province in 1810. He describes several remarkable ruins, particularly those of the cities of Poolkha and Dooshak, or Seistan. The latter, he states, must once have occupied as great a space as the site of Isfahan. (*Vol. I, p. 262*)

چھٹے باب کا موضوع اسلام کے بعد اہل ایران کے آداب و رسوم اور رہنے سہنے کے طریق ہے ۔ یہ باب علما کے اختیارات ، بادشاہوں کے جاہ و جلال ، رعب داب اور اہل شہر اور خانہ بدوشوں کے رہنے سہنے اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں پر مشتمل ہے ۔ یہاں

بھی بیشتر اطلاعات ہو بہو مالکم کی ''تاریخ ایران''
سے حاصل کی گئی ہیں ۔

شاہانِ صفوی کے عہد حکومت میں مجتہدین کے اقتدار کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں :

''شاہ عباس ماضی نے ایک عورت سے جبراً نکاح کرنا چاہا ۔ ایک بھائی کے سوا کوئی اس کا وارث نہ تھا ۔ مولانا احمد اردبیلی اس وقت مجتہد تھے ۔ عورت کا بھائی اُن کی خدمت میں پہنچا اور حال بیان کیا ۔ اُنھوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ کر دے دیا ۔ صورۂ رقعہ: ''برادرم عباس ! خواہر حامل رقعہ را بہ وے باز دہ ۔ فقط ۔'' شاہ نے اسی وقت تعمیل کی اور وہ خط فخریہً سب کو دکھایا کہ سرکار مولانا نے مجھے 'برادر' لکھا ہے ۔ پھر خزینہ دار کو دیا کہ اسے احتیاط سے رکھو ، دفن کے وقت میرے کفن میں رکھنا۔'' (صفحہ ۳۸-۳۹)

"We read, in the History of Abbas the Great, that a person complained to Moollah Ahmed, the Moostahed of Ardebil, that the king had taken his sister by force into his haram. The holy man immediately gave him a note to the following effect : "Brother Abbas, restore to the bearer his sister." The king commanded the woman to be instantly given up ; and, showing the note he had received to his courtiers, said aloud, "Let this be put into my shroud : for, on the day of judgment, having been called brother by Moollah Ahmed will avail me more than all the actions of my life." (Vol. II, p. 574)

شاہانِ ایران کی عظمت اور احترام کا ذکر کرتے ہوئے آزاد نے لکھا ہے :

"بادشاہ حال کے دادا فتح علی شاہ قجر نے اپنی تصویر حاکم سندھ کو بھیجی ۔ اس کا صندوق ایک خاص نہایت مکلف سواری میں رکھا ہوا ، فوج کے ساتھ اس توزک و احتشام سے گیا جیسے کوئی درگاہ جاتی ہے ۔ جس آبادی کے قریب پہنچتا تھا ، لوگ پیشوائی کو نکلتے تھے ، بڑی عظمت کے ساتھ لاتے تھے اور عید کی طرح خوشیاں منا کر روانہ کر دیتے تھے ۔ بوشہر میں پہنچا تو دریا بیگی کئی منزل استقبال کو گیا ۔ جب شہر میں داخل ہوا تو شلک سلامی سر ہوئی ۔

بادشاہی خلعت کسی حاکم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ ، خواہ شہزادہ ہو خواہ کوئی امیر ہو ، کئی میل تک استقبال کو آتا ہے ۔ ہر شہر کے پاس ایک مقام مقرر ہے ، اسے خلعت پوشاں کہتے ہیں ، وہاں ٹھہرتا ہے ۔ شہر کے لوگ جمع ہوتے ہیں ، دھوم دھام کا دربار ہوتا ہے ، وہاں خلعت پہنتا ہے ۔

دربارِ شاہی کے آئین و آداب دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے ۔ تمام شہزادے اور امرائے دربار ، اپنی اپنی جگہ با ادب کھڑے ، سب کی نگاہیں بادشاہ کی طرف ، خاموش ، بے حرکت ، گویا بدن میں جان نہیں ۔ کسی سے کچھ کہتا ہے تو اس طرح کہ فقط ہونٹ ہی ہلتے معلوم ہوتے ہیں ۔ جس کو بلاتا ہے ، وہ کئی کئی قدم پر آگے بڑھتا ہے اور تھم جاتا ہے ، گویا بار بار اجازت چاہتا ہے کہ بڑھوں یا نہ بڑھوں ؟ بادشاہ گفتگو کرتا

ہے تو اپنے تئیں غائب تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''شاہ فرمان میدہد ، شاہ میفرماید ، شاہ خواہش دارد۔'' وزرا و امرا 'قبلۂ عالم' کہتے ہیں اور غائب ہی تعبیر کرتے ہیں ۔ قبلۂ عالم کا حکم ہو تو اس طرح کیا جائے ۔ اور قبلۂ عالم کی اجازت ہو تو اس طرح عمل میں آئے ۔'' (صفحہ ۴۳-۲۴۲)

... everything connected with the royal name or authority is treated with a respect that is increased by the form which attends it. If the king sends an honorary dress, the person for whom it is intended must proceed several miles to meet it, and clothe himself in his robes of favour with every mark of gratitude and submission.... A short time ago a picture of the reigning monrach was sent to the ruler of Scind. It was enclosed in a case, and nailed down on a litter carried by two mules: but, though not visible. it was deemed entitled to the respectful homage of his subjects in those countries through which it passed. On the approach of this picture to Abusheher, the governor of that port, with all his troops and attendants, went a stage to pay his obeisance. When it came near, they dismounted from their horses and walked forward to meet it on foot : the governor kissed the conveyance, in token of his devotion to that which it contained, and accompanied it to Abusheher, where it was welcomed with salutes.

(1) *The princes of the royal family are not exempted from paying this mark of respect. There is, in general, a place in the vicinity of the provincial capitals called Khelat-posh, which means "putting on the honorary*

dress;" to which the governor, or other officer, who receives it, must proceed, to be invested with it. The Khelat-posh, near Shiraz, is a distance of four miles on the Isfahan road. (Vol. II, pp. 564—66)

There is no court where a more rigid attention is paid to ceremony than at that of Persia. The looks, the words, the motion of the body, are all regulated by the most strict observance of form. When the king is seated in public, his sons, ministers, and courtiers, stand erect, with their hands crossed, and in the exact place of their rank. They watch the looks of the sovereign, and a glance is a mandate. If he speaks to them, you hear a voice reply, and see their lips move, but not a motion nor gesture betrays that there is animation in any other part of there frame. The monarch, in speaking, often uses the third person, commencing his observation with, "The king is pleased," or "The king commands". His ministers, in addressing him, usually style him "The object of the worlds's regard." (Vol. II, pp. 554-55).

If the king desires to speak to a person at a distance, he commands him to advance; but this command must always be repeated several times, for the person addressed, as if fearful of coming too near, stops at every three or four steps. (Vol. II, p. 554).

اس کے بعد آزاد نے جشن شاہی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :

"جب کوئی جشن ہوتا ہے تو طلسمات کا عالم ہوتا ہے ۔ انگریزی سیاح اپنے سیاحت ناموں میں لکھتے ہیں

کہ آسمان اس شکوہ و شان کے ساتھ دربار ایرانی کے مقابل میں ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ تخت مرصع پر جواہرات جگمگ جگمگ کرتے ہیں کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ شاہ اس پر بیٹھتا ہے۔ اراکین دربار دو طرفہ عالم تصویر! میر غضب، دیو پیکر گرز کندھوں پر دھرے حکم کے منتظر سامنے کھڑے رہتے ہیں کہ ادھر اشارہ ہوا اُدھر ہاتھوں ہاتھ اڑا کر لے گئے۔ فرشتہ ہائے عذاب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ڈراؤنی صورتیں دیکھ کر زُہرہ پانی ہوتا ہے۔ کئی میل تک دو طرفہ فوج کھڑی ہوتی ہے، مگر چپ چاپ، دم بخود۔ جاہ و جلال، رعب داب، عظمت و وقار کا یہ عالم کہ گھوڑے کا کان تک ہلتا نظر نہیں آتا۔ ایسے دھوم دھام کے دربار جشن پر ہوتے ہیں یا جب دولِ خارجہ میں سے کسی کا بالیوس آتا ہے تو اس کی ملازمت پر۔"

(صفحہ ۱۴۳-۴۴)

مالکم نے اپنی کتاب میں وزرائے خارجہ کی باریابی کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔ در حقیقت یہ آن کی اپنی باریابی کی تصویر ہے۔ آزاد نے ان کی تفصیلی رو داد کا خلاصہ پیش کیا ہے اور میر غضب کی ہیبت ناک تصویر پیش کرنے میں کسی حد تک "شاعرانہ تصرف" سے کام لیا ہے۔ مالکم نے صرف ادنٰی خدام کی موجودگی کا ذکر کیا ہے جو شاہی احکامات کی فی الفور تعمیل کرتے ہیں۔ مالکم کی کتاب سے ذیل کے اقتباسات میرے بیان کی تائید کرتے ہیں:

On extraordinary occasions nothing can exceed the splendour of the Persian court. It persents a scene of

the greatest magnificence, regulated by the most disciplined order. There is no part of the government to which so much attention is paid as the strict maintenance of those forms and ceremonies, which are deemed essential to the power and glory of the monarch ; and the high officers to whom this duty is allotted, are armed with the fullest authority, and are always attended by a number of inferiors, who carry their commands into the most prompt execution.

The arrival of a foreign embassy is deemed one of those occasions on which the king of Persia should appear in all his grandeur . . . The moment that he foreign minister) reaches the precincts of the royal abode, all is complete silence. The horses even, as if trained to the scene, hardly move their heads. (Vol. II, p. 555)

''سفر میں بادشاہ ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، کیوں کہ وہ شہسوار ہوتا ہے۔ بیماری کی ناچاری ہو تو تخت رواں پر جاتا ہے، آگے خچر کھینچتے ہیں۔ سفر کا خیمہ و خرگاہ بھی بڑی نمود و نمائش رکھتا ہے۔ سلاطین صفویہ سادات تھے، وہ عبا و عمامہ رکھتے تھے۔ قجر سپاہ گری کا فخر رکھتے ہیں، اس لیے ان کا لباس چست ہے، اور عمامہ کی جگہ پوست برہ کی کلاہ۔ سواری کے گھوڑے برق و باد سے باتیں کرتے ہیں۔ سونے چاندی کا ساز و یراق جواہرات سے مرصع ہوتا ہے۔ اس طرح کے بہت سے گھوڑے سجے سجائے کوتل بھی چلتے ہیں۔ ہر شہر کے حاکم اپنے اپنے طویلوں میں اچھے اچھے گھوڑے تیار کرتے ہیں اور وقت بوقت حضور میں بھیجتے رہتے ہیں۔'' (صفحہ ۱۴۴)

It has been before stated, that there are no wheel carriages in Persia. The monarch always rides, unless he be prevented by indisposition ; and then, if forced to move, he is carried in a litter that is suspended between two mules. The tents and portable pavilions of the King of Persia are very magnificent . . . .

The dress of the Suffavean kings was as splendid as that of the present monarch ; but the costume is much changed. It is now universally the fashion in Persia to wear the beard long, and the head is covered with a cap instead of a turban. The upper part of their garments are made to fit the body very close, but the lower is invariably loose.

There is no part of the establishment of a Monarch of Persia to which more attention is paid than his horses . . . . The finest colts, from every part of his kingdom, are sent to the king ; and from these he selects what are deemed the best, for his own riding. The charger on which he is mounted is richly caparisoned ; and a number of others, with gold-embossed saddles and bits, are led befor him, and form, when he is travelling, the most magnificent part of his state. (V. II, pp. 557-59)

ایران کے خانہ بدوشوں کی بابت بہت سی اطلاعات اسی کتاب سے حاصل کی گئی ہیں - ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں :

"یہ قدرتی مخلوق جنگلوں اور دروں میں بھی پھرتے چلتے رہتے ہیں - جہاں جاڑے کے لیے سرسبز جنگل اور اپنے لیے میوہ دار درخت اور شکار دیکھے ، وہیں سیہ

چادر یعنی کالی تنبوٹیاں ڈالیں اور آتر پڑے - یہ ڈیرے انہیں کے اونٹوں اور بکریوں کی اون کے ہوتے ہیں - ان کا کمسریٹ ان کے ساتھ لدا آتا ہے - وہ غلہ، سوکھے توت، سوکھے زرد آلو، اخروٹ، گوشت قاق (سوکھا گوشت)، سوکھا دہی ہوتا ہے - کچھ اس سے، کچھ جنگل کے ہرے میووں سے، کچھ تازے شکاروں سے اپنے تنوں کو تیار اور جانوں کو تازہ کرتے ہیں - ان کے قبیلوں کے سردار، جنہیں جوانی کی طاقت اور توانائی حوصلے دیتی ہے، شہروں میں جاتے ہیں، درباروں سرکاروں میں خدمتوں سے عظمتیں پاتے ہیں - بڈھے سردار ریش سفید کہلاتے ہیں اور اس شہر رواں کے حاکم یا بادشاہ جو سمجھو وہی ہوتے ہیں - ریش سفید کا سب ادب کرتے ہیں - وہ بھی سیدھی سادی وضع کے ساتھ ان میں انہیں کی طرح ملا جلا رہتا ہے - سب کی چادریں ہم رنگ اور یکساں ہوتی ہیں - البتہ ریش سفید کی چادر ذرا بڑی ہوتی ہے -

یہ جہاں آترتے ہیں چوکور قلعہ باندھ کر آترتے ہیں- آونٹ، گھوڑے، خچریں، دنبے ادھر اُدھر چرنے کو چھوڑ دیتے ہیں - جوان کچھ کام نہیں کرتے - اگر شکار نہ ہو تو دس دس بیس بیس مل بیٹھتے ہیں - ہنستے کھیلتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں اور حقہ آڑاتے ہیں - عورتیں گھروں پر رہتی ہیں، روٹیاں پکاتی ہیں، چرخے کاتتی ہیں، قالین ایسے ایسے بُنتی ہیں کہ مخمل کو گرد کر دیتی ہیں - بعض عورتیں بڈھوں اور اپنے بچوں کے ساتھ گلے چراتی ہیں - جب بہار کے موسم میں شہروں

کے مسافر گھروں سے نکلتے ہیں ، تو دیکھتے ہیں۔ آذر بائیجان اور کردستان کے دروں اور پہاڑوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رنگا رنگ مخلوق خدا سے موج مارتے ہیں۔ یہ صحرائی مخلوق اکثر دامن کوہ میں یا پہاڑ کے آس پاس ہی رہتے ہیں۔ جہاں بادشاہ یا دشمن کی طرف سے کچھ خطرہ معلوم ہوا ، جھٹ اسباب باندھا اور پہاڑوں میں گھس گئے۔'' (صفحہ ۳۷-۱۳۶)

The chiefs of these tribes, during peace, usually reside at court, or at provincial capitals; and leave their followers, whom they occasionally visit, to the direction of the elders of the different branches and families of the tribe . . . . They pitch their dark tents on the finest of those plains over which they have a right of pasture; and the encampment is usually on the bank of a rivulet, or a stream. It is commonly formed in a square; and the abode of the principal elder is only to be distinguished from that of the lowest man in the tribe by its size. All are made of the same coarse materials, and in the same shape. The horses, mules, and sheep, are turned loose, to feed around the encampment. While the young men, if not employed in hunting, are generally seen sitting in circles, smoking, or indulging in repose, the women are busily occupied with their domestic duties, or aiding aged men and boys in tending the flocks. It is the usage of these tribes, unless when very strong, to pitch their tents in the vicinity of a range of mountains, that their flocks and families may be within reach of a place of security on the occurrence of danger. Along the base of those hills which divide Kurdistan from Ader-

bijan and Irak, every valley is occupied, during the spring and summer, by the camps of these wanderers. (Vol. II, pp. 595-96)

The women were employed in baking, spinning, and weaving carpets ; while the men were, as usual, wandering idle or in search of game. (Vol. II, p. 602)

ذیل کے اقتباس میں آزاد نے عمداً اصل سے انحراف کیا ہے - یہ دوسرا موقع ہے جہاں آزاد نے مالکم سے استفادے کا ذکر کیا ہے :

''مالکم صاحب سفارت ایران پر گئے تھے - لکھتے ہیں کہ میں سیر و سفر کے عالم میں ایک مرغزار پر گزرا - سیہ چادریں ڈالے لوگ پڑے تھے - ایک عورت ہمیں دیکھ کر رستے پر آ کھڑی ہوئی - میرے ساتھ چند شرفا تھے - ایک نے اس سے پوچھا ''باجی ! شویت کجا ست؟'' ؟ اس نے کہا ''بہ شکار رفتہ'' - ایک نو دس برس کی لڑکی بھی اس کے برابر کھڑی تھی - ہم نے پوچھا کہ ''ایں کیست؟'' ؟ عورت نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا ''دختر من است'' - ہم نے کہا ''خدا پسرے دلاورت بدھد کہ برادر ایں دختر باشد -'' عورت مسکرائی - پاس ہی اس کی سیہ چادر تھی - وہاں اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا - اسے جا کر لگم دی اور ننگی پیٹھ لے آئی - بیٹی کو اشارہ کیا - لڑکی جھٹ لپک کر سوار ہوئی - ادھر آدھر دو تین کاوے دیے - سامنے ایک اونچا سا ٹیلا تھا کہ پتھروں سے سنگلاخ ہو رہا تھا - سرپٹ دوڑا کر اس پر چڑھ گئی - چوٹی پر پہنچی تو چلا کر للکاری - ایک ہاتھ

اونچا کیا اور بالکل نڈر ، بے خطر پھر اسی طرح دوڑائے چلی آئی ۔" (صفحہ ۱۵۰)

When riding near a small encampment of Affshar families, I expressed my doubts to a Persian noble, who was with me, regarding their reputed boldness and hardihood, and particularly of their skill in horsemanship. He immediately called to a young woman of a handsome appearance, and asked her in Turkish if she was not a soldier's daughter ? She said she was. "And you expect to be a mother of soldiers." was the next observation. She smiled. "Mount that horse," said he, pointing to one with a bridle, but without a saddle, "and show this European envoy the differnce between a girl of a tribe, and a citizen's daughter." She instantly sprung upon the animal, and, setting off at full speed, did not stop till she had reached the summit of a small hill in the vicinity, which was covered with loose stones : when there, she waved her hand over her head, and then came down the hill at the same rate she had ascended. Nothing could be more dangerous than the ground over which she galloped : but she appeared quite fearless and seemed delighted at having had an opportunity of vindicating the females of her tribe from the reproach of being like the ladies of cities. (Vol. II, pp. 614-15)

"یہ سب لوگ حقیقت میں لٹیرے راہزن ہیں اور اسی کو فخر سمجھتے ہیں ۔ آج کل کہ انتظام درست ہے ، بڈھے بڈھے مغل مل کر بیٹھتے ہیں ، چائیں پیتے جاتے ہیں ، حقے اڑاتے ہیں ، اگلے زمانوں کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں : "اے آغا ! وقت وقتے بود کہ ہر کس

شمشیری در کمر ، خونے در جگر ، اسپے بزبر ران
داشت ۔ البتہ میتوانست پارۂ از عمر بآرام بسر برد ۔
این زندگی نیست ۔ رسوائیست ، موت بہ ہزار درجہ بہتر
است ازین زندگی" . . . ان لوگوں کو بہت سے لوٹ
مار کے کارنامے اپنے بزرگوں کے یاد ہیں ۔ وہ فخریہ
بیان کیا کرتے ہیں اور کوئی کہتا ہو تو نہایت اشتیاق
سے سنتے ہیں ۔" (صفحہ ۱۵۰-۵۱)

The wandering tribes of Persia are all plunderers ; and they glory in admitting they are so. They are continually recounting their own successful acts of depredation, or those of their ancestors . . . . Every sentiment that escapes them evinces their attachment to their predatory habits. They often regret the internal tranquillity of their country ; and speak, with rapture, of those periods of confusion, when everyman who, to use their own expression, "had a horse, a sword, and a heart, could live in comfort and happiness." (Vol. II, p. 599).

"فتح علی شاہ (بادشاہ حال کے دادا) کا زمانہ تھا کہ وزیر
مختار دولت فرنگ کا سیاحت کو اٹھا ۔ منزل بہ منزل
سیر کرتا ہوا جاتا تھا ۔ وزیر مختار کی اردلی میں ایک
دستہ اپنے سواروں کا رہتا ہے ، وہ بھی ساتھ تھا ۔ اس
دستے کے سوار لرستان کے رہنے والے فیلی اور لک ،
بیابان گرد قبیلوں کے لوگ تھے ۔ صاحب نے انھیں
قواعد سکھائی تھی ۔ ان کی وردی یکساں ، گھوڑوں کے
زین ، ساز و یراق سب یکساں ، سوار قواعد کے پابند ،
چپ چاپ ، بت بنے چلے جاتے تھے ۔ گھوڑے بھی برابر

قدم ملائے تھے ۔ ساتھ ایک شاہی سردار تھا ۔ اس کے رفیق اور نوکر چاکر بھی ہمراہ تھے ۔ یہ بھی اور رستے کے لوگ بھی دستۂ مذکور کی حالت کو چشمِ تعجب سے دیکھتے تھے ۔ سردار شاہی کے مصاحبوں میں بہ موجب رسم کے ایک مسخرہ بھی تھا ۔ رستے میں صاحب اس سے باتیں کرکے دل خوش کرتے جاتے تھے ۔ ایک گانو کے پاس کو گزرے ۔ لوگ آبادی سے نکلے اور تماشا دیکھنے کو آن کھڑے ہوئے ۔ مسخرے نے صاحب سے سواروں کی تعلیم کی بہت تعریف کی ۔ پھر پوچھا کہ انھیں کتنی مدت میں قواعد سکھائی ہوگی ؟ صاحب نے کہا کہ فقط چھ مہینے میں ۔ اس نے کہا کہ یہ چھ مہینے کی محنت کہو تو ایک دم میں برباد کر دوں ! صاحب نے کہا کیوں کر ؟ وہ جھٹ گھوڑا اڑا کر چلا برابر میں ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا ۔ زمزمے کی آواز لگاتا ہوا اس پر چڑھ گیا ۔ اکثروں کے خیال ادھر متوجہ ہوئے ۔ جب دستۂ مذکور ٹیلے کے برابر میں آیا ۔ مسخرے نے ایک ہاتھ اٹھایا اور اپنی آہنگِ ایرانی میں لہکار کر کہا :

ای جوانان لرستان ! بشنوید از من کہ من
یاد دارم داستانہا از نیاگان شما

بزرگوں کی مردانگی کا نام سن کر سب کے کان کھڑے ہوئے ۔ اس نے دوبارہ پڑھا ؛ یا تو سب برابر باقواعد چلے جاتے تھے یا قواعد کو چھوڑ ، صفوں کو توڑ پھوڑ ، سب کے سب گھوڑے مار کر ادھر بھاگے کہ

دیکھیں ہمارے بزرگوں کی کیا داستانیں سناتا ہے۔
دوسری طرف سے گانو والے دوڑے۔ مسخرے کو
چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہر شخص پاس کھڑا ہونا
چاہتا تھا کہ اچھی طرح سن سکے اور اسی واسطے
ایک دوسرے سے آگے بڑھا جاتا تھا۔ ولایتی گھوڑے
سرشور، سینکڑوں پاچھیاں چلنے لگیں، سوار گر گر
پڑے، گھوڑے چھٹ چھٹ گئے تماشائیوں نے مفت
چوٹیں کھائیں۔ عجب ہنگامہ ہوا۔ صاحب بےچارے
حیران کھڑے دیکھتے تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ مسخرہ
پھر ہنستا ہوا آیا اور کہا کہ صاحب! دیکھا، یہ
شعر وہ افسوں ہے کہ نادر کے بعد جب ملک میں
بدعملی ہوئی تو ایک شخص چند رفیق اور کئی گوے
ساتھ لے کر ایلیات میں گیا۔ اس کی برکت سے
پندرہ ہزار آدمی جمع کر لیے اور کئی ہفتے تک بادشاہ
بنا رہا۔" (صفحہ ۲-۱۵۱)

A Persian chief of a Kurdish tribe who remained several days with the British mission when it was in the vicinity of Kermanshah, had in his train a jester, who possessed very versatile and extraordinary talents. One day, upon the march, this fellow, addressing the English envoy, said, "You are, no doubt, very proud of the discipline you have established among your Persian servants, who march in your front in as regular a style as your own soldiers. "How long, sir," said the wit, "has it taken you to introduce this order among my countrymen ?" — "About six months," was the reply.—"Now," said he, "if you will permit me, you shall see that I will, in less than six minutes, destroy

all that you have done in six months." On leave being granted he immediately rode near the Persian horsemen, wh ، were leading the state-horses, and who had strict orders not to leave their ranks. He had noticed that these men were almost all of the Lac and Fylee tribes, whose chief residence is among the mountains of Louristan : and he began to sing, as if to himself, but in a clear and loud voice, a song, which commenced. "Attend to me ye sons of Louristan, I sing, of the glorious deeds of your forefathers." Before he had finished his song, to which all were listening with attention, the whole cavalcade was thrown into confusion by the kicking of horses, caused by the Persians having broke the line of mareh and crowded round to hear him more distinctly. The jester laughed most heartily at the success of his joke ; and, addressing the envoy, said : "Do not be distressed at the fate of your fine discipline, for I have heard of a man who, with no other means than the song I have just sung, collected an army, and was called a king for several weeks." (*1*) *This, I am assured, was the fact. A chief of no pretensions had, during the confusion that followed the death of Nadir Shah, gone about Louristan with some musicians and singers, who continually played and sung this favourite provincial air ; and he had actually, by this means alone, collecte l about five thousand followers, and proclaimnd himself king.* (*Vol. II, pp. 611-12*)

''ایران کا ایلچی ایک دفعہ ہندوستان کی طرف آیا ۔ اُس کے پیش خدمتوں میں ایسے ایسے کئی شخص تھے ۔ ایک ان میں بہت خوش مزاج تھا ۔ ایک صاحب نے

اس سے پوچھا کہ ''چہ طور یافتی شہر کالکتہ را''۔ ہنس کر کہا ''عجب جائیست برای چپاو'' مگر خوبی یہ ہے کہ چوری کو سخت عیب سمجھتے ہیں۔ کوئی خون کرکے آیا ہو اور آن کی سیہ چادر پر آ کھڑا ہو، اس کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ حاکم خود چڑھ آئے تو اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ وہ حاکم کی سزا کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ مائیں بچپن میں بچوں کو خواہ مخواہ سونٹے مارتی ہیں کہ بڑے ہو کر پٹنے کی عادت رہے۔'' (صفحہ ۵۳-۱۵۲)

یہ مواد ایک فٹ نوٹ سے لیا گیا ہے۔ مالکم لکھتے ہیں :

When I returned from Persia in 1801, I brought with me a man of some rank belonging to a tribe in Khoratsan, who desired to visit India. I was anxious that he should see and admire Calcutta, and sent a person to show him every part of that city. When he returned, I asked him what he thought of the capital of British India? Ajub jaee buraee chapou ast!" was his reply. "It is a noble place to plunder." (Vol. II, pp. 601-2.)

Though the highest of the military tribes of Persia are proud of being called plunderers, they hold in abhorrence the name of thieves.The English gentlemen, who had been told that this tribe were remarkable for being the greatest thieves in Persia, and that the children were beat daily by their mothers to accustom them to pain, that when they were caught stealing they might not be alarmed, by blows, into a confession of their accomplices, . . . (Vol. 11. p. 602.)

The tribes of Persia, as well as those of Arabia, boast,

that when once they pledge themselves to give protection, their word is inviolable. (Vol. II, p. 604.)

"باہمی مقدمات کا فیصلہ تانجوت (پنچایت) سے کرتے ہیں ۔ ریش سفید صدر انجمن یعنی سرپنچ ہوتا ہے ۔ جو فیصلہ اس کے سامنے ہو جائے ، رد نہیں ہو سکتا ۔ قبیلے کی امارت خاندان سے باہر نہیں نکلنے پاتی ۔ امیر مر جائے اور چھوٹے سے بچے کا بھی کہیں پتا لگ جائے تو وہیں سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں ۔ اپنے جنگل ، پہاڑوں میں لے جاتے ہیں اور ہاتھ چوم کر امیر بناتے ہیں ۔ اپنے امیر کے نام پر مال تو کیا ، جان تک دریغ نہیں کرتے ۔ بادشاہ کے لیے جمعیت کی ضرورت ہو تو اس طرح جان توڑ کر جمع نہیں ہوتے ۔ امیر پر وقت آ بنے تو پل کے پل میں چادر بچادر ، پہاڑ پہاڑ اور جنگل جنگل حکم پہنچ جاتا ہے اور سب اکٹھے ہو جاتے ہیں . . . . اپنے امیر کے مرنے کا بڑا ماتم کرتے ہیں ۔ اس کے گھوڑے کو سجاتے ہیں ، اس کی ٹوپی زین کے ہرنے پر رکھتے ہیں ۔ دونوں طرف دونوں موزے ، ایک طرف سپر ، ایک طرف تلوار لٹکاتے ہیں ، کمرپٹکا اس کے گلے میں لپیٹتے ہیں ۔ اس کی دم کتر دیتے ہیں اور جنازے کے ساتھ ساتھ گرد چکر دیتے ہوئے لیے چلتے ہیں ۔ آپ گریباں چاک ، ننگے سر ، راکھ منہ پر ملے ، روتے پیٹتے جاتے ہیں ۔ اس کے دوست بھی اپنے اپنے گھوڑے (کہ ان پر بھی ہتھیار دھرے ہوتے ہیں) اعزاز و احترام کے لیے بھیج دیتے ہیں ۔ یہ ایک عجیب وقت اور پُر تاثیر حالت ہوتی ہے ۔ راہ چلتے بھی

کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیکھ کر رونے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیم رسم ہے۔ ماوراءالنہر کے ترکانِ صحرا نشین میں بھی یہی دستور ہے۔"

(صفحہ ۷۲-۷۳ ز)

The attachment of the tribes of Persia to the families of their chiefs has been noticed. They will seldom consent to obey any other person : and instances often occur, where an infant is carried into the field, in order that the services of those who consider him as their only lawful leader may be obtained. If a general levy of the tribe be required for the service of the sovereign, it is effected with difficulty and delay ; but a call, connected with their own safety, or that of their chieftain, is promptly obeyed. On such occasions the signal to assemble flies, to use their own phrase, "from tent to tent, from hill to hill" they continue to preserve, at the funerals of chiefs and soldiers of high reputation, the usages of their more remote ancestors. The charger of the departed warrior, carrying his arms and clothes, accompaines the procession ; and it is not unusual for those who desire to show their respect for the deceased, to send a horse without a rider, but with arms upon his saddle, to swell the train of the mourning cavalcade. (Vol. II. pp. 605-6)

His clothes and arms are put upon his favourite horse ; the cap he wore is placed on the pique of his saddle ; the cloth with which he girded his loins is bound round the horse's neck, while the boots are laid across the saddle. (*Footnote, p. 606*)

I find from MS. of Meer Yusoof-u-deen, that the same usages prevail in Tartary. (Footnote, p. 606.)

''قومی عادت اور ملک کی حالت نے اب تک سب کو سپاہیانہ سامان میں رکھا ہے . . . . یہ خیالات ان کے دماغوں میں ایسے سمائے ہیں کہ جنگی داستانوں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں - کوئی تھوڑا سا پڑھا لکھا بھی ہوگا تو شاہ نامے کے شعر اسے جا بجا سے حفظ ہوں گے - سبب یہ ہے کہ جب چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں تو ایک شخص شاہ نامہ ضرور پڑھتا ہے ، سب سنتے ہیں -'' (صفحہ ۱۵۷)

The men of the wandering tribes delight to tell or listen to romantic tales ; some of them not only make themselves masters of this art, but learn to recite verses, particularly those of Ferdosi. A person who has cultivated this talent, enjoys a great share of the respect of his associates, who frequently call upon him to amuse an idle hour by transporting his hearers into the regions of fancy, or to excite their minds to deeds of valour, by repeating lines which celebrate the renown of their ancestors. (Vol. II, pp. 612-13)

مالکم نے ملک ایران کی آب و ہوا پر ایک جامع مضمون لکھا ہے ، آزاد کا بیان اس کی تلخیص ہے :

''عزیزان وطن ! حقیقت یہ ہے کہ زمین مذکور قدرت کا گلزار ہے - اور عجیب بات یہ ہے کہ روے زمین پر جو ہوا کا اختلاف اور موسموں کا فرق ملکوں میں ہوتا ہے ، وہ فرق اس کے قطعے قطعے میں آشکارا ہے -

چنانچہ بعض جگہ سخت گرم ہے ، بعض جگہ معتدل ہے یا سرد ہے ۔ اضلاع جنوبی میں کرمان ، یزد ، لارستان وغیرہ اضلاع گرم ہیں اور بعضے عرب کی طرح ریگستان ہیں ۔ گرمی میں سخت گرمی ہوتی ہے ۔ اور اول کے دو مہینوں میں آندھیاں چلتی رہتی ہیں ۔ جنگل کے جنگل ریت کے اڑتے ہیں ۔ مگر جاڑا اور بہار ایسے شگفتہ ہیں کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں ۔

فارس یعنی شیراز اور اس کے تمام متعلقات میں نہایت لطیف اور شگفتہ آب و ہوا ہے ۔ نہ سخت گرمی ہے ، نہ سخت سردی ۔ چھوٹی چھوٹی نہریں جاری ہیں . . . . پہاڑوں کے دامن ہرے ہیں اور پھولوں سے بھرے ۔ سعدی اور حافظ جیسی بلبلیں جہاں زمزمے کریں ، وہ خدائی باغ ایسا ہی ہونا چاہیے ۔ سرسبز پہاڑ اور لہلہاتے مرغزار ، صحرا نشین مخلوقات کو پالتے ہیں اور ان کے مویشی کو فربہ کرتے ہیں ۔ ان علاقوں میں غلے اور میوے دانے کی بہتات ہے ۔ جوں جوں شمال کو بڑھتے جاؤ ، آب و ہوا اچھی ہی ہوتی جاتی ہے ۔

اصفہان ایک زمانے میں پایۂ تخت سلاطین صفویہ کا تھا ، اب ویران کہلاتا ہے ۔ مگر سب آبادیوں سے زیادہ رونق دکھاتا ہے ۔ گرمی شیراز سے نرم ہے اور جاڑا زیادہ ہے ۔ سال بھر میں فقط کئی ہفتہ برف ہے ، باقی آسمان صاف ۔ برف بھی ایسی نرم کہ پڑی اور پانی ہوئی ۔ مینہ بھی کچھ سخت نہیں ۔ ہوا دیکھنے میں صاف اور اثر میں خشک ۔ صیقل دار چیز کو جہاں

چاہو رکھ دو ، زنگ نہیں لگتا - چاروں فصلیں شگفتہ بہار -

آذر بائیجان اور اس کے متعلقات مثلاً تبریز وغیرہ میں ایسا جاڑا پڑتا ہے کہ تھرما میٹر ۳۱ درجے پر آ جاتا ہے - اکتوبر میں شدت سے برف پڑنے لگتی ہے - جنوری میں یہ عالم ہوتا ہے کہ ابھی کٹورے میں پانی ڈالا ، ابھی جم گیا - بخاری کے پاس لکھنے پڑھنے کا سامان رکھتے ہیں - اس پر بھی دم بدم دوات جم جاتی ہے - شیشوں کے منہ بند ہوتے ہیں ، اس پر شربت اور عرق جم جاتے ہیں - انڈے ہانڈیوں اور قطیوں میں رکھتے ہیں ، مگر مارے سردی کے پھٹ پھٹ جاتے ہیں - تانبے کا آفتابہ رات کو باہر رہ جائے تو صبح کو ترق جاتا ہے - کھیتی کا یہ حال ہے کہ ہندوستان میں فروری میں کٹ جاتی ہے - پنجاب میں آخر مارچ اور اپریل میں - وہاں پندرہ جولائی کو کٹتی ہے - ہمدان میں بھی برف بہت ہے - کردستان اگرچہ جنوبی ملک ہے ، مگر زمین بلند ہے ، اس لیے سرد ہے -

شمالی ایران میں مازندران ، گیلان وغیرہ گرم بھی ہیں اور سیراب بھی ہیں - (جیسا ہند میں بنگالہ) - خراسان نہایت سرد ہے ، مگر جو علاقہ سیستان سے ملا ہوا ہے وہ نہایت گرم ہے - گرمی میں کئی کئی دن باد سموم کے ڈر سے باہر نہیں نکلتے -'' (صفحہ ۷۸-۷۶)

There is, perhaps, no region in the universe of its extent which has a greater diversity of climate . . . . In the

southern part of this kingdom, which includes those districts of the provinces of Kerman, Laristan, Fars and Khuzistan, that lie between the mountains and the shores of the Persian Gulf, the heat in summer is very great ; and it is increased by those sandy and barren plains with which this tract abounds, and which present to the eye of the traveller nearly the same prospects as those of Arabia. . . . During the two first months of summer a strong north-westerly wind prevails over the whole of this tract, which, at times, blows with such violence that it brings with it clouds of a light, impalpable sand, from the opposite shore of Arabia, a distance of more than two degrees. In the autumn the heats are more oppressive than in summer ; but in winter and spring the climate is delightful. . . .

The town and district of Shiraz, and the other parts of Fars above the mountains, enjoy a fine climate, and are neither subject to the oppressive heats of the lower and more southern parts of Persia, nor to that severity of cold which is experienced in the more elevated and northern provinces of that kingdom. . . .

The soil of the interior part of Fars is in general rich and productive. There are few large streams. but abundance of rivulets ; and while its more mountainous districts afford excellent pasture for the flocks of those tribes by which they are inhabited, the vallies near Shiraz, and the other towns of the province, produce almost every kind of grain and of fruit in the greatest abundance.

. . . . Isfahan, once the capital, and still the principal city of that kingdom, appears to be placed in the happiest temperature that Persia can boast. Its

inhabitants are strangers to that heat which is felt during some of the summer months, at Shiraz ; yet the winter is hardly more severe. Excepting a few weeks in the year, the sky of this favoured region is unclouded and serene. The rains are never heavy, and the snow seldom lies long upon the ground. The air is so pure and dry, that the brightest polished metal may be exposed to it without being corroded by rust.

In Aderbijan, the summer is warm and the winter very severe ; and in parts of Kurdistan, though situated more to the southward, so great is the effect of elevation, that the winter may be said to commneee with the autumn of the surrounding country.

. . .Khorasan has within itself every variety of climate: but all those districts which border upon the desert that streches from Irak to Seistan are arid, and subject to extreme heats : and in some parts the inhabitants are, during a few weeks in summer, complled to avoid exposure, lest they should be destroyed by the pestilential winds, or buried in the clouds of sand, with which they are often accompanied.

On the twentieth of October we had a heavy fall of snow . . . we had no excessive cold until the middle of December : from which period, till the end of January the thermometer, when exposed to the air at night, never rose above the zero ; and in our rooms, at mid-day, it seldom rose above 18°. January was by far the coldest month. The water became almost instantaneously solid in the tumblers upon the dinig table. The ink was constantly frozen in our inkstands, although the tables were quite close to the fire. For at least a fortnight not an egg was to be had, all being split by

the cold. Some bottles of wine froze, although covered with straw; and many of the copper ewers were split by the expansion of the water when frozen in them. (After May) the weather became very warm, and they began to cut their corn on the fifteenth of July. (Vol. II, pp. 504-510).

اگر ایران کی آب و ہوا واقعی اس قدر متنوع ہے تو ہم یہ پوچھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آزاد نے اسی باب میں ایران کے موسموں کی بہار پر جو کیف آور مضمون لکھا ہے، وہ ایران پر کیسے منطبق ہو سکتا ہے ؟ اور اگر وہ تمام ایران کے کسی خاص خطے سے تعلق رکھتا ہے تو وہ کون سا خطہ ہے ؟ اور آزاد وہاں کب تشریف لے گئے تھے ؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ دلآویز مناظر ان کے وسط ایشیا کے مشاہدات کے مرہون منت ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے یہاں یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ موسم سرما میں دریائے سیحون عبور کرنے والا ٹکڑا جو اوپر مندرج ہے، ایران کی 'زمستان' کے بیان سے لیا گیا ہے۔

(۳)

اس مضمون سے میرا مقصد محض ''سخن دان فارس'' کے مآخذ پر روشنی ڈالنا ہے۔ اس لیے میں نے یہ کوشش نہیں کی کہ ان تمام مطالب اور مضامین کا سراغ لگایا جائے جو ان دونوں مآخذ سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ ہاں اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ آزاد نے ان دونوں ماخذوں سے کہاں تک استفادہ کیا؟ تو میں کہوں گا کہ ہر وہ اطلاع جو مالکم صاحب کی تاریخ میں نہیں اور ''سخن دان'' میں موجود ہے وہ براہ راست یا بالواسطہ سیاحتِ وسط ایشیا سے تعلق رکھتی ہے اور ہر وہ بات جس

کا سراغ اس سیاحت سے نہیں مل سکتا ، وہ کسی نہ کسی شکل میں مالکم کی تاریخ میں موجود ہے ۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ، جو مالکم نے بر سبیل تذکرہ بیان کی ہیں ، آزاد نے تخیل کی رنگ آمیزی سے انھیں ایسے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ ذاتی مشاہدات معلوم ہوتی ہیں ۔ مثال کے طور پر مالکم نے لکھا ہے کہ داستان گوئی ایران میں ایک مستقل پیشے کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ لوگ کس طرح اپنی قوت بیان ، طرز ادا اور حرکات و سکنات سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں ۔ جیسا کہ آپ اوپر دیکھ آئے ہیں ، آزاد نے اسے ایک چشم دید واقعے کی صورت میں ادا کیا ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ آزاد نے دورِ سیاحت میں ایسے فن کاروں کے کمالات کا ذاتی تجربہ کیا ہو ۔ لیکن ان کا حال مالکم کی کتاب میں بھی موجود ہے ، اور چوں کہ آزاد نے بہت وسیع پیمانے پر اس کتاب سے استفادہ کیا ہے ، اس لیے بے جا نہ ہوگا کہ اسے اس کتاب کی خوشہ چینی سے تعبیر کیا جائے ۔ اگر آپ کو اس طرز استدلال سے اتفاق نہ ہو تو دوسری صورت میں لا محالہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ آزاد نے ایسے اشخاص کو وسط ایشیا میں دیکھا ہوگا ، نہ کہ ایران کے بازاروں میں ۔

رہے یہ سوالات کہ آزاد نے خالص ایران کی تہذیب و تمدن اور جغرافیائی حالات کی روداد کے لیے وسط ایشیا کے ذاتی مشاہدات کو کیوں استعمال کیا ، اور اس میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے اور ہم کہاں تک ان کے بیانات کو قبول کر سکتے ہیں؟ ضرور قابل غور ہیں ۔

میرا خیال ہے کہ جب آزاد وسط ایشیا تشریف لے گئے تو انھوں نے دیکھا ہوگا کہ ایرانی اور وسط ایشیائی تہذیب میں ایک گونہ مشابہت ہے - رسم و رواج ، لباس ، خوراک ، طرزِ زندگی ، ان سب میں انھیں ایرانی تہذیب کی جھلکیاں دکھائی دی ہوں گی - کہا جائے گا کہ جب وہ اس سے پہلے ایران گئے ہی نہیں تھے اور وہاں کی زندگی کا انھیں کوئی علم نہ تھا ، تو انھیں اس مماثلت کا کیسے احساس ہو سکتا تھا ؟ یہ طرز استدلال گو بظاہر نہایت معقول دکھائی دیتا ہے ، لیکن یہ ایک اہم حقیقت کو نظر انداز کرتا ہے - یہ درست ہے کہ آزاد نے ایران نہیں دیکھا تھا ، لیکن اس سے پیشتر انھوں نے ایرانی ادب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کر رکھا تھا اور ان کے دماغ میں وہاں کی تہذیب کا ایک واضح تصور موجود تھا - اس لیے جب وہ وسط ایشیا گئے تو انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ ایرانی تہذیب کے جو نقوش ان کے دماغ میں محفوظ تھے ، وہ وہاں بھی موجود تھے - بنا بریں انھوں نے ایرانی تہذیب کی روداد میں ان نقوش کو شامل کر لیا - یہ ایک نفسیاتی توجیہہ ہے ، اخلاقیات کا مسئلہ بالکل مختلف ہے -

مزید وضاحت کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اُن دنوں ایرانی اور وسط ایشیائی تمدن میں ایک واضح مماثلت تھی - اس بات کا مالکم نے جا بجا اشارتاً ذکر کیا ہے - اس مماثلت کی بہت سی وجوہ ہیں : اول ، جب تاتاریوں نے مذہبِ اسلام قبول کیا تو وہ لا محالہ ایرانیوں کے قریب تر آ گئے ، دوسرے ، گو تاتاری مدتوں سر زمین ایران پر قابض رہے لیکن ان کی سادہ بدوی تہذیب ایران پر غالب نہ

آ سکی ۔ بلکہ جس طرح رومیوں نے فتح یونان کے بعد مفتوحین کی تہذیب کو اپنا لیا تھا ، کچھ اسی طرح ان لوگوں نے بھی ایرانی تہذیب اختیار کر لی ۔ ایران کے خانہ بدوش وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں سے مختلف نہ تھے اور نہ ان دونوں ملکوں کے عام شہری تہذیب میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے ۔ وسط ایشیا میں فارسی کا عام رواج تھا اور یہ سلسلہ تعلیم میں داخل تھی ۔ جزئیات میں کہیں کہیں فرق ہوگا ۔ لیکن بظاہر یہ دونوں تہذیبیں ملتی جلتی دکھائی دیتی ہوں گی ۔

لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی لحاظ سے آزاد کے کوائف غلط نہیں ، لیکن یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ وہ مواد جس کی مدد سے آزاد نے اس تصنیف کے حصۂ اول میں اپنے لسانیاتی نظریے کی تائید کی ہے ، انھیں وسط ایشیا ہی سے دستیاب ہوا تھا ۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ زیر بحث ابواب کی ادبی اور علمی حیثیت کیا ہے ؟ جہاں تک ادبی حیثیت کا سوال ہے ، اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ تمام کتاب کی جان ہیں ، اور جب کبھی ہمیں اس تصنیف کا خیال آتا ہے تو سب سے پہلے یہی حصے یاد آتے ہیں ۔ علمی اعتبار سے یہ ابواب اگر ساقط الاعتبار نہیں تو چنداں قابل اعتنا بھی نہیں ۔ اس دور کی ایرانی تہذیب اور وسط ایشیائی تہذیب میں مماثلت سہی ۔ لیکن چوں کہ یہ مواد وسط ایشیا سے لیا گیا ہے اس لیے اس کی صداقت ضرور محل نظر ہے ۔

کچھ یہی حال ان مضامین کا بھی ہے جو مالکم صاحب کی تاریخ سے ماخوذ ہیں ۔ یاد رہے کہ مالکم ۱۸۰۰ع میں

ایران گئے تھے اور آزاد نے ۱۸۶۵ع میں وسط ایشیا کا سفر اختیار کیا تھا . . . ان دونوں کے درمیان تقریباً دو پشتوں کا فاصلہ ہے ۔ وہ باتیں جو مالکم نے انیسویں صدی کے آغاز میں دیکھی تھیں ، آزاد نے انھیں اپنی تصنیف (۱۸۶۸ع) میں ذاتی مشاہدات کی صورت میں منتقل کر دیا ہے ۔

کہا جائے گا کہ قرونِ وسطیٰ میں رفتار زندگی اتنی تیز نہ تھی جتنی کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی میں ہوگئی ہے ۔ طرز حکومت ، مذہبی ادارے ، خیالات اور اعتقادات ، رسم و رواج ، لباس ، خوراک ، مشاغل ، زمانۂ ماضی میں ان سب میں ایک واضح تسلسل تھا ۔ یہ درست ہے ، لیکن زندگی کتنی ہی سست رفتار کیوں نہ ہو ، پھر بھی اس میں حرکت ہوتی ہے ۔ آزاد نے ساٹھ ستر سال پہلے کی باتوں کو اپنی کتاب میں یہ کہہ کر داخل کر دیا ہے کہ یہ آن کے اپنے مشاہدات ہیں ۔

علاوہ ازیں ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے ہمیں آزاد کے بیانات کو ماننے میں تأمل ہوگا ۔ یہ ان کی مبالغہ آرائی ہے جس کا سراغ آن کی شدید رومان پسندی مین ملتا ہے ۔ وہ بہت ہی ذکی الحس تھے ۔ خصوصاً جب وہ ایسے حالات سے دو چار ہوتے جن سے آن کے رومانی جذبات کو تحریک ہوتی ، یا وہ دوسروں کو متاثر کرنا چاہتے تو وہ حقیقت سے دور جا پڑتے ۔ کبھی کبھی وہ محض زیب داستان کی خاطر واقعات میں بھی تصرف کر جاتے ہیں ۔ اس ضمن میں وہ بیان ملاحظہ ہو جو صفحات ۲-۲۰۱ پر درج ہے ۔

آزاد کے شاعرانہ تصرفات کی تائید ذیل کی مثالوں

سے ہوئی ہوتی ہے - مالکم صاحب نے لکھا ہے :

''ان پہاڑیوں کے دامن میں جو کردستان کو آذربائیجان اور عراق سے جدا کرتی ہیں ، ہر وادی میں ان خانہ بدوشوں کے خیمے نصب ہوتے ہیں ''۔

آزاد کی رومانیت اسے مندرجہ ذیل حسین انداز میں پیش کرتی ہے :

''جب بہار کے موسم میں شہروں کے مسافر گھروں سے نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آذربائیجان اور کردستان کے دروں اور پہاڑوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رنگا رنگ مخلوق خدا سے موج مارتے ہیں -''

مالکم صاحب نے لکھا ہے :

''ایران اور عرب کے قبیلوں کو اس بات کا فخر ہے کہ جب وہ کسی کو پناہ دیتے ہیں تو اپنے عہد پر ثابت قدم رہتے ہیں -''

آزاد نے اسے بڑھا چڑھا کر یوں لکھا ہے :

''کوئی خون کر کے آیا ہو تو اس کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے ہیں - حاکم خود چڑھ آئے تو اسے دھکے مار کر نکال دیتے ہیں - '

یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اور تصرفات عمداً نہیں کیے گئے - ان سب کا ان کے جذبات اور متخیلہ سے گہرا تعلق ہے - اور اسی قسم کی بے شمار مثالیں ''قصص ہند'' ، ''آب حیات'' اور ''دربار اکبری'' سے بھی مل سکتی ہیں -

تدوین دیوان ذوق

حصۂ غزلیات

(۱)

انگریزوں کے دہلی پر قبضے کے بعد شہر میں چھاپے خانے عام ہو گئے تھے اور ان سے آئے دن کتابیں، رسالے اور اخبارات چھپ کر نکلتے تھے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ ذوق کو اپنے دیوان کی اشاعت کا خیال تک نہ آیا، یہاں تک کہ ۱۸۵۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ بات اور بھی تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے کیوں کہ ذوق کے عزیز ترین دوست، مولوی محمد باقر، مدیر ''دہلی اردو اخبار'' کا خود اپنا چھاپہ خانہ تھا، جہاں یہ کام بخوبی سرانجام پا سکتا تھا۔

جنگ آزادی کے بعد دہلی پر جو آفت آئی اس میں شعر و شاعری کا کسے خیال تھا، لیکن جب یہ ہنگامہ فرو ہو گیا اور شہر میں امن و امان قائم ہوا، تو سب سے پہلے اس کمی کا احساس محمد حسین خاں تحسین، مہتمم مطبع مصطفائی دہلی کو ہوا، اور اس کام کی تکمیل کے لیے انہوں نے حافظ غلام رسول ویران 'شاگرد ذوق' کی اعانت طلب کی۔ چنانچہ حافظ موصوف، سید ظہیرالدین ظہیر اور سید امراؤ مرزا انور، شاگردان ذوق، کی متفقہ مساعی سے دیوان ذوق مطبع محمدی شاہدرہ سے ۱۸۶۲ء میں پہلی بار

صورت پذیر ہوا ۔ اس موضوع پر محمد حسین تحسین نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :

”یہ عاجز مدت مدید سے آرزو مند تھا کہ کلامِ فصاحت نظام حضرت استاد ملک الشعرا ، خاقانی ہند ، الموسوم بہ شیخ محمد ابراہیم ، المتخلص بہ‌ذوق کا مطبوع ہو کر باعث اشاعت نام استاد مرحوم . . . ہو ۔ لاکن یہ مطلب اس عاجز کا حینِ حیات ان کی میں بہ باعث موانعات چند در چند و بہ سبب عدم فرصتی اصلاح دہی غزلیات وغیرہ حضرت ابو ظفر ، شاہ ہند ، حاصل نہ ہوا . . . اور چونکہ دیوان استاد مرحوم کا مرتب نہ ہوا تھا ، صرف مسودات متفرقات موجود تھے ، سو وہ بھی ایام غدر میں تلف ہو گئے تھے ۔ اس نحیف کو کمال اضطراب ہوا کہ اب آرزو میری کیوں کر حاصل ہو گی . . . کہ ناگاہ . . . جناب حافظ غلامِ رسول صاحب متخلص بہ ویران کہ شاگرد رشید استاد مرحوم کے ہیں ... قصبہ پانی پت سے رونق افروزِ شہردہلی ہوئے ۔ اتفاق حسنہ سے اس بندہ سے بھی ملاقات ہوئی ۔ ان سے جو رازِ دل افشا کیا تو حافظ صاحب ممدوح نے فرمایا کہ سر انجام فراہمی اس کا ذمہ میرا ہے ، اس لیے کہ ایک عرصۂ مدید تک لیل و نہار ، تا دمِ حیات ، استاد کی خدمت میں رہتا تھا اور جو شعر زبان مبارک سے فرماتے تھے اس کو گوش دل سے سن کر و چشم باطنی سے دیکھ کر حفظ ، مثل نقش کالحجر کر لیتا تھا کہ اب تک بہت یاد ہے اور کچھ تحریف نہیں ہوئی ہے .... اور بعض اشعار کہ بہ مقتضائے بشریت حافظ صاحب کی

قوت حافظہ میں نہ رہے۔ ۔ ۔ اور نہ کہیں سے دستیاب ہوئے، سو بہ باعث امر ناچاری مندرج دیوان نہیں ہوئے۔ چنانچہ اکثر غزلیات نا تمام پر لفظ 'نا تمام' لکھ دیا گیا ہے۔''

دیوان کے آخر میں سید امراؤ مرزا کا فارسی میں ایک طویل نوٹ ہے جس کا خلاصہ خود ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

''۔ ۔ ۔ سوائے ازیں کہ چہار دیوان مجلد بادشاہ کہ شمار اشعارش لاتعد و لاتحصی است تمام و کمال درست کردہ و چکیدۂ خامہ فکرش تواند گفت، آن قدر کلام نغز و متین گفتہ کہ اعدادش را بہ وجہ ضبط و انحصار در آوردن کواکب افلاک را در رشتۂ شمار کشیدن مے شاید۔ ہیہات، ہیہات! ہجوم افکار و اشغال زمانی آن قدر فرصت نمے داد کہ مسودات کلام گوہر نظام کہ انبار انبار در بار بستہ بود و لبالب در خم و سبوچہ چون جواہر بکان و اکثر در بیاض و اندکے بہ سفینۂ دل بود فراہم و یک جا نمایند۔ ۔ ۔ الحاصل کہ تا دم حیات آن مرحوم و مغفور آرزوے ترتیب دیوان در دل شائقین ۔ ۔ ۔ ماند و ہمہ مسودات گفتہ و آن چہ مے گفتند ہماں طور پریشاں افتادہ ماندند آخر کار۔ ۔ ۔ کانسہ ناگوار زہر سرشار اجل را در ۱۲۷۱ ہجری۔ ۔ ۔ گوارہ فرمودہ ۔ ۔ ۔ زیں پس کسے از شاگردان و نیز صاحب زادہ آن مغفور را عوارض و لواحق روزگار دست فرصت نہ داد کہ بہ فراہمی مسودات متفرقہ کمر ہمت بر بندد و ۔ ۔ ۔ بہ تالیف و ترتیب دیوان پردازد۔ در خلال ایں کار محال گردش

فلک حقه‌باز بازے که ازان عالمے را طشت از بام افتاده بر روے روزگار آورد ، شیرازهٔ جمعیت ہر کسے از ہم بگسست ۔ عالم دگرگون شد ۔ ہر متنفسے را فکر جان گردید ۔ بسا به پردهٔ‌نیستی روپوش شدند و بسا بخوف جان به اطراف و جوانب متفرق گشتند ، و در ہمیں فتنه و آشوب صاحب زادهٔ آن یادگار سخن ساغر ہلاک کشیدند . . . به‌گفتن نمے آید که‌آن مسودات و کاغذہاے انبار انبار را کدام‌صرصر بربادی . . . در پرواز آورد . . بعد دو سه سال نیرنگ روزگار رنگے گرفت ، گونه اطمینانے در دل جا کرد . . . ہر قدر اشعار که از نقل تذکره جات و از یاد شاگردان و حاضرین خدمت حضرت استاد از قصاید و غزلیات و متفرقات بدست آمدند و آن قدر که بیاد خود بودند ، ہمه را فراہم نموده پیش نظر ترتیب داشتیم ۔ فاما آفرین ہزار آفرین بر . . . حافظ غلام رسول صاحب المتخلص به ویران ارشد تلامذهٔ حضرت استاد که . . . تا بست سال ہمه وقت و ہمه ساعت . . . کلام آن یگانه کشور سخن از زبان الہام ترجمان شنیده ، اکثر ازان یاد کردند ، و اکثر را زیر خیال داشتند و به این فیضان پایهٔ نغز گوئی و سخن فہمی بہم رسانیدند که علاوه از کلام فراہم آمده بسا بسا غزلیات نایاب و قصاید و قطعات و رباعیات ہر قدر از اصناف شعر بیاد خود از معدن سینه جواہر گنجینه بر زبان آورده به سفینه ثبت کنانیدند ، و اکثر مسودات قصائد و غزلیات رقم فرموده در دادند و خود ہم نظر به ترتیب و تصحیح برگماشتند ۔ اگرچه دل نمے خواست که این

قدر کلام بسیار کہ اگر تمام و کمال بہ نگارش در آمدے
و مجلد گشتے ، بار یک شتر بودے بہ تحریر این
کم از کم پرداختہ شود ، الا مشتے از خراور خروار
و اندکے از بسیار بسیار از قصائد و غزلیات و مخمسات
و مسدسات تمام و غیر تمام و رباعیات و قطعات
و دیگر متفرقات ہر قدر سامان کہ بدست آمد ، فراہم
گردید . . . در این زمان کہ ۱۲۷۹ ہجری نبوی است
بہ کمال تصحیح و تنقیح و پاک کردن از الحاق کلام
دیگراں در رشتہ تالیف و ترتیب کشیدیم* ۔"

(۲)

آزاد کو دیوان ذوق کی تالیف و ترتیب کا مدت سے
خیال تھا ۔ چنانچہ "آب حیات" میں اس خیال کا اظہار کیا
گیا تھا کہ اس کی اشاعت کے بعد وہ "دیوان ذوق" کی
ترتیب کی طرف متوجہ ہوں گے ۔ لیکن کثرت اشغال کی وجہ
سے وہ اسے سرانجام نہ دے سکے ۔ آٹھ سال بعد جب وہ ایران
سے واپس آئے تو انھوں نے میجر سید حسن بلگرامی کو ایک
خط میں لکھا :

میں نے "سخن دان فارس" کو نظر ثانی کر کے رکھ
دیا ہے ۔ چاہا کہ اب "دربار اکبری" کو سنبھالوں ،
مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی کیوں کہ
استاد مرحوم ، شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں ،
قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں ، اور میں خوب جانتا ہوں
کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی
نہیں ۔ اگر میں ان کے باب میں بے پروائی کروں گا ،
تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ

* اس ترتیب میں استاد مرزا کے چند رفقائے کار بھی شامل تھے ،
لہذا جمع کا صیغہ ۔

رہ گیا ہے بے موت مر جائے گا۔ اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام اور کیا ہوگا۔ ان کے حال پر افسوس نہیں، یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے۔ چنانچہ اس لیے اب اسے سنبھالا ہے، اور اس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدے یا غزل یا شعر کے موقع پر کوئی تقریب، کوئی معاملہ، یا معرکہ خاص پیش آیا تھا، وہ بھی نقل کردوں، کیوں کہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا، اور والد مرحوم اور وہ عالمِ طفولیت میں ساتھ رہے۔ آپ اس کے لطف کو تصور فرمائیے۔ آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا۔ خدا انجام کو پہنچا دے۔

(یکم ستمبر ۱۸۸۸ع)

علاوہ ازیں دیوان ذوق کے دیباچے سے دو اور اقتباسات بھی درج کیے جاتے ہیں جن سے ''دیوان ذوق'' کی ترتیب کی نوعیت اور اس کے آغاز و انجام پر مزید روشنی پڑتی ہے:

(۱) ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے ہیں، دیوانِ مروجہ (مرتبہ حافظ ویرن) میں کچھ چھپے، اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے، کبھی کچھ سنے۔ پھٹے پرانے مسودے، لڑکپن سے بڑھاپے کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت سی تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا، مٹے حرفوں کا اجالنا، اس زمانے کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا، بھولے ہوئے الفاظ و

مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔
خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال
تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح
ہوگئیں اور دن اندھیرے ہوگئے، جب یہ مہم سرانجام
ہوئی ہے۔

(۲) فصاحت کا دل خون ہوتا ہے، جب ان کے دیوانِ
مختصر پر نگاہ پڑتی ہے۔ اس کا بیان ایک مصیبت کا
افسانہ ہے، اور مرثیہ خوانی اس کی میرا فرض ہے۔
فرماتے تھے کہ بچپن میں جب کہ ۱۵-۱۶ برس کی عمر
تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا اور اسے بڑے
شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانے نے فرصت نہ دی۔
جو غزل ہوتی، جدا کاغذ پر لکھی جاتی۔ اس طرح
طاق میں رکھ دیتے کہ فرصت میں نظر ثانی کریں گے۔
جب طاق بھر گیا، تکیہ کے غلاف میں بھرے،
اور گھر میں دے دیے، اور کہہ دیا کہ احتیاط سے
رکھنا۔ کبھی مٹکے میں، کبھی ٹھلیا میں بھرے
اور گھر میں بھجوا دیے کہ ضائع نہ ہوں۔ اور اس
طرح بہت سے تھیلے اور مٹکے اور ٹھلیاں بھر گئے تھے۔
والد مرحوم نے آغاز شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔
وہ ہمیشہ علمی اور منصبی کاروبار میں عدیم الفرصت تھے۔
باوجود اس کے جب فرصت پاتے تو استاد کا کلام ان
سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔ بد اندیشوں سے گھرے
ہوئے تھے اس لیے بہت احتیاط کرتے تھے۔ اپنی تصنیف
کسی کو دیتے نہ تھے۔ البتہ جو چیز والد مرحوم کو
دیتے، جانتے تھے اب محفوظ ہو گئی۔

وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسماعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں - سب ذخیرہ نکالا - محنت نے اس کے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو ٹپکایا - کیوں کہ بچپن سے لے کر دم واپسیں کا کلام انھیں میں تھا اور بہت سی غزلیں بادشاہ کی ، بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں -

چنانچہ اول ان کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لیے - یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا - غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں - اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر با اطمینان کیا - مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانے کا ورق الٹ جائے گا ، عالم تہہ و بالا ہو جائے گا ، حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے ، دل کے ارمان دل میں رہ جائیں گے - دفعتاً ۱۸۵۷ع کا غدر ہو گیا - کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا - چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسماعیل ، آن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ، ان کے فرزندان روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے - میرا یہ حال ہوا کہ فتح یاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے ، اور بندوقیں دکھائیں کہ چلو نکلو - دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی - بھرا ہوا گھر سامنے تھا ، اور میں حیران کھڑا تھا ، کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں - ان کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی - یہ ہی خیال آیا کہ محمد حسین! زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا ، مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آ کر کہیں گے - اب ان

کے نام کی زندگی ہے ، اور ہے تو ان پر منحصر ہے ۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں ، یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا ۔ وہی جنگ اٹھا بغل میں مارا ۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ ، ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا ۔ غرض میں تو آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا ۔ حافظ غلام رسول ویران نے شیخ مرحوم کے بعض درد خواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب دلی کے ساتھ برباد ہوا ۔ اس وقت یہ زخم تازہ ہے ۔ اگر اب دیوان مرتب نہ ہوا تو کبھی نہ ہوگا ۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد تھا اور خدا نے ان کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی تھیں کہ بصارت کے محتاج نہیں تھے ۔ باوجود اس کے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی ۔ غرض کہ ایک مشکل میں کئی کئی مشکلیں تھیں ۔ انھوں نے اس مہم کا سر انجام کیا اور ۱۲۷۹ ہجری میں ایک مجموعہ ، جس میں اکثر غزلیں تمام ، اکثر ناتمام ، بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں ، چھاپ کر نکالا مگر دردمندی کی آنکھوں سے لہو ٹپکا ۔ کیونکہ جس شخص نے دنیا بھر کی لذتیں ، عمر کے مختلف موسم اور موسموں کی بہاریں ، دن کی عیدیں ، رات کی شب براتیں ، بدن کے آرام ، دل کی خوشیاں ، طبیعت کی امنگیں سب چھوڑیں اور ایک شعر کو لیا جس کی انتہائے تمنا یہی ہوگی کہ اس کی بدولت نام نیک باقی رہے ، تباہ کار زمانے کے ہاتھوں آج اس کی عمر بھر

کی محنت نے یہ سرمایہ دیا ، اور جس نے ادنیٰ ادنیٰ شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا اس کو یہ دیوان نصیب ہوا ۔

یونہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے

میرے پاس بعض قصیدے ہیں ، اکثر غزلیں ہیں ، یہ داخل ہو جائیں گی یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی ۔ مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں ۔

معلوم ہوتا ہے کہ ''دیوان ذوق'' مرتبہ آزاد کی اشاعت پر چند اطراف سے اس شبہے کا اظہار ہوا کہ ''دیوان ذوق'' کے حجم میں اضافے کی غرض سے آزاد نے خود بہت سی غزلیں لکھ کر اس میں شامل کر دی ہیں ۔ چنانچہ سر عبدالقادر نے آزاد پر اپنے لیکچر میں اس کی تردید ان الفاظ میں کی :

It is alleged by some that the verses added are not Zauq's but spurious ones. I cannot say that I have much respect for this theory. I think that Azad must have deemed it a decided compliment to his own ability if people can credit him with the authorship of lines such as those now added in the Diwan. (*New School of Literature*, p. 47.)

ترجمہ : بعض لوگ کہتے ہیں کہ اضافہ شدہ اشعار ذوق کے نہیں بلکہ الحاق ہیں ۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میں اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتا ۔ میرے خیال میں آزاد اس بات کو کہ ان اضافہ شدہ اشعار کو لوگ اُن کا کلام سمجھیں ، اپنی قابلیت کا اعتراف سمجھتے ہوں گے ۔

مجھے تدوین دیوان ذوق اور اس کے مآخذ کے بالاستیعاب مطالعے کا اس وقت موقع ملا جب میں ۱۹۳۷ع میں پنجاب یونیورسٹی کی پی ایچ - ڈی کی ڈگری کے لیے محمد حسین آزاد پر اپنا تحقیقی مقالہ تیار کر رہا تھا - اور اس مواد کی بنا پر جو مجھے دستیاب ہوا ، اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بارے میں معترضین کے شبہات بے بنیاد نہ تھے بلکہ بہت حد تک حقیقت پر مبنی تھے - اگرچہ ان کے پاس اپنے شبہات کی تائید میں مواد موجود نہ تھا - میں نے اپنے مقالے میں ناقابل تردید حقائق کی بنا پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا ، وہ حسب ذیل ہیں :

Azad has appended notes on some two dozen *ghazals* and *qasidas* of Zauq to say that they were not finally revised by the poet. I have incontrovertible documentary evidence to prove that either Azad did not possess the original MSS of these poems or they reached him in a state of unsatisfactory preservation, so that they could not be deciphered or were obviously corrupt or incomplete. He would have done well to have left them out, but he was eager to rescue them from oblivion and decided to correct and improve them. For some of the corrections, emendations and additions that he made, he, no doubt, trusted to his memory ; but in others, where this resource failed him, he let his enthusiasm outrun his editorial responsibility and actually rewrote them, so that we are justified in declining to treat them as Zauq's work. For an extreme example of the recasting and rewriting of these poems the reader is referred to the photographic copies of two of these MSS, both relating to the same *ghazal*, at the end of this appendix. In some others,

the alterations are not so radical, but they are very much there. The conclusion I have arrived at is that though not wholly spurious, they are, in varying degrees, works of doubtful authenticity.''

ترجمہ : آزاد نے تقریباً دو درجن ایسی غزلوں اور قصیدوں پر نوٹ دیے ہیں جن سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ وہ شاعر (ذوق) کی نظر ثانی سے محروم رہ گئے ہیں۔ میرے پاس ایسی ناقابل تردید تحریری شہادت موجود ہے جس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ یا تو آزاد کے پاس ان غزلوں کے اصل مسودات سرے سے موجود ہی نہ تھے، یا وہ ان تک ایسی فرسودہ حالت میں پہنچے کہ پڑھے نہیں جا سکتے تھے۔ یا ان میں تحریف کی گئی تھی اور یا وہ نامکمل تھے۔ آزاد اگر ان کو شامل نہ کرتے تو اچھا ہوتا۔ مگر وہ انھیں گم نامی سے باہر لانے کے بڑے خواہشمند تھے۔ اس لیے انھوں نے ان میں تصحیح و ترمیم کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اپنی بعض اصلاحوں، ترمیموں اور اضافوں کے لیے انھوں نے اپنی یادداشت پر بھروسا کیا۔ مگر جہاں یہ ذریعہ ناکام رہا، ان کے جوش نے انھیں مدیرانہ ذمہ داریوں سے تجاوز کرنے پر آمادہ کیا اور انھوں نے ان غزلوں کو خود لکھا۔ اس لیے ہم ان کو ذوق کی غزلیں تسلیم نہ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ ان غزلوں کی نئی شکل کی انتہائی مثال کے لیے قاری کو آن مسودات میں سے *دو کی وہ فوٹو نقول دیکھنی چاہئیں جو اس ضمیمے کے آخر میں ہیں اور جو ایک ہی غزل سے تعلق رکھتی ہیں۔ چند اور غزلوں میں اصلاحات کی وہ

---

*دیکھیے صفحات ۲۹۲—۲۸۸ ۔

بھرمار نہیں لیکن ان کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ غزلیں سراسر الحاق نہیں ہیں، پھر بھی کم و بیش ان کی اصلیت مشتبہ ہے۔

(۴)

در حقیقت یہ سوال اتنا وسیع تھا کہ اس کے مکمل بیان کے لیے میرے مقالے میں جگہ نہ تھی۔ وہاں میں نے اپنے مآخذ کا ذکر کر کے چند مسودات کی نقول پیش کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ ۱۹۶۴ع میں جب یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا تو میں نے اس کے بیان میں مزید اختصار سے کام لیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا جائے جو میں اب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

وہ مسودات یا تصانیف جن کی بنا پر میں مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں، حسب ذیل ہیں:

(۱) 'دیوان ذوق'' مرتبہ محمد حسین آزاد (الف)۔

(۲) ''دیوان ذوق'' مرتبہ حافظ غلام رسول ویران (واؤ)۔

(۳) سفید فل سکیپ کاغذ پر غزلیات ذوق کا ایک قلمی نسخہ جو آزاد نے چند اشخاص کی مدد سے تیار کیا تھا (ف)۔

(۴) گیارہ سیالکوٹی کاغذ کے اوراق، جن پر ایک باقاعدہ مسودے کی شکل میں ردیف الف 'واؤ' اور 'یا'

کی تیس غزلوں کو نقل کیا گیا ہے ۔ یہ مسودہ خود آزاد کا لکھا ہوا ہے (س) ۔

(۵) دو حنائی ورق جن کے دونوں طرف نو (۹) غزلوں کو ایک باقاعدہ مسودے کی صورت میں نقل کیا گیا ہے (ح-۱) ۔

(۶) نو (۹) حنائی اوراق جن پر آزاد نے ذوق کی سترہ غزلوں میں ترمیم و اصلاح کی ہے (ح-۲) ۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل دو باتیں خصوصیت سے قابل ملاحظہ ہیں :

(۱) ماسوا ایک دو غزلوں کے (ف ، س ، ح-۱، ح-۲) اُن غزلوں پر مشتمل ہیں جو بقول آزاد ذوق کے بچپن یا عہد جوانی سے متعلق ہیں ، یا جن پر نظر ثانی نہیں ہو سکی ۔

(۲) اگرچہ س ، ح-۱ اور ح-۲ خود آزاد کے اپنے لکھے ہوئے ہیں لیکن ان سب میں اشعار ، مصرعوں یا الفاظ کو کاٹ چھانٹ کر مزید اصلاح اور اصلاح در اصلاح کی گئی ہے ۔ ان میں سے کئی ایک اصلاحات کسی اور شخص کی قلم سے ہیں ۔

ان ماخذ کی تفصیل یہ ہے :

(۲) **دیوان ذوق مرتبہ حافظ غلام رسول ویران :** معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں آزاد نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تمام وہ غزلیں ، قصائد اور متفرق اشعار جو 'واؤ' میں درج نہیں ، اور جن کا مواد ان کے پاس موجود تھا ، یا وہ غزلیں اور اشعار جو انہیں زبانی یاد تھے ، ان سب

کو اپنی اپنی جگہ حافظ ویران کے، ان کے اپنے مملوکہ نسخے میں درج کر دیا جائے۔ چنانچہ پہلے پہل یہی کام کیا گیا، اور بہت سے ایسے متفرق اشعار یا تو حاشیے میں درج کر دیے گئے، یا پھر انھیں بین السطور لکھ دیا گیا۔ پوری غزلوں کے لیے حسب ضرورت کورے کاغذ کے ٹکڑے چسپاں کر کے انھیں ان پر نقل کر دیا گیا۔

جو اشعار بین‌السطور درج ہیں وہ خط شکستہ میں ہیں اور آسانی سے پڑھے نہیں جاتے۔ حاشیے میں لکھے ہوئے اشعار اور مکمل غزلیں، جو متذکرہ بالا طریق پر ایزاد کی گئی ہیں، نہایت خوش خط لکھی ہوئی ہیں۔

بعد میں یہ طریقہ ترک کر دیا گیا۔ غالباً اس لیے کہ وہ تمام مواد جو آزاد کے پاس تھا، مندرجہ بالا طریقے سے 'واؤ' پر بہ آسانی منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، آزاد نے فیصلہ کیا تھا کہ جس قصیدے یا غزل یا شعر کے ساتھ کوئی تقریب، کوئی معاملہ یا کوئی معرکۂ خاص پیش آیا تھا، وہ بھی نقل کر دیا جائے۔ چنانچہ 'الف' میں مثنوی مرقومہ ص ص ۲۶۰-۶۲، قصیدہ نمبر ۱۵ ص ص ۳۱۰-۱۸، قصیدہ نمبر ۱۶ ص ص ۳۱۹-۲۴، قصیدہ نمبر ۲۰ ص ص ۳۳۲-۳۴ اور مطلع قصیدہ مدح حضرت بادشاہ اکبر جنت آرام گاہ ص ص ۳۴۹-۵۰ پر جو نوٹ درج ہیں، وہ اولاً 'واؤ' کے حاشیے یا اوراقِ مشتملہ پر درج کیے گئے تھے۔

(۳) 'ف': یہ مسودہ فل‌سکیپ کاغذ پر ہے جس میں ذوق کی غزلیں مرقوم ہیں۔ مسودہ مکمل نہیں۔

کیوں کہ ردیف الف کے بعد ردیف ب ، ت ، ج ، چ کی غزلیات درج نہیں ۔ یہ مسودہ بہ استثنائے چند غزلیات ، جو 'واؤ' میں نہیں اور اس میں درج ہیں ، اول‌الذکر (واؤ) کے مطابق ہے ۔ کچھ عرصہ میرے لیے یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ وہ اشعار جو 'واؤ' میں اضافہ کیے گئے ہیں ، اس مسودہ سے لیے گئے ہیں یا یہ مسودہ خود 'واؤ' سے مرتب کیا گیا ہے ۔ پہلے پہل اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا ۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ متفرق اشعار جو مسودہ 'ف' اور 'واؤ' میں مشترک ہیں ، ردیف 'ے' کے سوا بالکل ایک ہی ترتیب میں ہیں ، لہذا 'ف' میں ان متفرق اشعار کی یہ ترتیب اس بات کا بین ثبوت ہے کہ 'ف' کو 'واؤ' کی مدد سے تیار کیا گیا ہے ۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ وہ اشعار یا غزلیات جو اس طرح 'واؤ' میں اضافہ کی گئی ہیں ، کہاں سے حاصل ہوئیں ؟ تو قیاساً اس کا یہی جواب ہو سکتا ہے کہ ان کا ماخذ وہی مسودات ہیں جو اُس 'جنگ' میں تھے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔

'واؤ' اور 'ف' کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں وہ تمام غزلیات درج نہیں جنھیں آزاد نے 'بچپن یا شباب کا کلام' یا ایسا کلام جو نظر ثانی سے محروم رہا کے حواشی کے ساتھ 'الف' میں درج کیا ہے ۔

اِس عدمِ شمولیت کے اسباب کیا ہیں ؟

میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ آزاد کے پاس یا تو ان سب کے ، یا ان میں سے متعدد غزلیات کے مسودے موجود نہ تھے ، یا پھر وہ ایسی خستہ حالت میں تھے کہ

انھیں پڑھا نہیں جا سکتا تھا ۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ادبی لحاظ سے وہ اتنے عامیانہ تھے کہ ان سے آزاد کے ذوق کی تسکین نہیں ہوتی تھی ، یا پھر وہ انھیں ذوق کے وقار کے منافی خیال کرتے تھے ۔ ان کی تکمیل کے لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ حافظے پر زور ڈال کر ان اشعار اور غزلیات کو یاد کیا جائے ، یا ان مسودات کو بغور دیکھا جائے ۔ اور اگر یہ دونوں حربے ناکام رہیں تو ان کی بطور خود ترمیم و اصلاح کی جائے ، یا ان خیالات کو اپنی زبان میں ادا کیا جائے ۔ چوں کہ بقول آزاد ، ذوق ان پر نظر ثانی نہ کرسکے تھے لہذا آزاد نے ان کی اصلاح و تہذیب کا کام اپنے ذمے لے لیا ۔

میں نے یہ تمام توجیہات نہایت ہمدردانہ انداز میں اوپر درج کی ہیں ۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کیا صرف انھیں مسودات نے ، جن کا تعلق زمانۂ طفولیت و شباب سے تھا ، یا جن پر نظر ثانی نہیں ہوئی تھی ، ایسی بری طرح مسخ ہونا تھا ؟

(۴) 'س' یہ مسودہ متفرق غزلیات پر مشتمل نہیں ، بلکہ ردیف 'الف' ، 'واؤ' اور 'یا' کی منتخب غزلیات کا مجموعہ ہے ۔ غزلوں کے مقطعے ذیل میں درج ہیں ۔ جیسا کہ مسودے کے مطالعے سے ظاہر ہے ، اسے مکمل کرنے کے بعد جابجا مصرعے ، اشعار یا الفاظ کاٹ کر ان کی تصحیح کی گئی ہے ۔ بعض غزلیں ناقص قرار دے کر انھیں منسوخ کر دیا گیا ہے اور ان کی جگہ انھیں مضامین کے نئے اشعار درج کر دیے گئے ہیں ۔ مثال کے طور پر دیکھیے :

لعل لب و دندان صنم کا جب سے دل میں خیال کیا
(نمبر ۱۱ ؁)

مسودے کی پہلی دو غزلیں ، جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں ، نقل نہیں کی جا رہی ہیں ۔ یہ اس لیے کہ یہ اس زمرے سے متعلق نہیں ہیں جسے بچپن یا جوانی وغیرہ کا کلام کہا گیا ہے ۔

(۱) ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا
(۲) ہوا یہ سینہ یکسر خار زارِ دشتِ غم میرا

ذیل کی غزلیات میں سے (۱) 'واؤ' اور 'ف' دونوں میں درج ہے ۔ باقی تمام نہ 'واؤ' میں ہیں اور نہ 'ف' میں ۔

(۱) آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
(۲) ہر گام پر رکھے ہے وہ یہ ہوش نقش پا
(۳) رکھ دل جلوں کی خاک پہ مت با فراغ پا
(۴) گزرے گر اس راہ سے رکھ دیدۂ تر زیر پا
(۵) دشمنِ جاں یک بیک سارا زمانہ ہو گیا
(۶) کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا
(۷) برنگ گل ، صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا
(۸) اُن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
(۹) چاہے عالم میں عروج اپنا تو ہو گھر سے جدا
(۱۰) لختِ دل اور اشک تر دونوں بہم دونوں جدا
(۱۱) لعل لب و دندان صنم کا دل نے جب سے خیال کیا
(۱۲) ہجر میں کیا کیا مرض اے سنگ دل پیدا ہو
(۱۳) جل اٹھا شمع نمط تار رگِ جاں میرا
(۱۴) ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو

دیکھیے صفحہ ۳۱۲

دیکھیے صفحہ ۳۰۵

دیکھیے صفحہ ۲۹۳

ذوق

دیکھیے صفحہ ۲۹۱

دیکھیے صفحہ ۲۸۸

(۱۵) عبث تم اپنی لگاوٹ سے ۰۰:۸ بناتے ہو
(۱۶) جو کہوے قد یار کی تصویر دکھا دو
(۱۷) خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
(۱۸) مرضِ عشق جسے ہو اسے کیا یاد رہے
(۱۹) چشمِ قاتل ہمیں کیوں کر نہ بھلا یاد رہے
(۲۰) تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے
(۲۱) پری رو کیا ستم گر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
(۲۲) نہ کھینچو عاشقِ تشنہ جگر کے تیر پہلو سے
(۲۳) برق میرا آشیاں کب سے جلا کر لے گئی
(۲۴) حدِ رقم ہے وصفِ جبیں سے صنم پرے
(۲۵) ذکرِ مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے
(۲۶) خمِ ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے
(۲۷) دکھلا نہ خالِ ناف تو اے گل بدن مجھے
(۲۸) مار کر تیر جو وہ دلبرِ جانی مانگے

ذیل میں اس مسودے کی نقل دی جاتی ہے :

(۱)

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
ہے حسرت پابوس نکل جائے تو اچھا

حاصل ہو محبت کا ثمر کچھ تو مجھے بھی
یہ سینہ پھپھولوں سے جو پھل جائے تو اچھا

ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے
لینے کو خبر اس کی اجل جائے تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

کھینچے دل انسان کو نہ یہ زلف سیاہ فام
اژدر اگر انسان کو نگل جائے تو اچھا

دل گر کے نظر سے تری اٹھنے کا نہیں پھر
یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

فرقت سے تری تار نفس سینہ میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

تاثیر محبت عجب اک حُب کا عمل ہے
یہ حُب کا عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

اے گریہ نہ رکھ میرے تن خشک کو غرقاب
لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

وہ صبح کو جائے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور پھر کہوں دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یوں ہی ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا دل جائے وہ یاں سے
دل اس کا یہیں گرچہ بہل جائے تو اچھا

ہے قطع رہ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع جو تو سر ہی کے بل جائے تو اچھا

(۲)

ہر گام پر رکھے ہے وہ یہ ہوش نقش پا
ہو خاک عاشقاں نہ ہم آغوش نقش پا

افتادگاں کو بے سر و ساماں نہ جانیے
دامانِ خاک ہوتا ہے روپوش نقش پا

اعجاز پا سے تیرے عجب کیا کہ راہ میں
(ح) بول اٹھے مونھہ سے
اٹھے پکار ہر لب خاموش نقش پا
(ح) کب تنگ نائے دہر میں ہے
اس رہ گذار میں ہے کسے رخصت قیام
اس رہ گذر میں کب کوئی قائم مقام ہے
بیٹھے ہے نقش پا بہ سرِ دوش نقش پا
رخت وجود خاک نشینانِ کوے عشق
یوں ہے کہ جوں بہ خاک تن و توش نقش پا
فیض برہنہ پائی سے میری بہ سوے دشت
ہر آبلہ بنے ہے دُرِ گوش نقش پا
پابوس درکنار کہ اپنی تو خاک بھی
پہنچی نہ ذوق اس کے بہ آغوش نقش پا

(۳)

رکھ دل جلوں کی خاک پہ مت یا فراغ پا
(ح) گرمی سے اس کی
سوزِ دروں سے دیکھ نہ ہو جائیں داغ پا
(ح) اے موسم خزاں ترا خانہ خراب ہو
ہو مسکن رقیب ترا گھر ہمارے بعد
بلبل کے آشیاں میں رکھے حیف زاغ پا

اے شانہ دسترس ہو اگر تجھ کو مو بہ مو
کچھ کوئے زلف یار میں دل کا سراغ پا

روئے ہے پھوٹ کے کیا چشم آبلہ
(ح) میں نے جب کہ رکھا
وحشت میں جوں ہی میں نے رکھا سوے راغ پا

رکھ مت قدم بہ سینۂ سوزاں خیال یار
ڈالے ہے دیکھ کیوں تو میانِ اجاغ پا

اُچھلے ہے شیخ وجد میں اس طرح بار بار
(ح) جس طرح بد لگام ہو گھوڑا
~~گھوڑا شرر جیسے کہ ہو کوئی پرلخ تھا~~

(ح) ہائے گر
گردش سے چشم یار کی ہے ~~کیا عجب چلے~~
(ح) گر
شکل حباب آب رواں اب ایاغ

ہے جی میں آب جو نمط، اے سرو خوش خرام
(ح) دھو دھو پیا کریں ترے ہم بے دماغ پا
دھو دھو کے اب پئیں ترے ہم بے دماغ پا

(ح) سیر چمن کو جائے وہ کیا ذوق جس کے ہوں
مائل بہ سوے گل وہ کیا ذوق جس کے ہوں
رنگِ حنا سے غیرتِ صد پائیں باغ پا

(۲)

گذرے گر اس رہ سے وہ رکھ دیدۂ تر زیر پا
ہل ہو بحر اشک پر مژگاں سراسر زیر پا
ہم برہنہ پا جنوں اور گرم پتھر زیر پا
دوپہر سے سایہ تک بیٹھا ہے چھپ کر زیر پا

مل نشے میں میری آنکھیں اپنے تلووں کے تلے
توڑتا بد مست کیوں ہے رکھ کے ساغر زیر پا
ہے نمازِ کشتۂ قامت بجائے جانماز
(ح) ہو
چاہیے ہے اے فلک دامانِ محشر زیر پا

زیردستی پر بھی ہے موذی سے لازم احتراز
سانپ دب کر کاٹ کھاتا ہے مقرر زیر پا
تیرے مجنوں کے کہاں مژگاں ہیں خار دشت یہ
راہ آنکھوں کے نکل آئے ہیں چبھ کر زیر پا

نصف

نخل گل مہدی نہ ہو (کذا) صبو میں اے نگار
تو کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیر پا

فاتحہ عاشق کی دی ہی چاہیے پاس ادب
کفش پا کو رکھ لے پاؤں کھینچ باہر زیر پا

میں ہوں وہ کشتی شکستہ بحر الفت میں صبا
ایک تختہ رہ گیا ہو جس کے بچ کر زیر پا

(ح) ذوق یہ غارت کرے گا قصر تن کو ایک دن
ایک دن اے ذوق ہوگا گرد قصر جسم خاک
چیونٹیوں کا پھر رہا ہے یہ جو لشکر زیر پا

(۵)

دشمن جاں اس قدر سارا زمانہ ہو گیا
ہائے تاثیر محبت اب مجھے کیا ہو گیا
(ح) ~~دشمن جاں اور بھی وہ تو ہمارا ہو گیا~~
~~ہائے تاثیر غم الفت مجھے کیا ہو گیا~~

جب نشہ اس کو شراب لالہ گوں کا ہو گیا
رنگ روے آتشیں اور اک بھبوکا ہو گیا

یک بیک پہلو سے دل غائب جو میرا ہوگیا
کس طرف دیکھیں کہاں ڈھونڈیں اچنبا ہوگیا

دیکھ کر تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شور و غل وا حسرتا کا ایک برپا ہو گیا

اپنے مونہہ سے کیوں نکالا تھا سفر کا تو نے نام
کوچ دنیا ہی سے اے ظالم ہمارا ہو گیا

ہو چکا دنیا میں رہنا آہ اب اپنا دلا
(ح) ہو چکا دنیا میں اب رہنا ہمارا ہم دموں
آج گھر میں غیر کے گر ان کا رہنا ہو گیا

وہ نگاہیں تیری قاتل ہیں کہ کشتہ اک جہاں
جس طرف کو آنکھ بھر کر تونے دیکھا ہوگیا

نام بھی خط پر لکھا میرا تو آدھا ہی لکھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

جب کہا میں نے کہ مجھ کو کیوں جلایا شعلہ رو
سنتے ہی اس بات کو وہ آگ دونا ہو گیا

کرتا ہے انکار کیوں جانے سے تو گھر غیر کے
اب تو جانے کا ترے عالم میں چرچا ہوگیا

گرم ہو کر آئے ہے مونھہ پر مرے طفل سرشک
دیکھ کیا اے چشم تر ابتر یہ لڑکا ہو گیا

زلف تیری شانہ میں اور شانہ سے ہے کش مکش
میں نے گر چھیڑا ذرا تو اور برہم ہو گیا

کشتۂ حسرت کا تیرے جب جنازہ لے چلے
حسرتا وا حسرتا کا شور برپا ہو گیا

جس کو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا
سوکھ کر اس غم سے وہ آخر کو کانٹا ہوگیا

رات جو یاد آ گئی مجھ کو وہ زلف عنبریں
یہ بھریں آہیں دھویں سے چرخ کالا ہوگیا

(ح) اس کے غمزے نے ہے اک عالم کو مارا جان سے
ایک عالم کو ترے غمزے نے مارا جان سے
(ح) نام بد اے ذوق ناحق ہے قضا کا ہو گیا
اے ستم گر نام بد ناحق قضا کا ہو گیا

(٦)

چشم کوہ سے ہے آب نکلتے دیکھا
سخت دل پر ترا کافر نہ پگھلتے دیکھا
(ح) دم

ضعف سے سینہ میں اب دل کی یہ حالت ہے کہ یوں
ریگ کو شیشۂ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

(ح) ہوں وہ اس باغ میں نخل گل آتش بازی
ہوں میں وہ دہر میں نخل گل آتش بازی
غیر شعلہ نہ جسے پھولتے پھلتے دیکھا

(ح) زلف شب رنگ ترے رخ پہ چھپا دیکھ کے ماہ
ہے تری جنبش کاکل سے فرو شورش دل
آگے کالے کے دیا سچ ہے نہ جلتے دیکھا

اے صبا کس کو بجز جنبش سبزہ تو نے
مورچھل گور غریباں پہ ہے جھلتے دیکھا

جو بلندی پہ چڑھا ہے وہ گرا ہے آخر
پانوں دیوار سے سایے کا پھسلتے دیکھا

(ح) کیوں نہ وہ زلف
زلف وہ کیوں نہ در گوش پہ لہرائے سدا
کہ سر بیضہ سے ناگن کو نہ ٹلتے دیکھا

حکم انعام ہوا یا کوئی دشنام عطا
نہیں معلوم مگر ہونٹ ہے ہلتے دیکھا

جا چھپا شرم سے ظلمات میں جو آب حیات
تجھ کو ہونٹوں پہ مسی کیا کہیں ملتے دیکھا
(ح) تجھ کو دانتوں پہ مسی کو کہیں ملتے دیکھا

کج ادائی کا سبب ابروے جاناں کی نہ پوچھ
شاخ آہو سے دلا خم نہ نکلتے دیکھا

(ح) کودک اشک تجھے چشم میں دیکھا نہ قرار
کودک اشک نے پر چشم میں پایا نہ قرار
ورنہ گہوارے میں لڑکے کو بہلتے دیکھا
لڑکوں کو

(۷)

(ح) صبا سے ہو شگفتہ کس طرح دل گیر دل میرا
صبا سے ~~کس روش وا ہووے~~ یہ دل گیر دل میرا
کہ ہے باغ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

کرے ہے صفحۂ سینہ پہ تار اشک سے مسطر
غم ہجراں کیا چاہے ہے کچھ تحریر دل میرا

خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہوں
پڑھے ہے ان دنوں شاید کوئی تفسیر دل میرا

سنبھالے رکھیو تو اے چرخ واژوں اپنے دامن کو
کہ ہر شب کھینچتا ہے نالۂ شب گیر دل میرا

کہ ہے یہ زعفران پھولی
نہ سمجھو رنگ زرد اس کو ~~کہ پھولی زعفران سے ہے~~
بھرے کیوں کر نہ آہ سرد ہے کشمیر دل میرا

~~تری آنکھوں کو سکیا بی اے پری وش یاں جادو ہے~~
کہ اک ~~پل میں یہاں بس کر لیا تسخیر، دل میرا~~

تری چشم فسوں گر اے پری وش طرفہ جادو ہے
کہ اس نے اک نگہ میں کر لیا تسخیر دل میرا

(ح) خیال ابروے جاناں جدا ہوتا نہیں اس سے
دل
تصور تیغ ابرو کا ترے جاتا نہیں اس سے
بڑا بانکا ہے، رکھتا ہے سدا شمشیر دل میرا

(ح) دل سنگیں ترا اے بت اگرچہ سنگ پارس ہے
ترا دل سنگ دل اب وہ اگرچہ سنگ پارس ہے
یاں
تو کشتہ ہو کے یہ بھی ہے بنا اکسیر دل میرا

لگا تو خوں ہے اس کا یار جا کر تیرے دامن کو
قیامت کو ترا ہووے گا دامن گیر دل میرا

بتوں سے جا اٹکتا ہے یہ ! میں بدنام ہوتا ہوں
(ح) مجھے تو ذوق کرتا ہے یہاں تشہیر دل میرا
کرے ہے مجھ کو اب اے ذوق یاں تشہیر دل میرا

(۸)

ان سے کچھ ذکر دلا اب نہیں لانا اچھا
لیک جو وہ کہیں تو بھی کہے جانا اچھا

(ح) ہم کو دشمن ہے اگر آپ نے جانا، اچھا
گرچہ دشمن ہے ہمیں آپ نے جانا ، اچھا
دوست ناداں سے تو ہے دشمنِ دانا اچھا

کشتۂ دست نگاریں ہوں ، مری قبر پہ ہے
پھول گل مہدی کے لالا کے چڑھانا اچھا

(ح) دیکھ کر طاق دو ابرو کو نہ دل کھینچے آہ
یاد میں طاقِ دو ابرو کے دلا کھینچ نہ آہ
جانب
سمت کعبہ کے نہیں تیر لگانا اچھا

ہو ہر کہیں قانع کہ بسانِ مہ نو
چھوڑ آدھی نہیں ساری کو ہے جانا اچھا

(ح) کرکے دل کو ہدف تیر نگہ کہتے ہیں
ہدف تیر نگہ دل کو بنا کر بولے
کیوں جی کچھ ہم بھی لگاتے ہیں نشانہ اچھا

(ح) طائر جان ہی کو بھیجتے ہیں اور اس سے
طائر روح وہاں یوں ہی پہنچ جا تجھ سے
نامہ بر کون سا اب کیجے روانا اچھا

دیکھ غماز نہ کچھ اور نکالیں رخنہ
روزن
رخنۂ در سے نہیں آنکھ لڑانا اچھا

پھر بھڑک جائے گی یہ آتش دل دیکھ مجھے
اب نہیں دامنِ مژگاں کا ہلانا اچھا

بدگماں یہ ہے کہ کہتا ہے مری لاش پہ بھی
دیکھ کر ہم کو نہیں دم کا چرانا اچھا

دل عشاق کو اس زلف سے کرتا ہے جدا
غیرِ ارہ نظر آتا نہیں شانہ اچھا

(ح) طرہ شمشاد دکھاتا ہے جو زلفوں کو
غیر ارہ نہیں اس کے لیے شانہ اچھا

ابر روتا ہے بڑھا ہاتھ کو آگے ساغر
ساقیا ابر روتا دے بھر کر جام
ابر روتا ہے تری جاں کو ساغر وہی جام
اس گھٹا میں نہیں
نہیں اس دور میں دل دیکھ گھٹانا اچھا

قطعہ

حون ؟ جستہ گر ہو گیا ہے
~~قطرۂ خون دل سوختہ~~ اشک آلود
اس کا
ست مژگاں سے نہیں ~~چشم~~ گرانا اچھا

مدت‌العمر میں
~~یعنی مدت میں~~ تسبیح سلیمانی کا
آج ایک
ترے
~~ایک لب~~ ہاتھ لگا ہے مرے دانا اچھا

روبرو اس کے تو اے ذوق بہا ذوق سے اشک
(ح) سامنے یار کے اے ذوق بہانا آنسو
(ح) روبرو ان کے جو ہیں ذوق بہاتے آنسو
ہے یہ چاہت کے جتانے کو بہانا اچھا

(۹)

ڈھونڈ غربت میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
دیکھ چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا
کیجو مشاطہ نہ سبزہ گوش دل‌بر سے جدا
بدنما ہے کیجے گر مینا کو ساغر سے جدا
دل مرا یا رب نہ ہو زلف معنبر سے جدا
سر جدا ہو تن سے ، یہ سودا نہ ہو سر سے جدا

لکھے شرح سوزش ہجراں جو تیرا بے قرار
~~لکھیں شرح سوزش ہجراں تو مانند ...~~
کیا عجب ہو گر اچھل کر نکتہ دفتر سے جدا

دل کو
جس کو یہ پیوستگی ایذا سے ہے جون
صورت نہ ہووے
شکل خندق نوک نشتر سے جدا

چمکے ہے داغ جنوں سر پر تہہ موے سفید
(ح) ورنہ یاں رکھتے ہیں سب شیشہ کو اخگر سے جدا
ورنہ سب رکھتے ہیں یاں شیشہ کو اخگر سے جدا
خطِ شرح ناتوانی ہو گیا اڑتے ہی آہ
جوں پر کمزور اڑتے ہی بازوے کبوتر سے جدا
عاقبت
آخرش شیطاں نے آدم کو نکالا خلد سے
غیر نے ہم کو کیا ہے کوئے دلبر سے جدا
حق میں ہو گویا مرے
شربت قند مقرّر کشتہ ٔ الفت کو دے
سر کرے قاتل اگر اس طرح خنجر سے جدا
(ح) ہم دمو اک بار مجھ کو نیم بسمل چھوڑ دے
(ح) نیم بسمل ہم دموں یک بار تو چھوڑے مجھے
ایک باری تو مجھے وہ نیم بسمل چھوڑے دے
(ح) بار دیگر وہ کرے سر تن سے تن سر سے جدا
(ح) پھر کرے سر تن سے اور تن کو کرے سر سے جدا
دوسری باری کرے سر تن سے تن سر سے جدا
ذوق ہے ترک وطن میں صاف نقص آبرو
بکتے پھرتے ہیں گھر ہو کر سمندر سے جدا

(۱۰)

لخت دل اور اشک تر
اشک تر لخت جگر دونوں بہم دونوں جدا
راہ رو ہیں
ایک جا ہیں ہم سفر دونوں بہم دونوں جدا

میں نہ چکوا ہوں نہ وہ چکوی پھر آخر کس لیے
رہتے ہیں شب تا سحر
~~رہتے ہیں کیوں ہم دگر~~ دونوں بہم دونوں حدا

اور وہ
نکہت گل کی طرح ~~ہم ملنے~~ صلح و جنگ میں
رہتے ہیں کیوں ہم دگر
~~رہتے ہیں صبح ؟ ہم~~ دونوں بہم دونوں جدا

شکل عکس و آئینہ تیرا خیال اور دل مرا
آئینے میں
~~ہیں یہاں لے~~ سیم‌بر دونوں بہم دونوں جدا

(ح) کیا تماشا ہے کہ اوراق جلاجل بزم میں
(ح) دل جگر سینہ میں اوراق جلاجل کی طرح
دیکھ اوراق جلاجل کی طرف اے ہم نشیں
(ح) رہتے ہیں با شور و شر دونوں بہم دونوں جدا
ذوق ہیں
ہیں سدا با شور و شر دونوں بہم ، دونوں جدا

(۱۱)

تیری   یار
لعل لب و دندان صنم کا ہم دم جس نے خیال کیا
صم بکم کہہ کر گویا اپنی زباں کو لال کیا
لے گا دلا اس عشق سے کیا تو جس نے کوہ و صحرا میں
~~تجھ کو دلا کیا عشق سے حاصل ہوگا دیکھ کہ اس نے تو~~
مجنوں کا وہ حال کیا ، فرہاد کا ہے وہ حال کیا
پھرتا ہے اے چاند کے ٹکڑے بس کہ شب و روز آنکھوں میں
~~ہے تری تصویر تمھاری آنکھوں میں یاں ساری رات~~
دل نے روشن ہو کے شب فرقت کو روز وصال کیا
~~ہم نے شب فرقت کو دن سمجھ لیا تو روز وصال سمجھا~~

آتش گل ہوئی روشن واں یہاں چمکا ہمارے دل کا جنوں
آتش گل ~~تو چمکی وہاں اور گرم ہوا یاں میرا جنوں~~
موسم   کیا   اب کے
~~فصل~~ گل نے کیسا برپا ہنگامہ اس سال کیا
~~مونہہ لگنا خوباں جہاں کا آہ سیاہ رو ہونا ہے~~
یار کے مونہہ چڑھ تو نے کالا اپنا منہ اے خال کیا
سادہ رخوں سے کی جو محبت تیری ہی تھی سادہ دلی
مونہہ چڑھ کر اس شوخ کے اپنا کالا مونہہ اے خال کیا
مو قلم اب لاؤں کہاں سے جو یہ کرے تحریر اسے
حال تو دیکھو تم نے مجھے ہر موئے تن ہے
~~خامہ مو ہے اس کو لکھو خط تلک بھی معلوم کرے~~
~~مجھ نے میرا کرکے یہ حال اب زیست کو مجھ پہ وبال کیا~~
نامۂ یار کو رکھ دیجو تم ہم دم میرے زیر کفن
مرا گر مجھ سے کسی نے
یہی جواب نامہ ہے ~~اپنا کچھ جو کسو~~ نے سوال کیا
شمع نمط ہر خار جنوں کی انگلی پگھلی جاتی ہے
دشت جنوں کو ہم نے ناحق آبلہ سے
~~خار کے ہر انگشت پہ خون ہے دیکھو عالم فندق کا~~
~~ہم نے دیدہ آبلہ اپنا دشت میں گو~~ پامال کیا
آگ ہے دل میں ، درد جگر میں ، آنکھ میں آنسو ، دل میں فغاں
~~شورش دل اور دیدہ تر ہیں ، لب پہ فغاں اور درد جگر~~
عشق نے اس کے ذوق ہمارا اب تو یہ احوال کیا

(۱۲)

(ح) کیا کہوں کیا غم سے تیرے سنگ دل پیدا ہوا
کیا کہوں   کیا کیا ہے تجھ بن
~~مجھ کو کیا کیا کچھ قلق ہے~~ سنگ دل پیدا ہوا
خون دل پیدا ہوا آزار سل پیدا ہوا

تھی اسی دن اپنی روش ہوگئی
تیرہ بختی ~~اپنی ساری ہوگئی روش ہے~~
تھا جب ترے
عارض روشن پہ ~~تیری جب سے~~ تل پیدا ہوا

یا الٰہی کیا کہوں تیری عنایت کے سوا
میں نے کیا ایسا کیا جو ایسا دل پیدا ہوا

~~زلزلہ آوے گا ہووے گا تہ و بالا جہاں~~
~~اضطراب دل کہیں گر زیر گل پیدا ہوا~~

اس لب لعلیں پہ ہے یہ جلوہ گر رنگ مسی
یا کہ نافرمان و لالہ مشتمل پیدا ہو

غیر کے چھلے سے واں تو نے جو گل کھائے تو یاں
~~قصد گل کھانے کا تو نے جب کیا اے گلبدن~~
داغ تازہ داغ دل کے متصل پیدا ہوا

کرکے وعدہ رات کو جو راہ سے تو پھر گیا
~~پھر گیا وعدہ ؟ سے آ تو جو ذوق سے~~
~~پھر گیا تو کرکے یاں آنے کا وعدہ ذوق سے~~
~~وہم کیا کیا خلش دل میں ترے یہاں گل پیدا ہوا~~

(۱۳)

رشتہ شمع ہوا تار رگ
~~آتش غم سے جلا دل جو مری~~ جان میرا
ہائے روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا
~~رشتہ شمع بنا تار رگ جاں میرا~~

ہونٹ یاں چاٹتے ہیں اور وہاں
زخم دل ~~چاٹتے ہیں ہونٹ~~
~~لذت درد کا ہر زخم ہے خواہاں میرا~~
لعل لب کہتا ہے
~~تو بسا اور وہ کہتا ہے~~ کہ خالی ہے نمک داں میرا

کرکے بسمل مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ
دیکھ تر کیجو نہ خوں سے کہیں
(ح) دیکھ تر ہو نہ لہو سے کہیں داماں میرا

~~کلفتِ تار کو مجھ سے نہیں پروانہ چراغ~~
~~رشکِ خورشید ہے داغِ دلِ سوزاں میرا~~

کیوں نہ روشن دن ؟ رات کہ ہے
کنج غم میرا جو روشن ہو تو کیوں کر ہو
دل خورشید کو داغ دل سوزاں میرا

~~میں وہ دُر ہوں کہ~~ گردوں پہ ہے کرتا روشن
ہوں وہ دل سوختہ
چھوڑ دے دامن دل کا
ناخن دست جنوں راہ لے تو سینے کی
زیر
کہ خط جادۂ پنا چاک گریباں میرا
تھا جو کسی رخ کا تصور تو رہا
نزع* میں ~~نظر ہے جمالِ رخ جاناں مجھ کو~~
کھلا
شکل آئینہ ~~ہے کھلا~~ دیدۂ حیران میرا
اے جنوں تو بھی ہو دنیا میں یوں ہی خانہ خراب
~~مجھ کو اے عشق کہوں کیوں کہ نہیں خانہ خراب~~
سنک دل جیسا کیا تو نے ہے
~~خانۂ دل ترے ہاتھوں سے ہے~~ ویران میرا
~~ہوتے کاغذ پہ پریشان ہیں ہر سطر کے حرف~~
~~جب کبھی ہے کوئی احوال پریشاں میرا~~
~~جب کہ لکھتا ہے کوئی حال پریشاں میرا~~

نظم معنی کا بکھر جائے ابھی حرف سے حرف
شعرا باندھیں اگـــر حـــال پـــریشاں میرا
دے ~~لب جام جو بوسہ لب میگوں سے ترے~~
~~جام مے بوسہ جو لیوے لب میگوں کا ترے~~

~~کیوں نہ ہو جوش تبسم سے تو دنداں میرا~~

مبارک ہو ذوق
اپنا رونا مجھے ہنسنے سے ~~ہو جیتے گر یارو~~
دیکھ خنداں ہو جو وہ دیدۂ گریاں میرا
~~دیکھ کر دیدۂ پر اشک ہو خنداں میرا~~
(ح) خـــندۂ جام نہیں قہقہۂ مینا بھی نہیں
ہو تبسم سے بہم کیا لب و دنداں میرا

(۱۴)

دیکھ لو آخری دیدار اگر دیکھتے ہـــو
ہاتھ کیا خاک مرے سینے پہ دھر دیکھتے ہو

لالہ روئیدہ مری خاک سے ہے داغ بدل
اب بھی دل عشق سے ہے سینہ سپر دیکھتے ہو

(ح) اپنے اس ضعف کے قرباں کہ بنا صورتِ مو
ناتوانی کی میں ؟ کہ ہوا ہوں جوں بال
مجھ کو کم دیکھیے گر اپنی کمر دیکھتے ہو

(ح) پر پروانہ پڑے دیکھ لو پیراہن شمع
دیکھو یارو پر پروانہ پڑے شمع کے گرد
برگ ریزاں جو محبت کے شجر دیکھتے ہو

وحشیو! یاد کبھی آئے ہے مجنوں بھی تمھیں
بید مجنوں کو جو کھولے ہوئے سر دیکھتے ہو

آنکھیں میری جو پس از مرگ رہیں وا تو کہا
کس کی اب دیکھتے ہو راہ کدھر دیکھتے ہو
لذت ناوک غم پوچھو نہ اے چارہ گرو
خود بخود چاٹے ہے لب زخم جگر دیکھتے ہو
ذوق اس کوچہ میں مرغان ہوا گیر سے ہم
یوں بہ منت کہیں وحشت کا اثر دیکھتے ہو
(ح) ذوق اس کوچہ میں مرغان ہوا سے ہر روز
رو کے ہم کہتے ہیں وحشت کا اثر دیکھتے ہو
(ح) آشیاں واں نہ بنانا کہ ہو یہ دید بھی بند
تو نہ کیجے گا کہ ہو دید بھی بند
آشیاں واں نہ کہیں کیجے گا تا دید ہو بند
وہ جو تم سامنے اک روزن در دیکھتے ہو

(۱۵)

(ح) سرمہ سے
تم اشکِ سرمہ گوں عارض پہ کیا بہاتے ہو
(ح) صورت
یہ ہم کو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو
(ح) گلوری پان کی جو غیر کو کھلاتے ہو
گلوری پان کی غیروں کو تم کھلاتے ہو
(ح) ہمارے قتل پہ بیڑا یہ تم اٹھاتے ہو
ہمارے قتل کو بیڑا مگر اٹھاتے ہو
تم اپنے رخ پہ یہ سرمہ سے تل بناتے ہو
اختر تیرہ مجھے دکھاتے
کہ میرا اختر بخت سیہ دکھاتے ہو
عبث تم اپنی رکاوٹ سے مسکراتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی ، دیکھو مسکراتے ہو

(ح) اگر دباؤ کسی طرح کا نہیں تم کو
نہیں دباؤ کسی کا نہیں کسی کے دبیل
تو ہم سے بزم میں پھر
تو ہم سے بزم میں تم کان کیوں دباتے ہو

یقین صلح ہمیں جب ہو دے کے وہ بوسہ
کہیں کہ آؤ زباں سے زباں لڑاتے ہو

جو ہم سے بولنے کی تم نے قسم کھائی ہے
تو ہم کو دیکھ کے کیوں منہ میں بڑبڑاتے ہو

مریض عشق کو تم پوچھ کر طبیبوں سے
مدام شربت عناب کیوں پلاتے ہو

یہ خاک چاٹ کے کہتا ہوں میں ابھی ہو شفا
جو شربت ذرا
ذرا لب میگوں اگر چٹاتے ہو

جگر کے آبلے کب پھوٹتے ہیں حضرت عشق
یہ چٹکیوں میں ہمیں اپنی تم اڑاتے ہو

(ح) صبا نے کان میں یہ کیا کہا گلو تم سے
صبا یہ کہہ گئی کیا کان میں گلو تم سے
کہ لوٹے جاتے ہو پھولے نہیں سماتے ہو

نہ سوز عشق سے کیوں استخواں جلیں میری
تم آہ یوں نئے قلیاں کو منہ لگاتے ہو

قطعہ

ہماری لاش پہ آواز قم باذن اللہ
تم آ کے حضرت عیسیٰ[۴] عبث سناتے ہو

اٹھیں گے یار کی ٹھوکر سے ہم چلو کھسکو
نہیں تو پھر کوئی صلوات
نہیں کوئی صلوات آپ سن کے جاتے ہو

(ح) جلاؤ میرے سویدائے دل کو جائے سپند
ہمارے ہوتے سویدائے دل کے آہ سپند
نگاہ بد کے لیے تم ؟ جلاتے ہو

نہ کیجے آئینے میں عکس سبز خط پہ نظر
نگہ کی تیغ کو
تم آہ تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

لگی چھڑکنے سر زخم گل نمک شبنم
نمک چھڑکتی ہے شبنم جراحت گل پر
دکھا کے تم لب و دنداں جو کھلکھلاتے ہو

نثار ہو کے اس ابرو کے کہیے حضرت
یہ لب پہ نالۂ جانکاہ آپ لاتے ہو

و یا سمجھ کے اسے کعبہ اور بہ صدق و یقین
کوئی یہ نعرۂ لبیک تم سناتے ہو

وہ بیٹھا ہے بہ لب بام ہم دمو ، جلدی
اٹھاؤ میرا جنازہ اگر اٹھاتے ہو

یہ صید بستۂ فتراک کھل پڑے نہ کہیں
سمند ناز کو کیوں اتنا گدگداتے ہو

ہمارے واسطے دونوں طرح
غرض کہ دونوں طرح سے مجھے قیامت ہے
یہ دشمنوں کو جو تم درد سر بتاتے ہو

لگاؤں گھس کے جو صندل تو یہ کہو کہ مجھے
لگاوٹ اتنی بھلا کس لیے دکھاتے ہو

جو پڑھ کے سورۂ اخلاص دم کروں تو کہو
کہ دے کے دم مجھے اخلاص کیا جتاتے ہو

یہ طرز گفتگو زمیں
نہیں کچھ ایسی تومشکل یہ طرزگفتگوائے ذوق
کہ جس پہ زور طبیعت تم آزماتے ہو

(۱۶)

اُس قد کی دلا جو کبھی تصویر دکھا دو
تم شکل الف کھینچ کے، تحریر دکھا دو

ایسا نہ ہو وہ کند ہو رہ جاؤں میں بسمل
اول تو مجھے کھینچ کے شمشیر دکھا دو

پوچھے ہے حقیقت وہ مرے دل کی عزیزو
کوئی اسے بسمل شدہ نخچیر دکھا دو

لگتی ہے اگر آگ تو دکھلاتے ہیں مصحف
تم ؟ دل سوزاں کو یہ تدبیر دکھا دو

ہو ابر کے پردے میں خجل عقد ثریا
جھمکوں کو تم زلفِ گرہ گیر دکھا دو

نازاں ہیں وہ اے ذوق بہت تیغ نگہ پر
ذرا اک
تم بھی تو کوئی آہ کا ہاں تیر دکھا دو

(۱۷)

فلک تو دیتا نہیں
~~فلک نہ دیتا لگر~~ چشم اشک بار مجھے
الٰہی دے نہ جلا
~~جلاتی دے ہے~~ مری آہ شعلہ بار مجھے

وہ خط جو لکھتے نہیں جز خط غیار مجھے
تو شاید اپنا سمجھتے ہیں خاکسار مجھے

تمہارے ہاتھ سے ماہی سے لے کے ماہ تلک
دکھائی دیتے ہیں دلہائے داغ دار مجھے

لگائی وعدۂ دیدار کی جو حشر پہ قید
کیا ہے اس نے نظر بندِ انتظار مجھے

مکدر اتنا ہوا مجھ سے ہے وہ آینہ رو
کہ خط بھی لکھتا نہیں جز خطِ غبار مجھے

(۱۸)

جسے بیماری غم ہو اسے کیا یاد رہے
جان کا ہوش نہیں ، خاک دوا یاد رہے

تیغ ابرو وہ ہمیں کیوں نہ بھلا یاد رہے
موت انسان کو لازم ہے سدا یاد رہے

بندہ سے رات کا وعدہ ہے اگر بندہ نواز
بند میں دے گرہ آپ کو تا یاد رہے

کیوں کہ قاصد نہ بھٹک کرمرا الٹا پھر آئے
جب نہ معلوم ہو گھر اور نہ پتا یاد رہے

راہ میں دیکھ ہمیں منہ پہ عرق چین کو ڈال
یوں ہی مونہہ پھیر کے چلنا نہ بھلا یاد رہے

وائے قسمت کہ دیا ایسے کو ہم نے پیغام
جس کو نسیاں کے سبب سے نہ غذا یاد رہے

جب پھرے ہاتھ سے تیرے مری گردن پہ چھری
تجھ کو تکبیر ہے اس وقت ذرا یاد رہے
تجھ کو تکبیر ذرا پھر خدا یاد رہے

خاک برباد نہ کرنا مری اس کوچے سے
تجھ سے کہتا ہوں میں اے باد صبا یاد رہے

ہو نہ عاشق ترا آسودہ بزیر طوبیٰ
خلد میں بھی ترے کوچہ کی ہوا یاد رہے

باز آ جاؤ جفا سے کہیں دیکھو پیارے
یاد عاشق کو کیا کیجیے کا یاد رہے

زخم دل پر مرے ملتا ہے تو ایسا پھاہا
چارہ گر لیجو نہ ہاتھوں سے اٹھا یاد رہے

بھول جاتا ہے غم عشق میں انسان سب کچھ
نہ لکھا یاد رہے اور نہ پڑھا یاد رہے

محو اتنے نہ بتوں کے ہو تعشق میں ذوق
(ح) محو اتنے بھی نہ ہو عشق بتاں میں تم ذوق
(ح) گرچہ تم محو ہو یوں عشق بتاں میں اےذوق
چاہیے بندے کو ہر وقت خدا یاد رہے

(۱۹)

قتل کرکے مجھے چل دیجو سنا یاد رہے
~~وارث ویلا میں کسے خون بہا~~ یاد رہے

لاکھوں نخچیروں میں اک ہم بھی نہیں کیا تیرے
تیر پہلو ہی میں چھوڑو کہ پتا یاد رہے

نمک افشاں ہو سر زخم جگر اس نے کہا
کہ تجھے کچھ تو محبت کا مزا یاد رہے

یاد اس وعدہ فراموش نے غیروں سے بدی
یاد کچھ کم تو نہ تھے
یاد تو ....؟......؟ اور سوا یاد رہے

حسرت کے دو عالم کا ہے علم
دو ورق میں کف ~~افسوس کے~~..............؟
سبق عشق اگر تجھ کو دلا یاد رہے

تو اس نے
قتل عشاق پہ باندھی ہے کمر قاتل نے
پر خدا ہے کہ اسے نام مرا یاد رہے
(ح) پر بشرطیکہ اسے نام مرا یاد رہے

~~دے نشانی مجھے وہ قبلہ نما کہنے ہے~~
مجھ کو وہ قبلہ نما دے کے نشانی بولے
(ح) طائر قبلہ نما دل کو بنا کر بولے
کہ تڑپ کر یونہی مر جائے گا جا یاد رہے

سو کریں ہم پہ جفائیں تو رکھیں ایک نہ یاد
~~بھول جائیں وہ اگر لاکھ کریں ہم پہ جفا~~
بھولے چوکے ہووے تو
~~لیکن دن ایک بھی ہو جائے~~ وفا یاد رہے

کشتۂ زلف کے مرقد پہ تو اے لیلیٰ وش
بید مجنوں ہی لگانا کہ پتا یاد رہے
خاکساری ہے عجب جنس کہ ہو جتنی سوا
ہو صفا اور دل اہل صفا یاد رہے
خواہ لبیک حرم سنیے کہ ناقوس کنشت
چاہیے قلقل و مینا کی صدا یاد رہے

خط بھی لکھتا ہے تو قرطاس خطائی پہ مجھے
~~لب تلک مولے انہیں~~ میری خطا یاد رہے
(ح) کب تلک دیکھیے انہیں میری خطا یاد رہے
دیکھیے کب تک انہیں
ستوۂ عجز ہے انسان کو لازم اے ذوق
بھول جائیں جو خودی کو تو خدا یاد رہے

(٢٠)

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے
تو جانتا بھی ہے تری تقدیر میں کیا ہے

اے اہل نظر
~~اے آنکھو تم اس~~ عالم تصویر کو دیکھو
ہو کیا دیکھئے
تصویر ~~میں مت دیکھو کہ~~ تصویر میں کیا ہے

شانہ ہے کہ میرا دل دیوانہ صد چاک
معلوم نہیں زلف گرہ گیر میں کیا ہے
سیماب صفت کشتہ اگر خود ہو مہوّس
پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے
کیوں صید فگن سنگ پہ رگڑے ہے چھری تو
باقی ابھی دم اس ترے نخچیر میں کیا ہے
کیا کم ہے ترا تیر نگہ تیر قضا سے
اس تیر میں اب کیا نہیں اس تیر میں کیا ہے

جوں غنچۂ تصویر نہ کھلتا ہے نہ کھلتا
کیا جانے دل عاشق دل گیر میں کیا ہے

پھر سلسلہ جنبان جنوں ہے ترا عاشق
غل دیکھ پڑا خانۂ زنجیر میں کیا ہے

خنجر ہے ترے ہاتھ میں اور سر تہِ خنجر
کر ذبح مجھے فائدہ تاخیر میں کیا ہے

ہونٹ اپنے لگے چاٹنے زخمِ دلِ عاشق
کیا جانے اس آب دم شمشیر میں کیا ہے

کس کے لب شیریں کی ثنا کرتا ہے اے ذوق
اللہ حلاوت تری تقریر میں کیا ہے

ذوق اس لب شیریں کا ہے تو جب سے ثناگر
(ح) کیا کہیے حلاوت تری تقریر میں کیا ہے

(ح) مداح جو یوں اس لب شیریں کا ہے اے ذوق
پوچھو نہ حلاوت مری تقریر میں کیا ہے

(۲۱)

ستم گر
پری رو خوش...... کیا پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
ولیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے

کھیں تم سینہ وا جب رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے
معطر باد کی؟ سحر ایسے نہ ہوتے تھے

کسی کی فندقیں یاد؟ ورنہ مژگاں پر
نمایاں قطرۂ خون جگر ایسے نہ ہوتے تھے

دیے دشنام جو اس بد زباں نے آج کیا کہیے
کہیں نادم ہم اس کو چھیڑ کر ایسے نہ ہوتے تھے

خدنگ عشق کھا کر کوہ کن وصف حلاوت میں
لگا کہنے کہ شیریں نیشکر ایسے نہ ہوتے تھے

سفر ہے جان کا ورنہ قلق آگے بھی رہتا تھا
پریشاں ہوش جوں گردِ سفر ایسے نہ ہوتے تھے

برنگ کاغذ آتش زدہ خط کیوں نہ بن جائے
کہ مضمون سوز دل کے نامہ بر ایسے نہ ہوتے تھے

نہ دی تھی آب خوں سے ہم نے جب تک خار صحرا کو
برنگ نیشتر یہ تیز تر ایسے نہ ہوتے تھے

کبھی مجھ سے جو شور حشر دنیا میں بھی یہ ہووے
بپا ہوتے تھے یا شوریدہ سر ایسے نہ ہوتے تھے

کبھوں کوچے میں اس خوش قد کے کوئی دل ؟ تھا
کہ ہنگامے کبھیں عشاق پر ایسے نہ ہوتے تھے

نہ تھا قابو میں ان کے جب تلک دل ذوق وہ ہم سے
الگ کانوں پہ اپنے ہاتھ دھر ایسے نہ ہوتے تھے

(۲۲)

برق کب سے آشیاں میرا اٹھا کر لے گئی
چھوڑ خاکستر تو وہ آندھی اڑا کر لے گئی

ناتوانی مجھ کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر لے گئی
چیونٹی کی چیونٹی سے پر چھڑا کر لے گئی

پائے قاتل تک نہ بےتابی بڑھا کر لے گئی
ایک دو پلٹے دیے اور پھر ہٹا کر لے گئی

خون سے فرہاد کے رنگیں ہوا دامان کوہ
کیوں نہ موج جوئے شیر اس کو بہا کر لے گئی

چھوڑا تھا سوتا ہی تم نے ہمرہان قافلہ
لیکن آواز جرس مجھ کو جگا کر لے گئی

شرم نے فرصت نہ دی تیغ نگہ کے وار کی
میری قسمت کل مجھے قاتل بچا کر لے گئی

پوچھے ہے کیا سینہ کاوی جب گئی سینہ سے آہ
چارہ ہائے دل سے گلدستہ بنا کر لے گئی

ہے کشش دل کی فریبندہ کہ لیلیٰ ناقہ کو
سوے مجنوں آخرش رستہ بھلا کر لے گئی

تو خفا ہو کر گیا اور یاں مجھے دم بھر کے بعد
بد گمانی گھر ترے سو گھر پھرا کر لے گئی

(ح) ایک دن ہو گی تری شمشیر اور میرا گلو
ایک دن شمشیر ہووے گی تری اور یہ گلو
تو گئی کرتا سے اچھا پر جفا کر لے گئی

اک گھٹا تھی اور اندھیری کیا کہوں کس طرح رات
اس کے کوچے میں ہوس سو ؟ جتا کر لے گئی

دو قدم برق ؟ کی دکھا کر روشنی
آہ سوزاں دو قدم مشعل دکھا کر لے گئی

پوچھتا ہے لاش کیا اپنے شہید ناز کی
اس کو کیا جانے کدھر تقدیر اٹھا کر لے گئی

یہ بگولا دشت میں تھا یا کسی دیوانے کو
روح مجنوں پھر استقبال آ کر لے گئی

یہ کہا پروانے نے جل کر کہ جیتا آگ میں
کون جاتا تھا، وفا غیرت دلا کر لے گئی

تھا ابھی تو پاس میرے تیر کے تیرے سرے
لے گئی پہلو سے دل کیا پر لگا کر لے گئی

ذوق کوے یار کو جاتا ہے پھر دیکھو اجل
ایک تازہ خوں گرفتہ کو لگا کر لے گئی

(۲۳)

نہ کھینچو عاشق حسرت زدہ کے
نکال اے ناوک افگن تو نہ دل کو چیر
~~نہ اس حسرت زدہ کے کھینچ~~ اپنا تیر پہلو سے
نکالے پر ہے شکل ماہی تصویر پہلو سے

نکال اے ناوک افگن
~~ستمگر کھینچیے کیا سے~~ تو نہ دل کو چیر پہلو سے
گیا کب کا نکل ساتھ آہ کے وہ تیر پہلو سے

دل سیپارہ کوئی ٹانک تعویذوں میں بیکل کے
حمائل ہے جدا مت کر بت بے پیر پہلو سے
زہے الفت کہ قاتل بسمل بے دست و پا تیرا
چلا پابوس کو تیری تہ شمشیر پہلو سے
یہ تشنہ آب پیکاں کا ہے اس کا دل کہ اٹھے ہے
صدائے العطش جوں نالۂ شب گیر پہلو سے
ترے اشعار درد انگیز سن کر ذوق یاروں نے
اٹھایا پھر نہ اپنے ہاتھ کو تا دیر پہلو سے
کہا ناقہ کو پہلو ساربان نے ڈر کے پھر مجنوں
الگ رہنے لگا محمل کے یا تقدیر پہلو سے
عیاں ہیں پسلیاں کب لاغری میں عکس افگن ہیں
یہ تار بخیۂ زخم دل دلگیر پہلو سے
پاسباں
کوئی اے ساربان رہتا ہے بے زنداں یہ دیوانہ
دبا کر سو رہا ہے کیوں سر زنجیر پہلو سے
مصور لیلیٰ و مجنوں کی ناکامی پہ حیراں ہوں
کھینچ تو
ملا کر کھینچ تو تصویر کی تصویر پہلو سے
ترے اشعار درد انگیز سن کہ ذوق یاروں نے
آٹھایا پھر نہ اپنے ہاتھ کو تا دیر پہلو سے

(۲۲)

بینی ہے تیری چین جبیں سے صنم پرے
بے شک ہے شاخ سدرہ سے لوح و قلم پرے
رفتار وہ کہ فتنہ رہے سو قدم پرے
قامت وہ کھوے شور قیامت کو تم پرے
کہتا ہے کس کو ناز سے تو دم بدم پرے
تو دو قدم کہے میں رہوں سو قدم پرے
ہرگز ہوئے تڑپ کے نہ قاتل کے پائے بوس
گہ دو قدم ورے رہیں گہ دو قدم پرے

کرتا ہے اتنی گرم روی کس لیے شرار
ہستی سے کتنی دور ہے ملک عدم پرے

ہے ؟ شوخ دیکھ کے مژگاں اشارہ سے
کہتے ہیں دیکھ رہیو غزال حرم پرے

موجود تیرے پاس جو پٹی ہو زہر کی
مرہم کو زخم دل سے اٹھا رکھیں ہم پرے

ڈر موج ریگ بادیہ سے کیا ہے چل جنوں
ہو کر سوار کشتی نقش قدم پرے

حیرت نے کی یہ ضبط فغاں رک کے سینہ میں
دم تھا ورے ورے کا پرے کا تھا دم پرے

ہینگے شہید غم کے ترے
جائیں کہیں نکل کر اگر کس طرح سے جائیں
بے ڈھب گھرے ہیں حضرت دل آہ کیا کریں
تقصیر دل سے کیا ہوئی ایسی کہ گرد و پیش
چار طرف
باندھے کھڑی ہے کوسوں ورے موج غم پرے

طاقت یہ کہ ضعف سے تیرا مریض غم
سر کے جگہ سے صورت حرف درم پرے

فرہاد بیستون کو کاٹا تو کیا ہوا
تیشہ سے کب ٹلا ترے کوہ الم پرے

؟ کمند لوگوں نے جب مجھ کو آ لیا
دیوار بام یار پہ ہیں چڑھ کے دھم پرے

کچھ اپنی شرح سوز دل بے قرار آج
آیا تھا جی میں بیٹھ کے کیجئے رقم پرے

پر بل بے اضطراب کہ جوں آتشیں قلم
ہاتھوں سے جا پڑی مرے چھٹ کے قلم پرے

اے عشق یہ رہیں گی کہاں تک رکاوٹیں
یہ بھی ہے اک ادا جو شب وصل شرم سے
کچھ تو سبب ہے وصل کی شب جو رکے رکے
ہم سے پرے وہ بیٹھیں ہیں اور ان سے ہم پرے

کچھ دور تو نہیں جو قدم رنجہ کیجیے
کیا ہو جو ایک بار قدم رنجہ تم کرو
گھر سے تمھارے گھر ہے مرا دو قدم پرے

برگشتہ بخت وہ ہوں کہ پھر جائے شرم سے
مژگاں تک اس کی آ کے نگاہ کرم پرے

میں نے کہا کہ تم پہ نکلتا ہے دم مرا
بولے خدا کے واسطے یہ رکھیے دم پرے

دیکھو نہ جاؤ حضرت دل اس کی مانگ میں
رستہ نہیں ہے آپ کے سر کی قسم پرے

دل بھڑکے سوز غم سے ہے جوں آتشیں انار
چنگاریاں ہیں قندق پا رکھ قدم پرے

مطلع

لازم تھا تجھ سے بھاگنا او پر ستم پرے
تلوار بھی چڑھی تو رہا دو قدم پرے

(۲۵)

ذکر مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے
اس کی بے نشتر رگ جاں سے لہو نکلا کرے

بولنا اچھا نہیں تو چپ بھی رہنا کچھ نہیں
کچھ تو یاں جی کا بخار اے دل کبھو نکلا کرے

بزم میں لائے صبا اس گل کی جس دم بوئے زلف
شمع کے گل سے گل شب بو کی بو نکلا کرے

دیکھیں میرے آنسوؤں کی آب داری کو اگر
پھر تو دریا سے گہر بے آبرو نکلا کرے

مست کر دے وحشیوں کو گر تمھاری چشم مست
تا قیامت پھر دل آہو سے ہو نکلا کرے

(۲٦)

خط تیری مانگ کا جب یار نظر آتا ہے
کوئی کھینچے ہوئے تلوار نظر آتا ہے

جب ترا شعلۂ رخسار نظر آتا ہے
سرد خورشید کا بازار نظر آتا ہے

گھر میں جو روزن دیوار نظر آتا ہے
چشم ~~لنفی~~ مجھے بے بار نظر آتا ہے
اژدر

مست ہاتھی ہو تو
~~بیل جو مست ہے~~ بے بار نظر آتا ہے
مست کام اپنے میں ہشیار نظر آتا ہے

تم کو گر اے اولوالابصار نظر آتا ہے
دیکھو اغیار میں بھی یار نظر آتا ہے

تار سوزن سا تن زار نظر آتا ہے
تن پہ سر مجھ کو گرہ دار نظر آتا ہے

نشہ میں دیکھیو اس کے خط رخسار کا رنگ
خط ریحاں خط گلزار نظر آتا ہے

معنی رنگ خموشی سے جو آگاہ ہیں انھیں
برگ گل میں لب اظہار نظر آتا ہے

دل محبوس غم آتا ہے مجھے یاد اپنا
جب کوئی
جب کبھیں مرغ گرفتار نظر آتا ہے

کچھ جو راحت ہے تو ہے خواب عدم میں ورنہ
وہ ہے بے چین جو بیدار نظر آتا ہے

چشم عبرت تو ذرا کھول کہ مانند فلک
جو ہے سر کش وہ نگوں سار نظر آتا ہے

روتے ہیں دیدۂ سوزن جو مرے زخم کو دیکھ
تار اک آنسوؤں کا تار نظر آتا ہے

صید دل پر نہیں پڑھنے کا وہ کافر تکبیر
یہ تو ہوتا یوں ہی مردار نظر آتا ہے

ترے مجنوں کو ہے سامانِ جنوں سے تزئیں
داغِ سودا گلِ دستار نظر آتا ہے

مرے نالوں سے ہے وہ چشم مفتن بے خواب
آج فتنہ مجھے بیدار نظر آتا ہے

بوے گل بھی ہے یہاں بارکش منت باد
کوئی گلشن میں
کوئی بھی آہ سبکسار نظر آتا ہے

خنجر موج تبسم سے ترے گلشن میں
گل جگر چاک و دل افگار نظر آتا ہے

دیدۂ غول بیاباں ہے چراغِ خانہ
خانہ ویرانہ جو بے یار نظر آتا ہے

چشم دل کھول کے تو دیکھ ذرا سوئے فلک
کیا ہس پردۂ زنگار نظر آتا ہے

ترے ہاتھوں سے جنوں اب تو بجز تار نفس
اپنے جامہ میں نہیں تار نظر آتا ہے

دکھائی کم دے

بڑھ کے جو چمکے زمانہ میں ہو کم اس کی نمود
~~مہروش کی نہ زمانہ میں ہو ہر وقت نمود~~
روز کب اختر دم دار نظر آتا ہے

~~[illegible]~~
جو جوان مرد ہے محبوس علائق ......
شیر پنجرے میں گرفتار نظر آتا ہے

دیکھ کر اے بت سرکش ترے انداز ستم
شرم سے چرخ نگوں سار نظر آتا ہے

کاٹنے دوڑتا ہے گھر کہ نہیں وہ گھر میں
~~بن ترے دوڑے ہے گھر کاٹنے کو خانہ خراب~~
حلقہ در دہن مار نظر آتا ہے

دل پر وسوسہ کا عقدہ ہے قفل وسواس
اس کا کھلنا مجھے دشوار نظر آتا ہے

کہ آنکھوں میں مری
مژدہ اے آبلہ پائی ~~کہیں خوب ہے بھی~~
دامن وادی پر خار مظر آتا ہے

ہے وہ ماہ لقا
کم نمائی سے ~~ہے معشوق ہوا~~ عید کا چاند
کہ برس میں کبھی اک بار نظر آتا ہے

آسماں کو نہیں کچھ دفتر تقدیر میں دخل
یونہیں اک نقطہ بیکار نظر آتا ہے

چھایا
کفر پھیلا تری آنکھوں سے جو مے خانہ میں
گردش شیشہ میں زنار نظر آتا ہے

اہل صفا
محبت ~~خانہ ملا~~ دیتی ہے جھکا سر کش کو
نخل پانی میں نگوں سار نظر آتا ہے
تنگ جو زیست سے ہیں تختہ تابوت انھیں
مر کے
~~عجب~~ اک تخت ہوادار نظر آتا ہے

در مضموں میں ترے
ہے ~~قبلہ در سخن~~ ذوق بہت بیش بہا
کوئی کم اس کا خریدار نظر آتا ہے

(۲۷)

دکھلا نہ خال ناف تو اے گل بدن مجھے
ہے اشتیاق نافۂ مشک ختن مجھے

سوجھے چمن میں کیونکہ نہ دیوانہ پن مجھے
زنجیر پا ہے موج نسیم چمن مجھے

شکل امام دانۂ تسبیح ہم نشیں
بخشی ہے حق نے زیب سر انجمن مجھے

چھڑکے ہے زخم دل پہ نمک وہ دلا کے یاد
دندان آب دار گل یاسمن مجھے

محراب کعبہ ہے مرے حق میں تری کہاں
صید حرم ہوں جانے دے ناوک فگن مجھے

مانند ریشہ ہاے نئے خشک استخواں
لگتے ہیں تن میں اب سبب ضعف تن مجھے

دکھلاتے ہیں عبث سے ؟ کہ یار
بے جرم چاہئیں ہے عقیق یمن مجھے

سوز و گداز عشق میں جوں تار شمع آہ
یکسر وبال جان ہیں یہ پیرہن مجھے

بن تیرے باغ میں گل مہتاب تازہ تر
سوجھے ہے شکل پنبۂ داغ کہن مجھے

~~ملتت زہان تیشہ سکو پہنچی تر بیدن کہا~~
~~دشوار لگے جب خون سے سکو کہنے مجھے~~

میں بے کس و شہید قمر طلعتاں ہوں آہ
دے کون غیر چادر ماہ اب کفن مجھے

کوچہ میں تیرے چادر مہتاب کے سوا
دے گا نہ غیر ؟

~~مہ بیکسی میں کون ہے~~ دیتا کفن مجھے

رخ پر تمہارے...... خط مشک بار میں
~~وہ حلم حلقہ خط مشکیں ہے تیرا سولو~~
آتا نظر ہے دیدہ
~~سوجھے ہے جس~~ دیدۂ عنقا دہن مجھے

کیوں کر ہو اس سے وصل جو دستِ خیال سے
چھونے نہ دیوے خواب میں بھی پیرہن مجھے

رم
تابش سے تن کی مرج دم برق کی طرح
سوجھے ہے آستیں کا تری ہر شکن مجھے
جام شکستہ ساں نظر آیا ہلال عید
بن تیرے آہ ساقی پیماں شکن مجھے

جیسے کہ ہو
جس وجہ ہو کنویں میں کبوتر کا آشیاں
(ج) جیسے کنویں میں کوئی کبوتر کا آشیاں
سوجھے ہے یوں دل اس کے میان ذقن مجھے
کیا دانہ ؟ رشتہ کے عکس کو
ہر بار تو دکھائے ہے نازک بدن مجھے
ٹک بر میں اپنے پھینک کے پیراہن سفید
دکھلا دے اپنے موے کمر کی پھبن مجھے

ٹک دل لگی کے واسطے میرے جنوں میر یار
لے کر چلے بجانب صحن چمن مجھے
ہر داغ لالۂ چمنستاں نظر پڑا
وحشت میں شکل چشم غزال ختن مجھے

ہے نور تجھ سے حلقۂ اہل سخن میں ذوق
کیوں کر اٹھائیں سر پہ بٹھلائیں آنکھوں پر
~~میرے سخن سے رونق بزم سخن ہے ذوق~~
کیوں کر نہ آفریں کہیں اہل سخن مجھے

(۲۸)

تیر پہلو میں لگا دلبر جانی مانگے
یہ بھی ہوتا ہے کوئی دے کے نشانی مانگے

دم رکا جاتے ہے اس کم سخنی سے تیری
موت گھبرا کے نہ کیوں یہ خفقانی مانگے

خاک سے تشنۂ دیدار کی تیرے پس مرگ
نکلے جوں سبزہ زباں اور وہ پانی مانگے

... ... و ... ...
ان کے سر کا نہ دشالہ کوئی دھانی مانگے

ذوق پروانہ صفت دینے کو جاں حاضر ہے
شمع رو اس سے اگر اپنی زبانی مانگے

مطلع دیگر

حکم جلاد جو خوں کا مرے ثانی مانگے
پہلے اس پر پڑے ایسے کہ نہ پانی مانگے

'ح - ۱' اور 'ح - ۲' آن غزلوں پر مشتمل ہیں جن میں آزاد باقاعدہ طور پر مصروف اصلاح و ترمیم دکھائی دیتے ہیں - 'ح - ۱' میں اس اصلاح اور رد و بدل کا وہ زور نہیں جو 'ح - ۲' میں ہے ، جہاں اصلاحات کا یہ سلسلہ انتہائی صورت لیے ہوئے ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ آزاد ، ذوق کے زیر بحث اشعار کی اصلاح نہیں کر رہے بلکہ خود اپنی کاوش سے اشعار کہہ رہے ہیں - آخر یہ مشکوک طریق کار کیوں اختیار کیا گیا - معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ، ذوق کے ایسے اشعار جو انہیں کسی وجہ سے ناپسند تھے یا ایسے اشعار جن کے مضامین تو انہیں یاد تھے لیکن اشعار فراموش ہوگئے تھے یا ایسے اشعار جن کے

صرف ردیف و قوافی یاد تھے اور مضامین ذہن سے نکل گئے تھے ، بطور خود کہہ رہے ہیں ۔ صرف یہی نہیں ، ان مسودات ، خصوصاً 'ح - ۲' کے سرسری مطالعے سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ یکے بعد دیگرے مختلف بلکہ متخالف مطالب کو مقررہ ردیف و قوافی کی حدود میں قلم بند کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں اور آن مطالب کو جو ان حدود میں قلم بند نہیں ہو سکے یا انھیں موزوں معلوم نہیں ہوتے ، ترک کرتے ہوئے وہ بالآخر ان مضامین کو انتخاب کرتے ہیں جو یا تو انھیں مناسب ترین معلوم ہوتے ہیں یا جنھیں وہ ان حدود میں ادا کر سکتے ہیں ۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، 'ح - ۱' کی غزلیں ایک یکساں قسم کے فل سکیپ کاغذ پر ایک مختصر سے مسودے کی شکل میں درج ہیں ۔ اس کے برعکس 'ح - ۲' کی ایک دو غزلوں کے علاوہ ، جو آن دنوں کے مروجہ خط و کتابت کے کاغذ پر درج ہیں ، باقی تمام یا تو سیالکوٹی کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں یا امتحانات کے استعمال شدہ پرچوں کی پشت پر اور بیشتر محکمۂ ریل کے چھپے ہوئے فارموں کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں پر درج ہیں ۔ بعض غزلوں میں قطع و برید کا یہ سلسلہ اتنا بڑھ گیا ہے اور غیر مطبوع اصلاحات کو ایسی بری طرح کاٹا گیا ہے کہ ان مسترد اجزا کا پڑھنا صرف دشوار ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے ۔

چوں کہ ان کاغذات پر نقل کردہ غزلوں کے مطلعے عموماً 'الف' سے مختلف ہیں لہذا ذیل میں وہی مطلعے درج کیے جاتے ہیں جو 'الف' میں درج ہیں ۔ ('الف' کے مطلعے

ان ترمیمات کی آخری شکل ہیں) - ہر ایک مطلع کے آگے 'الف' کے صفحے کا وہ نمبر دیا گیا ہے جس پر وہ غزل درج ہے - نیز جہاں کسی غزل کے ایک سے زیادہ مسودات ہیں ان کی تعداد بھی درج کر دی گئی ہے -

(ح - ۱)

(۱) دشمن جاں یک بیک سارا زمانہ ہو گیا ص ۸۱
(۲) کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا ص ۸۲
(۳) بہ رنگ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا ص ۸۳
(۴) ان سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا ص ۸۴
(۵) چاہے عالم میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا ص ۸۴
(۶) لخت دل اور اشک تر دونوں بہم دونوں جدا ص ۸۵
(۷) لعل لب و دندان صنم کا دل نے جب سے خیال کیا ص ۸۵
(۸) ہجر میں کیا کیا مرض ہے سنگ دل پیدا ہوا ص ۸۶
(۹) رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا ص ۸۶

ح - ۲ میں مندرجہ ذیل غزلیات درج ہیں :

(۱) جل اٹھا شمع نمط تار رگ جاں میرا ص ۸۰
(۲) دشمن جاں یک بیک سارا زمانہ ہو گیا ص ۸۱
(۳) کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا ص ۸۲
(۴) برنگ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا ص ۸۳
(۵) ان سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا ص ۸۴
(۶) رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا ص ۸۶
(۷) بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر ص ۱۱۱
(۸) کون سا ہمدم ہے تیرے عاشق بے دم کے پاس ص ۱۱۴
(۹) تیر و کماں ہے گر بت ناوک فگن کے پاس ص ۱۱۵
(۱۰) ہے چشم تیری مست قدح گیر باغ حسن ص ۱۲۶

(۱۱) سلام کرتے ہیں ان کو جدھر کو دیکھتے ہیں ص ۱۳۲

(۱۲) ہووے تواے مہروش جب پرتو افگن آب میں ص ۳۵-۱۳۴

(۱۳) آفت جاں دل کو ہیں تن کے قفس کی تیلیاں ص ۱۳۹

(۱۴) ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو ص ۱۶۲

(۱۵) عبث تم اپنی رکاوٹ سے منہ بناتے ہو ص ۱۶۳

(۱۶) جو کبھوے قد یار کی تصویر دکھا دو ص ۱۶۳

(۱۷) دل کے مفلس جو تونگر تھے تو کیا پتھر تھے ص ۲۳۷

اگر 'ح - ۱' اور 'ح - ۲' کو ایک وحدت خیال کیا جائے تو اس مجموعے میں :

دشمن جاں کیوں مرا سارا زمانہ ہوگیا

کے تین (۳) مسودات ہیں اور :

کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا
برنگ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا
آن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا

اور : رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا

میں سے ہر ایک کے دو مسودات ہیں ۔

ذیل میں 'ح - ۱' اور 'ح - ۲' کی نقول درج ہیں ۔ نیز ان کے 'الف' میں مندرجہ غزلیات کے مقابلے سے قارئین خود فیصلہ کر لیں گے کہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے آزاد کو کن دشوار گزار اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا ۔ نیز اس رد و بدل اور ترمیم و اصلاح بلکہ عمل تخلیق میں وہ کہاں تک حق بجانب تھے ۔

(۱)

(ح - ۱)

~~کیوں مرا سارا زمانہ ہو گیا~~

~~دوست دشمن ہو گیا اپنا بیگانہ~~ ہو گیا

~~ہم نے سوچا اور تھا یہ طور کیا ہو گیا~~

~~ہائے تاثیر غم الفت تجھے کیا ہو گیا~~

ہم نے تم سے دوستی کی تم ہو کرتے دشمنی

ہائے تاثیر محبت یہ غضب کیا ہو گیا

ہم نے سوچا اور تھا یہ طور کیسا ہو گیا

جس کو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا

سوکھ کر ایسا ہوا دبلا کہ کانٹا ہو گیا

جب نشہ اس کو شراب لالہ گوں کا ہو گیا

پہلے تھا گلرنگ مکھڑا

~~رنگ روئے آتشیں اور ایک~~ بھبھوکا ہو گیا

تجھ میں تھا یا مجھ میں تھا پھر کہو کیا ہو گیا

~~یک بیک پہلو سے دل غائب جو میرا ہو گیا~~

دل کے جانے کا تو عالم کو

~~کس طرف دیکھیں کہاں ڈھونڈیں~~ اچنبھا ہو گیا

جب اٹھا

~~دیکھ کر~~ تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ

شور و غل تھا ماتم و غم

شور و غل اک حسرت و افغاں کا برپا ہو گیا

تو نے جو عزم سفر کا ہم کو تھا بھیجا پیام

~~اپنے منہ سے کیوں نکالا تھا سفر کا تو نے نام~~

کوچ دنیا ہی سے اے ظالم ہمارا ہو گیا

پھر چلو اے حضرت دل ہو چکا ملنا بس اب

~~ہو چکا دنیا میں بس رہنا ہمارا ہم دمو~~

آج گھر میں غیر کے پھر

~~آج گھر میں غیر کے~~ ان کا رہنا ہو گیا

مرنا جینا اک جہاں کا ہے نگہ میں تیری آہ
~~ہیں نگہیں تیری وہ قاتل کہ کشتہ اک جہاں~~
تو وہ ہے جس کی طرف جو تو
~~جس طرف کو آنکھ بھر کر~~ تو نے دیکھا ہو گیا

خط لکھا مجھ کو تو کیا پورا نہیں ہے نام بھی
~~نام بھی خط پر لکھا میرا تو آدھا ہی لکھا~~
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

اک تو وہ شعلہ تھا جب میں نے کہا ہو شعلہ رو
~~جب کہا میں نے جلایا کیوں مجھے اے شعلہ خو~~
اس لطیفہ سے بھڑک کر
~~سنتے ہی اس بات کے وہ~~ آگ دونا ہو گیا

غیر کے گھر ہم سے تو اڑ کر اگر پہنچا تو کیا
~~کیا ہے انکار کیوں جانے سے تو گھر غیر کے~~
تیرے جانے کا تو ہے
~~لیک تو جانے کا ترے~~ عالم میں چرچا ہو گیا

~~آتے ہیں~~ آتا ہے منہ پر
گرم ہو کر آتا ہے منہ پر ترے طفل سرشک
دیکھ کیا اے چشم تر ابتر یہ لڑکا ہو گیا

کر دیا تیغ نگہ نے تیری ایک عالم کا خون
نام بدنام اے صنم ناحق قضا کا ہو گیا

~~زلف تیری شانے میں اور شانہ ہے ہے کشمکش~~
~~میں نے جب چھیڑا ذرا تو برہم اتنا ہو گیا~~

یاد زلف عنبریں میں رات بھر آہیں بھریں
~~رات جو یاد آ گئی مجھ کو وہ زلف عنبریں~~
آسماں سارا دھویں سے دل کے کالا ہو گیا
~~ہم نفس آہ کہ سارا چرخ کالا ہو گیا~~

ذوق نے ہو زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم
تو نے خود چھیڑا اسے اور برہم اتنا ہو گیا

اس کے غمزے نے ہے اک عالم کو مارا جان سے
نام بد اے ذوق ناحق ہے قضا کا ہو گیا

(۲)

کوہ کے چشموں سے پانی ہے
~~چشمۂ کوہ سے ہے آب~~ نکلتے دیکھا
تیرے دل کو مرے غم سے
~~سخت دل پر ترا کافر نہ پگھلتے دیکھا~~

آتا ہے میرا دم جس طرح
ضعف سے سینہ میں ~~لب دم کا عالم ہے کہ یوں~~
ریگ کو شیشہ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

میں
ہوں وہ اس باغ میں نخل گل آتش بازی
پھولتے دیکھا اسے آہ نہ
~~غم شعلہ نہ جیسے~~ پھولتے پھلتے دیکھا

اس رخ و زلف کے آگے نہ ہوا مہ کو فروغ
~~زلف شب رنگ ترے رخ پہ چہل دیکھ کے~~
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا
گہوارہ میں یہ لڑکا نہ سنبھلتے دیکھا

کوئے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم اے ذوق
ان کو دیکھا نہیں پر تم کو نکلتے دیکھا

جنبش سبزہ کے سوا کسی نے تجھے
اے صبا ~~کس کو بجز جنبش سبزہ تربت~~
مور چھل گور غریباں پہ ہے جھلتے دیکھا

جو چڑھا ہے وہ گرا ہے کہ یہاں جوں سایہ
~~جو بلندی پہ چڑھا ہے وہ گرا ہے آخر~~
کس نہ
پاؤں دیوار سے سائے کا پھسلتے دیکھا

زلف کیوں کر نہ
~~کیوں نہ وہ زلف~~ در گوش پہ لہرائے ہوا
کہ سر بیضہ سے ناگن کو نہ نلتے دیکھا

جا چھپا شرم سے ظلمات میں جو آب حیات
تجھ کو دانتوں پہ مسی آیا کہیں ملتے دیکھا
نہ گئی ہم سے ترے ابرو کی
کج ادائی کا سبب ابروے جاناں کا نہ پوچھ
کہیں خم ہے
شاخ آہو سے ؟ خم نکلتے دیکھا

(۳)

برنگ گل صبا سے وا ہو گیا
~~صبا سے ہو شگفتہ کس روش~~ دل گیر دل میرا
کہ ہے باغ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا
ورق پر سینہ کے کھینچا ہے
~~کرے ہے صفحۂ سینہ~~ تار اشک سے مسطر
کرے گا شرح درد عشق کیا
~~غم ہجراں کیا چاہے ہے کچھ~~ تحریر دل میرا

خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
تلاوت کرتا ہے قرآن با
~~پڑھے ہے ان دنوں شاید کوئی~~ تفسیر دل میرا
سنبھالے رکھیو تو اے چرخ واژوں اپنے دامن کو
زمیں پر
~~کس ہر شب~~ کھینچتا ہے نالۂ شب گیر دل میرا

بتاں کی سرد مہری سے ہے یا کہ
~~نہ سمجھو رنگ زرد اس کو کہ ہے~~ یہ زعفران پھولی
کرے کیا گرم جوشی ہو گیا
~~بھرے کیوں نہ کو نہ آسرد ہے~~ کشمیر دل میرا

تری چشم فسوں گر اے پری وش طرفہ جادو ہے
کیا ہے اک نگہ میں اے بتو ———
~~کہ اس نے اک نگہ میں کر لیا~~ تسخیر دل میرا

تصور میں کسی تیغ نگہ کے کشور الفت
~~خیال ابروئے جاناں جدا ہوتا نہیں دل سے~~
ہوا تسخیر کرکے صاحب شمشیر دل
~~بڑا جانکا ہے دکھتا ہے مثل شمشیر~~ دل میرا

بتوں کے حسن سے گر ہو گیا دل
~~دل سنگیں ترا گر اے صنم والہ~~ سنگ پارس ہے
ہوا ہے کیمیائے عشق سے اکسیر دل
~~تو کشتہ ہو کے یاں بھی ہے بنا اکسیر دل~~ میرا

کبھی منت کی زنجیر ان کو پہنے اس نے دیکھا ہے
ہے اب تک پہنے تار اشک کی زنجیر دل میرا

ذرا سا اپنا دامن میں تیرے جاناں
لگا دوں ~~خون ہی اس کا یار جا کر تیرے دامن کو~~
قیامت میں ترا تا ہوئے
~~کہ تا حشر میں ہووے تیرا~~ دامن گیر دل میرا

بتوں کے عشق سے ہو ہو کے رسوا اک خدائی میں
~~بتوں سے جا لپٹتا ہے یہ میں بدنام ہوتا ہوں~~
مجھے اے ہے کرتا رہا
~~جہاں میں~~ ذوق ~~کرتا ہے مجھے~~ تشہیر دل میرا

(۴)

وصل کا ذکر
ان سے کچھ ~~ذکر ملا~~ اب نہیں لانا اچھا
(ح) وہ جو کچھ کہویں تو تو بھی کہے جانا اچھا
جو وہ چاہیں کہیں تو بھی کہے جانا اچھا
آپ نے دشمن اگر بندہ، کو

~~ہم کو دشمن ہے لگر آپ نے بلند~~ اچھا

ہے پر

دوست ناداں سے ~~تو ہے~~ دشمن دانا اچھا

پھول گل مہندی کے لا لا کے چڑھاتے ہو جو تم

~~کشتۂ دست نگاریں ہوں، مری تربت پہ ہے~~

خون عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

~~پھول گل مہندی کے لا لا کے چڑھانا اچھا~~

طاق ابرو کے تصور میں دلا

~~دیکھ کر ابروئے جاناں کو دلا~~ کھینچ نہ آہ

سمتِ کعبہ پہ نہیں تیر لگانا اچھا

کے سوا کوچۂ جاناں کی طرف

طائر جاں ~~کے سوا کوچہ اور~~

کون ہے جو

نامہ بر کون سا اب کیجیے روانہ اچھا

بدگماں دیکھ کچھ اس میں بھی نہ ڈالیں

~~دیکھ کچھ اور نہ شاید نکالیں~~ رخنہ

روزنِ در سے نہیں آنکھ لڑانا اچھا

آتش عشق ہے سینے میں دبو دیکھ اے چشم

~~پھر بھڑک جلنے لگا ایسے دل آتش عشق~~

اب نہیں دامنِ مژگاں کا ہلانا اچھا

بیٹھ رہ کرکے قناعت کہ یہ شکل مہ تو

چھوڑی آدھی تو نہیں ساری کو جانا اچھا

مرغ دل نے نگہ یار سے پوچھا اڑ کر

پھر بھی کہنا کہ لگاتے ہیں نشانا اچھا

یاں تو دم میں نہیں دم اور وہ ~~ہیں کہتے ہیں~~

دیکھو دیکھو نہیں یہ دم کا چرانا اچھا

تیری زلفوں کو تو پھر

طرہ شمشاد دکھائے ~~ہے تری زلفوں کو~~

لاؤ ارہ کہ یہی اس کو ہے

~~غیر اوہ نہیں اس کے لیے~~ شانہ اچھا

ساقیا دیکھ گھٹا آئی گھٹا آئی بہا دے دریا

~~ابر ہوتا ہے مری جان کو ساقی~~
ہمت کا

ہیں اس دور میں ~~دل دیکھ~~ گھٹانا اچھا

خون دل سوختہ کا قطرہ ہے ~~جو ہو~~ ایک

~~قطرۂ خون دل سوختہ~~ اشک آلود

تو نہیں یہ پنجہ مژگاں سے گرانا

~~دست مژگاں میں نہیں ہے گرانا~~ اچھا

مدت العمر میں

~~بعی مدت میں بس تسبیح~~ سلیمانی کا

آج اک ہاتھ لگا ہے مرے دانا اچھا

سامنے یار کے اے ذوق بہانا آنسو
تو

ہے یہ چاہت کے جتانے کو بہانا اچھا

(۵)

چاہے عالم

~~ہو نشہ غربت~~ میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا

دیکھ چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا

کیجو مشاطہ نہ سبزہ گوش دلبر سے جدا

بد نما ہے گر رکھیں مینا کو ساغر سے جدا

دل مرا یارب نہ ہو زلف معنبر سے جدا

سر جدا ہو تن سے یہ سودا نہ ہو سر سے جدا

لکھے شرح سوزش ہجراں جو تیرا بے قرار

(ح) ہو تڑپ کر جوں شرر ہر نکتہ دفتر سے جدا

جوں شرارہ ہو چمک

~~کیا عجب گر ہو اچھل~~ کر نکتۂ دفتر سے جدا

(ح) فندق پائے نگاریں کا ہوں سودائی اگر

فندق ہائے نگاریں کا ہے سودا اے جنوں

~~دل ہے یہ پیوستہ غم سے قطرۂ خوں بھی سہا~~

قطرہ خوں بھی نہ ہوگا

~~صورت خندق نہ ہوگا~~ نوک نشتر سے جدا

شیشۂ دل میں ہے کیا چمکا شرار عشق یار

~~چمکے ہے داغ جنوں سر پر تب ہوئے سینہ~~

شیشہ گر رکھتے ہیں کیوں

~~ہونسیاں رکھتے ہیں سب~~ شیشہ کو اخگر سے جدا

خط شرح نــاتوانی ہــو گیا اڑتے ہی آہ

جوں پر کمزور بازوے کبوتر سے جدا

جس طرح شیطاں نے آدم کو نکالا خلد سے

غیر نے ہم کو کیا ہے کوے دلبر سے جدا

ہووے اور ماءالحیات

شربت قــنــد مکرر ~~حق میں ہو جائے گا ہے~~

بسمل خنجر کو تو جب کر دے

~~ہو کرے قاتل اگر اس طرح~~ خنجر سے جدا

پھیر لے تیغ نگہ اور پھر کہے حسرت سے تو

پھیرے پھر تیغ نگہ اور یوں کہے حسرت سے تو

سر تجھ سے جدا

ہائے ~~تیرا سر جدا ہو~~ اور تو سر سے جدا

ذوق ہے ترک وطن میں صاف نقص آبرو

بکتے پھرتے ہیں گہر ہو کر سمندر سے جدا

(٦)

لخت دل اور اشک تر دونو بہم دونو جدا

ہیں رواں دو ہم سفر دونو بہم دونو جدا

میں نہ چکوا ہوں نہ وہ چکوی پھر آخر کس لیے

رہتے ہیں شب تا سحر دونو بہم دونو جدا

نکہت و گل کی طرح ہم اور وہ صلح و جنگ میں
رہتے ہیں کیوں ہم دگر دونو بہم دونو جدا
شکل عکس و آئنہ تیرا خیال اور میرا دل
آئنے میں سیم بر ، دونو بہم دونو جدا
دل جگر سینے میں اوراق جلاجل کی طرح
ذوق ہیں با شور و شر دونو بہم دونو جدا
(ح) ذوق ہیں سینہ میں اوراق جلاجل کی طرح
دل جگر با شور و شر دونو بہم دونو جدا

(۷)

لعل لب و دندان صنم کا دل نے جب سے خیال کیا
''صم بکم'' کہہ کے ہے گویا ہم نے زباں کو لال کیا
لے گا دلا اس عشق سے کیا تو جس نے کوہ و صحرا میں
مجنوں کا وہ حال کیا ، فرہاد کا ہے وہ حال دیا
پھرتا ہے تواے چاند کے ٹکڑے بسکہ شب و روز آنکھوں میں
دل نے روشن ہو کے شب فرقت کو ہے روز وصال کیا
آتش گل ہوئی روشن واں ، یاں چمکا ہمارے دل کا جنوں
موسم گل نے کیا ہنگامہ گرم ہے اب کے سال کیا
سادہ رخوں سے کی جو محبت تیری ہی تھی یہ سادہ دلی
منہ چڑھ کر اس شوخ کے اپنا کالا منہ ہے خال کیا
مو قلم ایسا لاؤں کہاں سے جو یہ کرے تحریر اسے
حال تو دیکھو تم نے مجھے ہر موئے تن ہے وبال کیا
نامۂ یار کو رکھ دیجو تو ہم دم میرے زیر کفن
ہے یہ جواب نامہ مرا گر مجھ سے کسی نے سوال کیا
شمع نمط ہر خار جنوں کی آنگلی پگھلی جاتی ہے
دشت جنوں کو ہم نے ناحق آبلہ سے پامال کیا
آگ ہے دل میں درد جگر میں آنکھ میں آنسو لب پہ فغاں
عشق نے اس کے ذوق ہمارا اب تو ہے یہ حال کیا

(۸)

ہجر میں کیا کیا ہے تجھ بن سنگ دل پیدا ہوا
ہول دل پیدا ہوا ، آزار سل پیدا ہوا

تیرہ بختی تھی اسی دن اپنی روشن ہو گئی
عارض روشن پہ تھا جب تیرے تل پیدا ہوا

یا الٰہی کیا کہوں تیری عنایت کے سوا
میں نے کیا ایسا کیا جو ایسا دل پیدا ہوا

غیر کے چھلے سے واں تو نے جو گل کھائے تو یاں
داغ تازہ داغ دل کے متصل پیدا ہوا

اس لب لعلیں پہ ہے یہ جلوۂ رنگ مسی
یا کہ نا فرمان و لالہ مشتمل پیدا ہوا

کرکے وعدہ رات کو جو راہ سے تو پھر گیا
وہم کیا دل میں ترے پیماں گسل پیدا ہوا

خاکساری نے اسی دن روشنی پائی تھی ذوق
آدم خاکی کا جس دن آب و گل پیدا ہوا

(۹)

رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا
سوز دروں وہی ہے پہ ہوں گے نہ داغ پا

تو باغ میں جو آ کے رکھے رشک باغ پا
رکھے چمن میں آ کے جو وہ رشک باغ پا

پھر آئے
~~آئے ادھر~~ گر حزاں تو وہیں ہوویں داغ پا

آئے وہ میرے گھر میں رقیبوں کو لے کے آہ
بلبل کے آشیاں میں رکھے حیف زاغ پا

گر کوئے یار میں نہیں ملتا پتا تو پھر
تو کوئے زلف یار میں دل کا سراغ پا

روئے گی پھوٹ پھوٹ کے ہر چشم آبلہ
کوہ
جوش جنوں میں رکھ نہ سوئے باغ و راغ پا

ہم دل جلوں کی خاک پہ رکھیو نہ تو قدم
اس سے تو ڈال دیجو میاں اجاغ پا

اس گل سے کر اجازت پابوس ہو نصیب
ہو جائے چوم کر مرا دل باغ باغ پا

اچھلے ہے شیخ وجد میں اس طرح بار بار
جس طرح بد لگام ہو گھوڑا چراغ پا

گردش سے چشم یار کی ہے کیا عجب کہ پائے
شکل حباب آب رواں گر ایاغ پا

ساقی کنار جو پہ جو دے بھر کے جام تو
پائے حباب آب رواں سے ایاغ پا

ہے جی میں آب جو نمط اے سرو خوش خرام
دھو دھو پیا کریں ترے ہم بے دماغ پا

اے ذوق کیوں چمن میں وہ گل جائے جس کے ہوں
رنگ حنا سے غیرت صد باغ و راغ پا

(ح - ۲)

(۱)

رشتۂ شمع ~~نہیں~~ تار رگ جاں میرا
ہائے روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا

زخم دل چاٹتے ہیں ہونٹ مزے لے لے کر
اور وہ
~~تو یہ~~ کہتا ہے کہ خالی ہے نمک داں میرا

کر کے بسمل مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ
دیکھ تر کیجو نہ خوں سے کہیں داماں میرا

~~دل غم دیدہ جو روشن ہو تو کیونکر ہو~~
~~دل مرا آہ جو روشن ہو تو کیونکر ہو کہ~~
دل غم دیدہ جو روشن
~~کنج غم میرا جو روشن ہو تو کیونکر ہو~~
~~دل میرا زیر فلک صاف ہو کس طرح کہ ہے~~
~~دل کہ ہے خورشید میں داغ دل سوزاں میرا~~

ناخن دست جنوں دامن دل میں اُلجھ ۔ چھوڑ دے دامن دل کا
ہے خط جادہ ترا چاک گریباں

کسی رخ کا تصور
نزع میں بھی تھا ~~خیال سوزش جانانہ~~ کہ رہا
شکل آئنہ کھلا دیدۂ حیراں میرا

اے جنوں تو بھی ہو دنیا میں یوں ہی خانہ خراب
خانۂ دل ترے ہاتھوں سے ہے ویراں میرا

حرف سے حرف ہے کاغذ پہ پریشاں ہوتا
ہے قلم لکھتا اگر حال پریشاں میرا

خندۂ جام نہیں قہقہۂ مینا بھی نہیں
آشنا خندہ سے کیا ہو لب و دنداں میرا

اپنا رونا مجھے ہنسنے سے مبارک ہو سوا
دیکھ خنداں ہو جو وہ
~~ہے کبھی ہنستے ہوئے~~ اگر دیدہ گریاں میرا

نظم معنی کے ابھی سارے جائیں حرف
شعر میں باندھیں
نظم اشعار کے سب حرف بکھر جائیں ابھی
حرف سے حرف نہ مضموں کا کبھی رکھے ربط

نظم معنی کا بکھر جائے ابھی حرف سے حرف
شعر اپنا باندھیں اگر حال پریشاں میرا

(۲) پہلا مسودہ

کیوں میرا سارا زمانہ ہو گیا
میں نے سوچا اور تھا یہ طور کیسا ہو گیا
دوست دشمن ہو گیا اپنا بگانہ ہو گیا
ہائے تاثیر غم الفت مجھے کیا ہو گیا
ہائے تاثیر محبت یہ غضب کیا ہو گیا

ہم نے تم سے دوستی کی تم ہو کرتے دشمنی
میں نے وچا اور تھا ، یہ طور کیسا ہوگیا

جس کو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہوگیا
سوکھ کر ایسا ہوا دبلا کہ کانٹا ہو گیا

جب نشہ اس کو شراب لالہ گوں کا ہو گیا
پہلے تھا گل رنگ مکھڑا پھر بھبھوکا ہو گیا
رنگ روئے آتشیں اوراک بھبھوکا ہو گیا

تجھ میں تھا یا مجھ میں تھا پھر کہو کیا ہوگیا
دل کے جانے کا تو عالم کو........

یک بیک پہلو سے دل غائب جو میرا ہو گیا
کس طرف دیکھیں کہاں ڈھونڈیں اچنبھا ہوگیا

جب اٹھا
دیکھ کر تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شور و غل تھا ماتم غم
شور و غل اک حسرت و افغاں کا برپا ہو گئے

تو نے جو عزم سفر کا ہم کو تھا بھیجا پیام
اپنے منہ سے کیوں نکالا تھا سفر کا تو نے نام
کوچ لے دنیا سے اے ظالم ہمارا ہو گیا

پھر چلو اے حضرت دل ہو چکا ملنا بس اب
ہو چکا دنیا میں بس رہنا ہمارا
آج گھر میں غیر کے پھر
آج گھر میں غیر کے پھر ان کا رہنا ہو گیا

تو وہ ہے جس کی طرف جو
مرنا جینا اک جہاں کا ہے نگہ میں تیری آہ
ہیں نگاہیں تیری وہ قاتل کہ کشتہ اک جہاں
جس طرف کو آنکھ بھر کے تو نے دیکھا ہوگیا
تو وہ ہے جس کی طرف جو............

خط لکھا مجھ کو تو کیا پورا نہیں ہے نام بھی
نام بھی خط پر لکھا میرا تو آدھا ہی لکھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

ایک وہ شعلہ تھا جب میں نے کہا او شعلہ رو
جب کہا میں نے جلایا کیوں مجھے او شعلہ رو
اس لطیفے سے بھڑک کر
سنتے ہی اس بات کو وہ آگ دونا ہو گیا

غیر کے گھر ہم سے تو اڑ کر اگر پہنچا تو کیا
کرتا ہے انکار کیوں جانے سے تو گھر غیر کے
تیرے جانے کا نو ہے
اب تو جانے کا ترے عالم میں چرچا ہو گیا

آتے ہی آتا ہے منہ پر
گرم ہو کر آتا ہے منہ پر ترے طفل سرشک
دیکھ کیا ہے چشم تر ابتر یہ لڑکا ہو گیا

کر دیا تیغ نگہ نے تیری اک عالم کا خوں
نام بدنام اے صنم ناحق قضا کا ہو گیا

زلف تیری شانے میں اور شانہ سے ہے کشمکش
میں نے جب چھیڑا ذرا تو اور برہم ہو گیا
زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم
تو نے خود چھیڑا اسے اور برہم اتنا ہو گیا

یاد زلف عنبریں میں رات بھر آہیں بھریں
رات جو یاد آ گئی مجھ کو وہ زلف عنبریں
آسماں سارا دھویں سے دل کے کالا ہو گیا
یہ بھریں آہیں کہ سارا چرخ کالا ہو گیا

اس کے غمزے نے ہے اک عالم کو مارا جان سے
نام بد اے ذوق ناحق ہے قضا کا ہو گیا

(۲) دوسرا مسودہ

یا اللہ یا علی

دشمن جاں کیوں مرا سارا زمانہ ہو گیا
میں نے سوچا اور تھا یہ طور کیسا ہو گیا

جب نشہ اس کو شراب لالہ گوں کا ہو گیا
پہلے تھا گل رنگ مکھڑا پھر بھبھوکا ہو گیا

ہائے دل کھویا گیا دل اڑ گیا
~~کچھ ہوا کیا اڑ گیا کیا ہائے دلیہ~~ کیا ہو گیا
تھا یہیں تو تھا گیا کیوں کر اچنبا ہو گیا
غم میں تھا یا مجھ میں تھا دل ~~پھر پھلا کیا~~ ہو گیا
~~تھا تو مجھ میں مجھ میں کب تھا~~ پھر کہو کیا ہو گیا
کیا کہوں میں دل کے جانے کا اچنبا ہو گیا
دل کے جانے کا تو عالم کو

دل میں جس کے ہے خلش نوک مژہ کا ہو گیا
~~دل میں ہے جس کے کسی کی نوک مژگاں کا خلش~~
~~جس کو لیے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا~~
سوکھ کر ایسا ہوا دبلا کہ کانٹا ہو گیا

جب اٹھا تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شور و غل تھا ماتم و غم کا کہ برپا ہو گیا

تو نے جو عزم سفر کا ہم کو بھیجا تھا پیام
~~غیر کے گو ہے بھیجا پیام~~
کوچ لے دنیا سے اے ظالم ہمارا ہو گیا

پھر چلو اے حضرت دل ہو چکا ملنا بس اب
آج گھر میں غیر کے ہے ان کا رہنا ہو گیا

مرنا جینا اک جہاں کا ہے نگہ میں تیری کیا
تو وہ ہے جس کی طرف جو تو نے دیکھا ہو گیا

خط لکھا مجھ کو تو کیا پورا نہیں ہے نام بھی
دیکھا
~~خط لکھا مجھ کو تو لکھا نام بھی پورا نہیں~~
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

ایک تو وہ
~~ایک تو~~ شعلہ تھا جب میں نے کہا او شعلہ رو
بھڑک کے
~~لطیفہ میں ایک بھو~~ وہ آگ دونا ہو گیا

~~گر گیا گھر غیر کے~~
~~کیوں مکرتا ہے~~
غیر کے گھر جا کے تو مجھ سے مکرتا کیا ہے یار
اب تو جانے کا ترے عالم میں چرچا ہو گیا

~~غیر کے گھر جا کے تو مجھ سے اگر مکرا تو کیا~~
~~غیر کے گھر جا کے کب تک میں بھر تو ملا کر اب تک~~

ہم سے تو اڑ کر
غیر کے گھر جا کے ~~تو ہم سے ہم سے بیچ بیچ کے اگر پہنچا تو کیا~~
تیرے جانے کا ہے اک عالم میں چرچا ہو گیا
تیرے جانے کا تو ہے
گرم ہو کر آتا ہے منہ پر ترے طفل سرشک
دیکھ کیا اے چشم تر ابتر یہ لڑکا ہو گیا

تیرے غمزہ نے کیا
~~اس کے غمزے نے کیا~~ اے ذوق اک عالم کا خون
نام بدنام اے صنم ناحق قضا کا ہو گیا

ذوق نے ہو زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم
چھیڑا مجھ کو یا میں نے تجھے انصاف کر
تو نے پہلے مجھ کو چھیڑا تھا کہ میں نے
میں نے گر ہو زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم

یا علی

کوہ کے چشموں سے پانی ہے نکلتے دیکھا
ترے دل کو مرے غم سے نہ پگلتے دیکھا
تجھ کو پر

~~ضعف سے سینہ میں ہو سانس کا~~
~~دم مرا ضعف سے ہے سینہ میں~~
ضعف سے سینہ میں آتا ہے مرا دم جس طرح
~~دم مرا سینہ میں جس طرح کہ ہے چلتا ہے~~
~~ضعف سے سینہ میں جس طرح سے دم ہے آتا~~
ریگ کو شیشہ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

ہوں میں اس باغ میں نخل گل آتش بازی
پھولتے دیکھا ہے مگر اسے آہ نہ پھلتے دیکھا

~~چھپ گیا رخ کو ترے دیکھ کر زلف میں ماہ~~
~~زلف کے سایہ میں روشن نہ ہوا رخ کا نور~~
~~زلف کے سایہ میں روشن/نہ ہوا رخ یار کا روشن نہ ہوا~~
سایہ زلف میں روشن نہ ہوا وہ رخسار
~~اس رخ و زلف کے آگے نہ ہوا مہ کو فروغ~~
~~زلف و رخ دیکھ کے نہ ہوا مہ کو فروغ~~
~~آگے کالے کے دیا کس نے~~ جلتے دیکھا

جنبش سبزہ کے

اے صبا ~~گور غریبان~~ کے سوا کس نے تجھے
مورچھل گور غریباں کے سوا کس نے تجھے

کوچہ یار میں دل جب گیا قابو سے
~~اشک دامن پہ گرا~~

کوچہ یار میں دل جب ہوا ہے بے قابو
اشک ایسے گرے دامن پر

~~طفل اشک ایسا گرا دامن مژگاں سے کہ یوں~~
~~ہم نے بچوں کو تو ایسا نہیں مچلتے دیکھا~~
~~اشک آنکھوں میں مری لوٹتا ہے~~

طفل اشک آنکھوں میں لوٹتا ہے
~~اس کو گہوارہ میں ہو کر~~
~~کبھی گہوارہ میں اس کو نہ سنبھلتے دیکھا~~
گہوارہ میں یہ لڑکا نہ سنبھلتے دیکھا
~~اشک ہے لوٹتا آنکھوں میں ہماری دن رات~~
اشک جب دیکھو ہے آنکھوں میں پڑا لوٹ رہا
ہم نے بچوں کو نہیں ایسا مچلتے دیکھا
~~ذوق بچوں کو بہت ہم نے مچلتے دیکھا~~
~~ہم نے بچوں کو بھی ایسا نہ مچلتے دیکھا~~
کوچہ یار میں دل ـــ گیا قابو سے
ہم نے بچے کو بھی ایسا نہ مچلتے دیکھا

~~کہ یہاں جوں سایہ~~
~~کہ بشکل~~

~~دیکھ کر مثل سایہ~~

جو چڑھا ہے وہ گرا ہے یوں ہی
پاؤں دیوار سے کس کا نہ پھسلتے دیکھا

زلف کیوں کر نہ در گوش پہ لہرائے سدا
کہ سر بیضہ سے ناگن کو نہ ٹلتے دیکھا

~~جل چھپا ظلم سے ظلمت میں جو آب حیات~~

کج ادائی نہ گئی ہم سے ترے ابرو کی
شاخ آہو سے کہیں خم ہے نکلتے دیکھا

ہیہات

کوے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم اے ذوق
ان کو دیکھا نہیں پر ہم کو نکلتے دیکھا

(۳)

یا اللہ

صبا سے ہو نیرنگ غنچہ وا
~~برنگ غنچہ کیا وا ہو صبا دل گیر دل میرا~~
برنگ گل صبا سے وا ہو کیا دل گیر دل میرا
کہ ہے باغ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

ورق پر سینہ کے کھینچے ہے تار اشک سے مسطر
کرے گا شرح درد ہجر کیا تحریر دل میرا

اس کے
خط و عارض کا ہوں رات دن جو دھیان رکھتا ہے
تلاوت کرتا ہے قرآن با تفسیر دل میرا

~~سنبھالے رکھ~~ آسماں تو اپنے دامن کو
~~اٹھا کر چل ذرا اے چرخ وا ثروں اپنے دامن کو~~
زمیں پر کھینچتا ہے نالۂ شبگیر دل میرا
اٹھاتا جھک کے آسماں ہے جھک کے داماں دراز اپنا
زمیں پر کھینچے ہے جب نالۂ شبگیر دل میرا

بتوں کی سرد مہری نے ~~کھلا دی زعفراں~~، زعفراں پھولی
~~کہاں سے لائے دل گرمی کہ~~ ہے کشمیر دل میرا
~~کہاں سے لائے دل گرمی ہو گیا~~
~~کہاں سے لائے~~ - کرے کیا گرم جوشی ہو گیا کشمیر دل میرا

~~کبھی منت کی زنجیر اس کو دیکھی تھی تو پہنے ہے~~
کبھی منت کی زنجیر اس کو پہنے ہم نے دیکھا ہے
~~نگاہیں آنسوؤں کے تار کی~~

~~پھرے ہے پہنے ہوئے زنجیر دل میرا~~
~~ہوا ہے آنسوؤں کے تار کی زنجیر دل میرا~~
ہے اب تک پہنے تار اشک کی زنجیر دل میرا

~~کہاں سیکھا یہ سحر سامری~~
~~تمہاری~~ ، تمہاری چشم جادوگر نے سیکھا یہ کہاں جادو
کیا ہے اک نگہ میں اے بتو تسخیر دل میرا

~~بڑا بانکا ہے رکھتا ہے~~
تصور میں کسی تیغ نگہ کی کشور الفت
ہوا تسخیر کرکے صاحب شمشیر دل میرا

حسن سے دل ہوگیا گر سنگ پارس ہے
~~بتوں کے عشق سے دل میں~~
ہوا ہے کیمیائے عشق سے اکسیر دل میرا

ذرا سا اپنا دامن میں ترے قاتل
~~لگا دوں خوں اگر اپنا میں دامن میں قاتل کے~~
~~ترے دامن میں اپنا خوں لگاتا ہوں میں اے قاتل~~
لگا دیتا ہوں خوں اپنا ترے دامن میں اے قاتل.
قیامت میں ترا تا ہووے دامن گیر دل میرا.

~~میں کرتا ہوں راز عشق~~
~~تجھے دیتا ہوں دل~~

دیتا
مجھے اے ذوق کر ~~دیوے ہے جو تشہیر دل میرا~~
بتوں کے عشق میں ہوہو کے رسوا اک خدائی میں
مجھے کرتا ہے اے ذوق اس لیے تشہیر دل میرا
ساری دنیا میں

(۵)

ان سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تو بھی کہے جانا اچھا
آپ نے دشمن اگر بندہ کو

~~تم کو دشمن ہے اگر آپ نے جانا اچھا~~

دوست ناداں سے ہے یہ دشمن دانا اچھا

کرکے گل مہندی کے پھولوں سے جو تو گل باری
پھول گل مہندی کے لا لا کے چڑھاتے ہو جو تم
کرو گل مہندی کے پھولوں سے نہ یاں گل باری
خون عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

طاق ابرو کے تصور میں دلا آہ نہ کھینچ
سمت کعبہ پہ نہیں تیر لگانا اچھا

بیٹھ رہ کرکے قناعت کہ بہ شکل مہ نو
چھوڑی آدھی تو نہیں ساری کو جانا اچھا

مرغ دل نے کہا اڑ کر
~~اڑ گیا~~ ۔ مرغ دل نے نگہ یار سے اڑ کر جو آ کہا
~~دل ترا پھنیں گے اس چشم نے ابرو سے کہا~~
تری آنکھوں سے تری آنکھوں سے کہ دیکھ
پھر نہ کہنا کہ لگاتے ہیں نشانا اچھا
یہی کہنا کہ اڑاتے
بدگماں دیکھ اس میں نہ نکالیں رخنہ
دیکھ غماز کچھ اور اس میں نہ ڈالیں رخنے
روزن در سے نہیں آنکھ لڑانا اچھا
آتش عشق ہے سینہ میں وہی دیکھ اے چشم
نہیں یاں دامن مژگاں کا ہلانا اچھا

اب نہیں دامن
~~قطرہ اشک آلود ہے~~

خون دل سوختہ ۔ ۔ ہے گرا اشک آلود
تو نہیں پنجہ مژگاں سے گرانا اچھا

~~نہیں یاں دم میں دم اور~~
~~دم ملانا بھی نہیں کہاں~~
~~ہلانا نہیں دم میں دم~~

دم میں یاں دم نہیں اور وہ ہے یہ کہتا پیہم
دیکھو ہم سے نہیں یہ دم کا چرانا اچھا

تیز ہو کر کہا شمشاد نے یہ قمری سے
~~تیز ہو شمشاد نے قمری سے کہا~~
~~نہیں ملتا ترے طرہ کو یہ شانہ اچھا~~
ایسے طرہ کے لیے ہے یہی شانہ اچھا
باؤں کے لیے
~~ذوق گلشن میں یہ شمشاد نے قمری سے کہا~~
~~صبح بلبل نے~~
ذوق نے صبح یہ شمشاد سے گلشن میں کہا
~~نہیں ملتا تری زلفوں کو کوئی شانہ اچھا~~
طرۂ یار کو ملتا نہیں شانہ اچھا
ارہ . . . . قمری کے تلے سر رکھ دے
نہ جانا تو ہے پھر اس کا منڈانا اچھا
طرہ شمشاد منڈانا اچھا

دیکھ گھٹا آئی ہے دے
~~ساقیا آئی گھٹا ہے تو بڑھا جام کا دور بہا دے مدہوا~~
اس گھٹا میں نہیں ہے دل کا گھٹانا اچھا

طائر جاں کے سوا کوچۂ جاناں کی طرف
کیجے
نامہ بر کون ہے جو ہوگا روانہ اچھا

سامنے یار کے اے ذوق بہانا آنسو
ہے تو چاہت کے جتانے کو بہانا اچھا

(۶)

رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا
سوز دروں وہی ہے یہ ہوں گے نہ داغ پا

آئے وہ میرے گھر میں رقیبوں کو لے کے ساتھ
بلبل کے آشیاں میں رکھے حیف زاغ پا
~~گر خلک کوئے یار میں ملتا نہیں سراغ~~
~~گر کوئے یار میں نہیں ملتا پتا مرا~~
گر کوے یار میں نہیں ملتا پتا تو پھر
تو کوئے زلف یار میں دل کا سراغ پا

روئے کی پھوٹ پھوٹ کے ہر چشم آبلہ
جوش جنوں میں رکھ نہ سوے کوہ و راغ پا
ہم دل جلوں کی خاک پہ رکھیو نہ تو قدم
اس سے تو ڈال دی جو میاں اجاغ پا
اچھلے ہے شیخ وجد میں اس طرح بار بار
جس طرح بدلگام ہو گھوڑا چراغ پا

گردش سے چشم یار کی ہے کیا عجب کہ پائے
~~بھنگ بلدم گل رنگ~~
~~دیوے کنار لب~~ پہ ساقی جو دور جام
~~ملتی گل~~

~~ساقی جو دور دیوئے لب جو پہ جام کو~~
ساقی کا دور جام چلے گر کنار آب

ساقی کا دور جام چلے گر کنار آب
دیوے کنار آب پہ ساقی جو بھر کے جام
ساقی کنار جو پہ جو دے بھر کے جام تو
شکل حباب آب رواں گر ایاغ پا
~~پائے بہ شکل آب~~
پائے حباب آب رواں سے ایاغ پا

اس گل کے پاؤں تک پہنچ جائے میرا ہاتھ
اس گل سے اجازت پاؤں میں
اس گل سے گر اجازت پابوس ہو نصیب
اس غیرت چمن سے اجازت ہو گر نصیب

اس گل سے گر اجازت پابوس ہو نصیب

~~ہوے چوم کے دل باغ باغ پا~~

~~اے ذوق میں تو چوم~~

ہوتا ہے ذوق چوم کے دل باغ باغ پا

ہو جاوے چوم کر مرا دل باغ باغ پا

رکھے چمن میں آ کے جو وہ رشک باغ پا

~~گر یاں قدم رکھے تو ابھی ہووے داغ پا~~

پھر آئے گر خزاں تو وہیں ہوویں داغ پا

اے ذوق کیوں چمن میں وہ گل جائے جس کے ہوں

ذوق

سیر چمن کو جائے وہ گل کیا کہ جس کے ہوں

رنگ ۔ رنگ حنا سے غیرت صد باغ و راغ پا

ہوویں

(ے)

ہوں سرد ہو چکا نہ دوبارہ حلال کر

~~بس سرد ہو چکا نہ مجھے تو حلال کر~~

میں اور دم چراؤں کا نہ تو خیال کر

دل سینہ میں ہے گم تو نہ تو دیکھ بھال کر

بتلادے آہ تیر کا نامہ نکال کر

بادام بھیجے دو مجھے بٹوے میں ڈال کر

ایما ہے

ہے اشارہ یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

عاشق کے خون سے اپنا پر تیر لال کر

دکھلا دے شاخ خشک میں کونپل نکال کر

~~نقل مکاں بھی کر چکا تیرا مریض ہے~~

نقل مکاں بھی اتاری

~~ترے مریض ہوتے ہی نقل مکاں~~

نقل مکاں بھی کر لیا تیرے مریض نے
~~نقل مکاں بھی کر چکا تیرا مریض ہے~~

تیرے مریض نے کئی نقل مکاں کیے
آخر کو روح تن سے گئی انتقال کر

کن مدتوں سے زندگی و موت میں ہے لاگ
~~آ تیغ یلو~~ یہ انفصال کر
آ تیغ یار قصہ یہ تو

اترے گا ایک جام بھی پورا نہ چاک سے
خاک دل شکستہ نہ صرف کلال کر
سینہ ہمارا وادی وحشت ہے اے جنوں
ہر داغ میں تصور چشم غزال کر
گر چاہتا ہے مثل مہ چاردہ فروغ
آ پھر کے شہر شہر میں کسب کمال کر
قاتل ہے کس مزے سے نمک پاش زخم دل
بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر
دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق
ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ڈال کر

~~اے اہل دل خیال رہے تجھ کو ہر قدم~~
~~دشت فنا ہے جانیے دامن سنبھال کر~~
~~ملک فنا ہے جانیے دل کو سنبھال کر~~
~~اے اہل دل سفر ہے رہیں مستقل قدم~~
~~مگر یہ رہے خیال~~
~~ہر دم سفر میں رہے اہل دل مگر~~
~~ہر دم ہے سفر میں پر اے اہل دل ذرا~~
~~آمادہ سفر ہے تو~~
~~اے اہل دل ہوا ہے جو دل حامل سفر~~
~~ملک فنا ہے جانیے دل کو سنبھال کر~~
~~اہل دل اگر ہے خیال سفر تجھے~~

~~ہر دم تو سفر میں ہے اے اہل دل ذرا~~
~~اے اہل دل سفر تو کیا ہے مگر ذرا~~
~~ملک فنا میں جائیو دل کو سنبھال کر~~

(۸)

کونسا ہمدم ہے تیرے عاشق بے دم کے پاس
غم ہے اس کے پاس ہمدم اور وہ ہے غم کے پاس
کیا ہوا ساقی جو تھا جام جہاں بیں جم کے پاس
تیرا جام بادہ ہو اور تو ہو اس پر غم کے پاس
خط کہاں آغاز ہے پشت لب دلدار پر
ہیں جناب خضر آئے عیسیٰ مریم کے پاس
مردمک کے پاس ہے یہ اشک خونیں کا ہجوم
یا کہ ہیں یاقوت احمر دانۂ نیلم کے پاس
روح اس آتش بجاں کی بعد مردن جوں پتنگ
آئے گی اڑ کر چراغ خانۂ ماتم کے پاس
کس کی قسمت ہے کہ زخم تیغ قاتل ہو نصیب
جان سے جائیں نہ جائیں گے مگر مرہم کے پاس
جائیں گے مر ہم نہ جائیں گے مگر مرہم کے پاس
کیا مزے لے لے کے گل کھائیں اگر
خاتم ملک سلیماں ہے اگر آ جائے ہاتھ
یہ جو چھلا آپ کی انگلی میں ہے خاتم کے
زلف سے بے وجہ خط سبز ہم پہلو نہیں
ہے لھکتا عشق پیچاں سنبل ہر خم کے پاس
اور واہ صیادی تری
واہ صیاد اجل دیکھی تری
کھینچ کر لاتا ہے کیا صیاد
~~کھینچ کر پھر اب کو لے آئے~~ تو رستم کے پاس
~~عشم دریا ہیں تم بس~~

~~فیض تو دیکھو ذرا اس چشم دریا بار کا~~
دیدۂ گریاں کا میرے فیض جاری دیکھنا
~~ہے دریوزہ سمندر آئے جس کے نم کے پاس~~
~~ہے سمندر کاسہ در کف اس کے ۔۔۔۔ پاس~~
کاسہ در کف۔۔۔۔ ۔ اس کے نم کے پاس
کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اک اور غزل
بیٹھ جا اے ذوق ~~لے کے دم اس دل پر غم~~
کوئی دم تو اس پر غم کے پاس

(۹)

لب پر

شب جان زار رک گئی آ کر دہن کے پاس
پھر اٹھ کے رہ گیا یہ مسافر وطن کے پاس
یہ جوئے خون رواں نہیں دیکھو ہے رو رہا
تیشہ سر اپنا رکھ کے سر کوہکن کے پاس
اس آرزو میں جان ہوں دیتا کہ لے کے جام
پہنچوں کبھی لب بت پیماں شکن کے پاس
~~اس جھجک پہ ہوں مرتا کہ کان کو~~
میں تو اسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو
شب کیا
کس لطف سے اٹھا لیا میرے لا کر دہن کے پاس
انگشت شمع کیوں نہ اٹھے پھر فاتحہ
یاں ڈھیر ہے پتنگ کا ہائے لگن کے پاس
چمکے گی تا بہ حشر ہماری لحد میں آگ
چاک جگر میں دیکھنا چاک کفن کے پاس
میں نے کہا کہ بوسہ تمہیں دو ، ادب سے میں
لا سکتا اپنا منہ نہیں چاہ ذقن کے پاس
ہنس کر کہا کہ جاتا ہے پیاسا کوئیں کے پاس
یا جاتا ہے کنواں کسی تشنہ دہن کے پاس
اے ذوق صدقے جائیے پیک خیال کے

کیا لے گیا اڑا کے بت سیم تن کے پاس

(۱۰)

ہے چشم تری مست قدح گیر باغ حسن
عارض پہ خط ہے طوطی تصویر باغ حسن
~~گلرخوں میں بیٹھ کے دل~~

ہو جاتا ذل ہے بیٹھ کے خود گلرخوں میں گل
تاثیر باغ خلد ہے تاثیر باغ حسن
تحریر سرمہ ہے تیری آنکھوں میں وقت خواب
اے غیرت چمن ، دو و زنجیر باغ حسن
پان و مسی سرمہ گل ہوگا لالہ زار
~~خال و مسی و سرمہ و پان ہے وش وش~~
مشاطہ باغبان ہے یہ تدبیر باغ حسن
تبخانہ لب پہ گرمی بوسہ سے ہے کہاں
دل گیر
ہے گل رخو یہ غنچہ تصویر باغ حسن
اے رشک باغ طاق دو ابرو کا تیرے عکس
دریائے آئنہ میں ہے تعمیر باغ حسن
سیر خزاں جو چاہے تو اے ذوق دیکھ لے
اس نازنیں کا جلوۂ تغئیر باغ حسن

(۱۱)

عرق کے قطرے جو اس روئے تابناک پہ ہیں
ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں
یہ سینہ میں
بھڑکتی آگ ہے دل میں ہے کہ بن موسم
عرق کی جا پہ نکلتے شرر کو دیکھتے ہیں
بنا کے آئنہ دیکھے ہے پہلے آئنہ گر
ہنرور اپنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
زیادہ سر ہو جو دشمن تو ڈر نہ تو دل میں
بری گزند سے مار دو سر کو دیکھتے ہیں

فلک سے کر نہ تمنائے نام مثل نگیں
کہ سینہ کاوی میں یاں نامور کو دیکھتے ہیں
خراش ناخن وحشت سے چارہ گر ہر صبح
شکستہ بخیہ زخم جگر کو دیکھتے ہیں
جہاں کے آئنے سے دل کا آئنہ ہے جدا
اس آئنے میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

کسی کی کاوش مژگاں سے ہر سرمژگاں
خیال قندق ہا میں بر سر مژگاں
ہمیشہ قطرۂ خون جگر کو دیکھتے ہیں

کیا جو آنسوؤں نے دم نزع
سفر ہے جاں کا یہ فال سفر کو دیکھتے ہیں
کہ لے کے آئنہ ماہ سفر کو دیکھتے ہیں

دکھا کے وہ لب شیریں بہ خندۂ نمکیں
نمک میں شکر کو دیکھتے ہیں

کھلے گا رنگ محبت کا وقت سختی میں
یہ کیوں ــ لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں
عیار نقد محبت سختی میں
کھلا ہے نقد محبت کا رنگ سختی میں
لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو ــ ــ ــ ــ

(۱۲)

ہووے تو اے مہروش جب پرتو افگن آب میں
ہوں سراپا فلس ماہی ماہ روشن آب میں
عکس زلف یار اور آئینۂ رخسار یار
کھینچے ہے شام و سحر تصویر سوسن آب میں
مردم چشم اپنے ہیں ہر لحظہ بحر اشک میں
مردم آبی ہیں ان کا ہے نشیمن آب میں
بھول مت علم کتابی پر کہ آخر کب تلک
ناؤ کاغذ کی بہے اے طفل کودن آب میں

تو لب دریا پہ خنداں ہو جو اے رشک بہار
ڈالے پھولوں کے صبا
ڈالے گل باد صبا پھولوں سے بھر بھر
پھینک دے ساحل گلوں کے بھر کے دامن آب میں
ڈالو آبی نقاب آئینۂ رخ پر ذرا
کر دے تو گلشن اسے عکس رخ گل رنگ سے
نیلوفر دکھلا رہا ہے اپنا جوبن آب میں
کیا ہوا کیا سبزہ ہے کیا گل ہے کیا ابر بہار
لطف ہے گر ہووے
ہر تماشہ ہے جو ہووے فیض ذوالمن آب میں
مدح کر اس شاہ دریا دل کی جس کے دل کا فیض
لعل و گوہر ہے بہاتا وقت گفتن آب میں
شاہ اکبر خسروِ غازی کہ جس کی آب تیغ
رکھے حاسد کو ہمیشہ تابگردن آب میں
پڑھ کے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا دلا
جوں شناور پھر ہوا میں دست و پا زن آب میں
مطلع روشن وہ لکھا جس کو پڑھ کر ہوں
جس سے فلک نظم کے کہ بحر نظم میں
نظم کے مطلع کو بھر نظم میں جس سے فلک
صورت اختر در معنی ہوں روشن آب میں
ڈالے جوں روح القدس تو جب کہ توسن آب میں
غرق جوں فرعونیاں ہو فوجِ دشمن آب میں
نور حق ہو اہل عالم پر مبرہن آب میں
نورِ حق ہو اہل برہاں پر مبرہن آب میں
اے شہ الیاس رتبت اے شہ خضر
خضر ہادی ہے ترا
پیش رو
تجھ سے ہے خشکی میں رستہ اور ہے
خضر تیرا رہنما الیاس تیرا ہو
اے شہ خضر اے خسرو الیاس دل

خضر تیرا پیشوا الیاس تیرا
خضر دے تجھ کو عصا الیاس دامن آب میں
اے شہ الیاس رتبت اے شہ خضر احترام
خشک و تر کو ہے سہارا تیرا دامن آب میں

تو شہ دریا نوال اور دل ترا موج کرم
اور عطا
ہے سخاوت سے تری
تیرا دست فیض ہے دست قلم زن
ہے سخاوت سے تری

نام حق لے کر جو مارے تیغ راہ حق میں تو
غرق جوں فرعونیاں ہو فوج دشمن آب میں

ابر نیسان سخاوت جب گہر باری کرے
گوہر تر سے بھریں موجوں کے دامن آب میں

حکم تیرا جستجو چاہے تو گم ہونے نہ پائے
مثل ابراہیم ادھم ایک سوزن آب میں

تیرے حکم شرع سے جب کفر دریا برد ہو
غرق ہووے
خلق ہو تابہ انشائے برہمن آب میں

ہو ترے سینے میں جب موج معانی موج زن
ہو قلم زن آب میں
موج دریا
قطرہ قطرہ آب کا ہو نور حق ہو روشن آب میں

قطرہ سے روشن ہو صد معنی روشن آب میں
قطر قطرہ ہووے صد

دے ترا فیض سخن کر معنی نطق فصیح
بلبلے مانند بلبل ہوں نوازن آب میں

زمرہ اعدا کریں گر تیرے آگے—گردن عصیاں بلند
اہل عصیاں تیرے آگے گر گردن عصیاں بلند
مثل۔ قوم۔ نوح ہاویں ہووے سب کا مدفن آب میں
تو صف آرا ہو جو دریا میں تو اک اک کرم آب
فوج اعدا کے لیے ہووے تہمتن آب میں
ہو عدو کے قتل
روے دریا پر بناتے ہیں سدا موج و حباب
بہر جانبازان لشکر خود و جوشن آب میں
نورو ظلمت ہیں بہم دشمن مگر حیران ہوں
تیرے خنجر میں ہیں کیوں آتش بہ آہن آب میں
ہیں بہم کس طرح رکھتے آب و آہن آب میں
تیرا اسب باد پا ہے وہ برق اے
باد پا تیرا ہے وہ یوں آتش قدم بر روے خاک
اس عکس
ہووے جوں جس طرح جیسے برق درخشاں سایہ افگن آب میں
دریا میں رہ جاتا ہے عکس
سن سے اڑ جاتا ہے وہ اور عکس رہ جاتا ہے یوں
گویا
روح جیسے اڑ گئی اور رہ گیا تن آب میں
تو شہا جس دم ہو جبکہ فیل کوہ پیکر پر سوار
تیرا فیل کوہ پیکر بس کہ دریا سیر ہے
اور وہ ہو کوہ رواں کوہ گراں جب ڈالے دامن
وہ
ڈالے جب کوہ رواں جب اپنا دامن آب میں
آئے مثل سیل لیکن سرعت رفتار سے
صورت سیل رواں آئے مگر تر ہوں نہ پاؤں
اودہر اودہر جائے روئے آب سے مثل سحاب
آئے جوں سیل رواں
آئے جوں سیل رواں اور سرعت رفتار سے
اودہر اودہر جائے مثل ابر بہمن آب میں

چرخ پر تا ہوں شہا
نسر طائر واقع چرخ پر جب تا رہیں
اور زمیں پر تا کہ ہو ماہی کا مسکن آب میں
مرغابی
طائر اقبال سر پر ہو ترے سایہ فگن
دام
ماہی دولت کا ہو تیرے نشیمن آب مین

—o—

اس نظم کا ایک اور مسودہ :

مبرہن ۔ تہمتن ۔ جوشن ۔ شیون ۔ قدغن ۔ آہن ۔

روان ایسا تری
ہے قلم میرا رواں ہوا ایسا تری تعریف میں
جیسے ہو آب رواں کی تن آب میں
موج رواں

ہو ترا فیض سخن گر معنی نطق فصیح
بلبلے مانند بلبل ہوں نوا زن آب میں

پڑھ کے بسم اللہ مجریھاو مرسلہا دلا
جوں شناور پھر ہوا میں دست وپا زن آب میں

مدح میں اس شاہ دریا دل کی وہ مطلع لکھوں
سن کے ہوں غرق ندامت اعدا بدظن

دب جائیں سن کے اعدائے بدظن
جس کو سن کر ہو سراپا غرق دشمن آب میں

ڈالے جوں روح القدس تو جب کہ توسن آب میں
غرق جوں فرعونیاں ہو فوج لشکر آب میں

شاہ اکبر خسرو غازی کہ جس کی آب تیغ
رکھے حاسد کو ہمیشہ تابگردن آب میں

دفعہ

تیرا راس شرع کر دے جب کفر جب طومار کفر
تیرے حکم شرع سے کفر دریا برد ہو
غرق ہووے تا بہانشائے برہمن آب میں
ہوں
گوہر تر سے بھریں موجوں کے دامن آب میں
مرغابی کا
مردم آبی کا تا ہووے نشیمن آب میں
مثل۔ ابراہیم ادھم ایک سوزن آب میں
حضرت الیاس دیویں تجھ کو دامن آب میں
سایہ
جب وہ رشک مہر ہووے پرتوافگن آب میں
جب کہ ہو وہ
ہوں سراپا فلس ماہی
فلس ماہی ہوں سراپا ماہ روشن آب میں
خندہ زن ہے
تو لب دریا پہ ہنستا ہے جو اے رشک بہار
پھینکے ساحل
پھینکتا ساحل ہے گل بھر بھر کے دامن آب میں
پھینکے ساحل گلوں
مردم دیدہ نہ کیونکر ۔ ۔ ۔ ۔ ہوں تہ دریا اشک
کو لازم
ہیں ان کا
مردم آبی کا ہوتا ہے نشیمن آب میں
رات دن ہے یہ برہمن آب میں
جب عدو گردن عصیاں بلند
مثل قوم نوح ہووے اس کا مدفن آب میں
ان کے ماتم میں کریں فریاد و شیون آب میں
ان کے غم میں کرتے ہیں

اس نظم کا ایک تصحیح شدہ نسخہ ، جو اشعار کی ترتیب اور صحت میں دیوانِ ذوق میں مطبوعہ اشعار سے بہت قریب ہے :

ہووے تو اے مہروش جب پرتو افگن آب میں
ہوں سراپا فلس ماہی ماہ روشن آب میں

عکس زلف یار اور آئینۂ رخسار یار
کھینچے ہیں شام و سحر تصویر سوسن آب میں

تو جو دریا میں لڑا چھینٹے تو نیساں شرم سے
پانی پانی ہوگیا اے شوخ پر فن آب میں

مردم دیدہ ہیں اپنے زندہ آب اشک سے
مردم آبی ہیں ان کا ہے نشیمن آب میں

تو لب دریا ہنسے آ کر جو اے رشک بہار
ڈالے پھولوں کے صبا بھر بھر کے دامن آب میں

لے لو اپنے روے سیمیں پر ذرا آبی نقاب
نیلوفر دکھلا رہا ہے اپنا جوبن آب میں

کیا ہوا ، کیا سبزہ ہے ، کیا گل ہے ، کیا ابر بہار
لطف ہے گر ہووے فیض رب ذوالمن آب میں

مدح کر اس شاہ دریا دل کی اے دل جس کا فیض
لعل و گوہر ہے بہاتا وقت گفتن آب میں

شاہ اکبر خسرو غازی کہ جس کی آب تیغ
رکھے حاسد کو ہمیشہ تا بہ گردن آب میں

پڑھ کے بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا دلا
جوں شناور بھر ہوا میں دست و پا زن آب میں

مطلع روشن لکھا میں نے کہ بحر نظم میں
صورت اختر در معنی ہوں روشن آب میں

ڈالے جوں روح القدس تو جب کہ توسن آب میں
نور حق ہو اہل برہاں پر مبرہن آب میں

اے شہ الیاس رتبت اے شہ خضر احترام
خشک و تر کو ہے سہارا تیرا دامن آب میں

نام حق لے کر جو مارے تیغ حق کی راہ میں
غرق جوں فرعونیاں ہوں فوج دشمن آب میں

تو شہ دریا نوال اور دل ترا موج کرم
اور عطا سے تیری ہے دست قلمزن آب میں

تیرا نیسانِ سخاوت جب گہر باری کرے
گوہر تر سے بھریں موجوں کے دامن آب میں

حکم تیرا جستجو چاہے تو گم ہونے نہ پائے
مثل ابراہیم ادہم ایک سوزن آب میں

تیرے حکم شرع سے جب کفر دریا بُرد ہو
غرق ہووے تا بہ انشائے برہمن آب میں

ہو ترے سینے میں جب بحر معانی موج زن
قطرے سے روشن ہو صد معنیٔ روشن آب میں

ہو ترا فیض سخن گر معنیٔ نطق فصیح
بلبلے مانندِ بلبل ہوں نوا زن آب میں

تیرے آگے ہو جو اعدا کا سر عصیان بلند
مثلِ قومِ نوح ہووے سب کا مدفن آب میں

تو صف آرا ہو جو دریا میں تواک کرمِ آب
ہو عدو کے قتل کو سو سو تہمتن آب میں

روے دریا پر بناتے ہیں بہم موج و حباب
بہرِ سربازانِ لشکر خود و جوشن آب میں

نورو ظلمت ہم دگر دشمن ہیں پر حیراں ہوں میں
تیرے خنجر میں ہے کیوں آتش بہ آہن آب میں

باد پا تیرا ہے یوں آتش قدم بر روئے خاک
ہووے جوں برقِ درخشاں سایہ افگن آب میں

عکس ابھی دریا میں ہے اور سن سے اڑ جاتا ہے یوں
روح گویا اڑ گئی اور رہ گیا تن آب میں

تیرا فیل۔ کوہ پیکر بسکہ دریا سیر ہے
ڈالے وہ کوہ۔ رواں جب اپنا دامن آب میں

مثل ابر آئے ولیکن سرعت۔ رفتار سے
اوپر اوپر جائے مثل ابر بہمن آب میں

نسر طائر نسر واقع چرخ پر ہوں تا شہا
اور زمیں پر ہووے تا ماہی کا مسکن آب میں

طائر۔ اقبال ہو سر پر ترے سایہ فگن
سر پر ہما اقبال کا
ہو ہوائے شوق میں - - - - اقبال یہ
ماہی۔ دولت کا ہو تیرے نشیمن آب میں

(۱۳)

کس — جرس — کاہ فرس — پیش و پس

رخصت۔ پرواز گر دیویں قفس کی تیلیاں
دیکھ آئیں تھیں رکھیں چن کر جو آئیں خس کی تیلیاں
جا کے دیکھ آئیں جو کچھ رکھیں تھیں خس کی تیلیاں
دل کے شعلوں سے قفس کے پیش و پس کی تیلیاں

شعلۂ آواز سے میرے قفس کی تیلیاں
اڑ جائیں
یوں جلیں جل جائیں جیسے خار و خس کی تیلیاں

گو سر سیلابچی رکھتے ہو خس کی تیلیاں
لیجیے مژگاں کی مجھ بے دسترس کی تیلیاں

گو رگ گل سے ہوں بلبل کے قفس کی تیلیاں
کانٹے آنکھوں میں چبھوئیں اس کے خس کی تیلیاں

مانع سیر گلستاں ہیں قفس کی تیلیاں
ورنہ یاں ہیں بال و پر
بال و پر ہیں ورنہ یاں تار۔ نفس کی تیلیاں

استخواں
ہڈیاں ہیں اس تن لاغر میں خس کی تیلیاں
ستر
تیلیاں بھی وہ کہ جو ہوں برس کی تیلیاں

رخسار کا
میں ہوں دیوانہ کسی کے سبزۂ خط کا مجھے
مار پھولوں کی
مار مجھ کو کی جگہ بس مجھ کو خس کی تیلیاں

سوز غم سے ہیں سلگتے جسم و جان ناتواں
کب کا یہ کوڑا تھا یا رب
کب کا تھا کوڑا الٰہی کے برس کی تیلیاں

مرقد
کشتہ مژگاں کے کا ہے گنبد اے صبا
عوض
جا لگا اس پر جگہ زریں کلس کی تیلیاں

ہیں سمند ناز کے جو پیش و پس
پنجہ مژگاں
فوج مژگاں ہے جو اس کے گرد و پیش چشم
تاب کب لائیں لکد کوب فرس کی تیلیاں

یا کاسۂ روغن
لے چلا دنیا سے دل یا روغن حریص
اس میں کیوں رکھتا ہے جاروب ہوس کی تیلیاں

لگا دے ساقیا
باغ جنت سے اگر لاؤں
شیخ کی ڈاڑھی تو حاضر ہے لگا
خلد سے لاؤں ابھی

لاؤں باغ خلد سے
سبزۂ رخسار غلماں لاؤں جنت سے ابھی
گر خس شیشہ کو ہیں درکار خس کی تیلیاں

ہے دوائی اس شجر کے واسطے تازہ خزاں
پتے بچ کر رہ گئیں خالی سرس کی تیلیاں

موئے مژگاں ہیں کہ رکھتے ہیں ترے شہباز چشم
ہیں مژہ کرتے ہی تری شہباز چشم
یہ نہیں مژگاں کہ آنسو کے کبوتر
نہیں یہ مژگاں
آشیاں کے واسطے چن چن کے خس کی تیلیاں

ہے ہئے مرغ دل بلبل رگ گل کا قفس
اس سے نازک اور کیا ہوں گی قفس کی تیلیاں

گر ہے اے صیاد ناداں تجھ کو آرائش کا شوق
مت بنا پیتل کے تاروں سے قفس کی تیلیاں

جو ہیں مرغ تر دماغ ان کے قفس کے واسطے
چاہئیں صندل کی چوبیں اور خس کی تیلیاں

چشم گریاں نے اگر کی اس برس برسات خوب
گر دل بابل دیوانہ کی
سبزۂ خط ہوں اگر دکھلا کر نکایں
سبز ہو جائیں گی سب میرے قفس کی تیلیاں

شب تنکا تنکا دشت کا

کارواں حیرت کا تھا ایک ایک تنکا دشت میں
رہ گئیں بن بن کے آوازیں جرس کی تیلیاں

سلسلہ وابستہ کچھ تھا عالم
تھا سخن کا سلسلہ کچھ عالم معنی سے ذوق
کاروان حیرت کا ہے
ورنہ تھیں یہ تیلیاں کب اپنے بس کی تیلیاں

اڑ کے جا پہنچے ہوائے شوق میں تنکوں کی طرح
تھیں جو ٹانگیں قاصدان زود رس کی تیلیاں

شیخ تل شکری جو لائے لعل لب کے سامنے
لائیں تل شکری جو اس کے لعل
تھا
گل کا دونا ہووے مگر شاخ عدس کی تیلیاں

سامنے
سامنے ان نالوں کے ہیں یوں خار و خس ہوتے رقیب
جوں ہوں روکش اژدر آتش قفس کی تیلیاں

(۱۴)

اللہ و علی

جس کی طرف

اے بتو تم تو جدھر بھر کے نظر دیکھتے ہو
از صنم تا بہ حرم اپنا ہی گھر دیکھتے ہو

آئنہ منہ پہ مرے دیکھو گے رکھ کر کیا خاک
آئنہ منہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
آخر مجھے کیوں آئینہ دل پر دیکھتے ہو

کیا
آئنہ ہاتھ میں کیوں لے کے ادھر دیکھتے ہو
دم۔ آخر ہے ہمیں دیکھ لو گر دیکھتے ہو
گلشن۔ حسن کا تم اپنے تماشا دیکھو

دشت میں دیکھتی آہو کو اگر ہو لیلئے
دیکھتی صحرا کے غزالوں کو جو ہو تم لیلئے
دیکھتی آہوے صحرا کو جو تم ہو لیلئے
غزالوں کو جو تم دیکھتے صحرا میں
مجنوں کو بھی آشفتہ بسر دیکھتے ہو

ہم سے کیا پوچھتے مجنوں کی ہو آشفتہ سری
بید مجنوں کو پکڑے ہوئے سر دیکھتے ہو

ہے دم باز پسیں دیکھ لو گر دیکھتے ہو
منہ پہ آئینہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
اک نظر دل سے ادھر دیکھ لو گر دیکھتے ہو

ناتوانی کا مری مجھ سے نہ پوچھو احوال
ہو مجھے دیکھتے یا
دیکھتے مجھ کو ہو اور اپنی کمر دیکھتے ہو

پر پروانہ پڑے ہیں شجرِ شمع کے پاس
برگ ریزیِ محبت کا ثمر دیکھتے ہو

آنکھیں میری جو کھلی رہ گئیں مر کر تو کہا
بولے آنکھیں وہ کھلی دیکھ کے پس مرگ
کشتۂ چشم کی آنکھوں کو
شوق دیدار نے آ کر میری نعش پہ آ کر بولا
کس کی ہو دیکھتے راہ اور کدھر دیکھتے ہو

ذوق سے کیا پوچھتے ہو
لذتِ ناوکِ غم پوچھتے کیا ہو مجھ سے
لب پڑے چاٹتے ہیں زخمِ جگر دیکھتے ہو

جنھوں نے بید مجنوں نہیں دیکھا وہ مجنوں کی وحشت
اور بالوں کی آشفتگی کو کیا جانیں ۔ دیکھنے والے جانتے ہیں

کہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا ایک جوگی جٹائیں بڑھائے ہے اور بالوں کی لٹیں سر سے پاؤں کی طرف جا رہی ہیں۔

(۱۵)

اللہ و علی

یہ غزل عالم شباب کی ہے۔ ایک فرمائش سے اس طرز میں کہی تھی:

عبث تم اپنی رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

لگا کے سرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو
یہ ہم کو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو

گلوری چھپ کے یہ کس کے لیے بناتے ہو
گلوری پان کی غیروں کو جو کھلاتے ہو
ہمارے قتل کا بیڑا کہیں اٹھاتے ہو
گلوری پان کی چیکے سے جو بناتے ہو
گلوری پان کی جو غیر کو کھلاتے ہو

تم اپنے رخ پہ یہ کاجل کا تل بناتے ہو
کہ میرا اختر بخت سیاہ دکھاتے ہو

اگر دباؤ کسی کا تمھارے دل پہ نہیں
تو ہم کو دیکھ کے تم کان کیوں دباتے ہو

مریض عشق کو تم پوچھ کر طبیبوں سے
مدام شربت عناب کیا پلاتے ہو

ہوں
میں خاک چاٹ کے کہتا ابھی شفا ہووے
جو شربت لب مے گوں ذرا چٹاتے ہو

ملاپ جانیں تبھی، ہم کہ دے کے تم بوسہ
کہو کہ آؤ زبان سے زبان ملا ہو

جلا رہے ہیں

جلا رہا ہے سویدائے دل کو ہم اپنے
نظر گذر کو تم اسپند کیوں جلاتے ہو

ہو کرتے سبزۂ خط کی جو سیر آئنہ میں
نگہ کی تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

قطعہ

مرے لیے تو ہر اک طرح سے قباحت ہے
یہ دشمنوں کو جو تم دردِ سر بتاتے ہو

گلو صبا نے کہا کان میں ہے کیا تم سے
گلو یہ کہہ گئی کیا کان میں تمہارے صبا
کہ اوٹے جاتے ہو، پھولے نہیں سماتے ہو

جلن سے رشک کے ہیں ہڈیاں جلی جاتیں
کہ ہائے تم نئے قلیاں کو منہ لگاتے ہو

ہماری لاش پہ آواز قم باذن اللہ
تم آ کے حضرتِ عیسٰی عبث سناتے ہو

اٹھیں گے یار کی ٹھوکر سے لے چلو تشریف
نہیں تو پھر کوئی صلوات سن کے جاتے ہو

کنار بام وہ آئے ہیں دوستو جلدی
وہ آئے ہیں بہ لبِ بام ہم دمو جلدی
وہ آئے بام پہ ہیں ہم دمو نہ بیٹھو اب
اٹھاؤ میرا جنازہ اگر اٹھاتے ہو

یہ صید بستہ کھل پڑے نہ کہیں
سمندِ ناز کو تیز اتنا کیوں اڑاتے ہو

نمک چھڑکتی ہے شبنم گلوں کے زخموں پر
دکھا کے تم لب و دنداں جو کھلکھلاتے ہو

قطعہ

ہمیشہ صدقہ اس ابرو کے ہو کے حضرتِ دل
یہ لب پہ نالۂ جاں گاہ اپنے لاتے ہو

دیا ہے سامنے سمجھ اسے محراب
دیا کہ دیکھ لو کعبہ ایمان
دیا سمجھتے ہو
دیا طواف حرم میں ہے سامنے محراب
اور اس میں نعرۂ لبیک تم سناتے ہو

لگاؤں گھس کے جو صندل تو کہتے ہو کہ مجھے
لگاوٹ اتنی بھلا کس لیے دکھاتے ہو

جو پڑھ کے سورۂ اخلاص دم کروں تو کہو
کہ دے کے دم مجھے اخلاص کیا جتاتے ہو

یہ ایسا
ہے ایسا کون سا انداز گفتگو اے ذوق
کہ جس پہ زورِ طبیعت تم آزماتے ہو

(۱۹)

اللہ و علی

جو کہوے قد یار کی تصویر دکھا دو
کوئی گر کہے
اس قد کی جو کہوے مجھے تصویر دکھا دو
تم خطِ الف کی اسے تحریر دکھا دو
تم لکھو الف اور وہی تحریر دکھا دو

تم کھینچ کے تو دیکھو ذرا کند ہے یا تیز
پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھا دو
میں کھینچ کے دیکھوں تو سہی کند ہے یا تیز
پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھا دو
ایسا نہ ہو مقتل میں مجھے چھوڑ دے بسمل
ایسا نہ ہو مقتل میں کہیں چھوڑ دے بسمل
دیکھو سر میداں نہ کہیں چھوڑ دے بسمل

حالت طپش دل کی مری پوچھیں اگر وہ
ہیں پوچھتے میرے وہ پوچھ رہے ہیں طپش دل کی حقیقت
تم ان کو تم—اس کو تڑپتا ہوا نخچیر دکھا دو

لگتی ہے کہیں آگ تو دکھلاتے ہیں قرآن
رخسار کی تاثیر
تم رخ مصحف رخ اس کو بہ تدبیر دکھا دو

زاہد اسے گر دیکھے
زاہد جو اسے دیکھے تو پھر
اس کو
تم مصحف رخ اپنا بہ تدبیر دکھا دو

ہے ذوق تو شیدائے رخ و رنگ بہ یک رنگ
تم چاہو تو ہر رنگ میں تاثیر دکھا دو

گر چاہو ثریا ہو نہاں پردۂ شب میں
جھمکوں کو تہ زلف گرہ گیر دکھا دو

اس چشم کو ہے ناز بڑا تیر نگہ پر
نازاں نگہ یار ہے تاثیر پہ اپنی
اے حضرت دل آہ کی تم تاثیر دکھا دو

برق نگہ اپنا ہے دکھلا رہی عالم
عالم ہے دلا کشتہ اگر برق نگاہ کا

عالم ہے ابروئے جاناں
اس نالہ جاں سوز کا اک تیر دکھا دو

گر وہ نہیں آتے ہیں یہاں تک تو نہ آئیں
وہ نہیں آتے تو نہ آئیں
لا کر کوئی اس کی مجھے تصویر دکھا دو
تم اس کی مجھے کھینچ کے
گر وہ نہیں آ سکتے یہاں تک ہیں تو پھر آہ
لا کر کوئی اس کی مجھے تصویر دکھا دو

جو پیش خبر بوجھتے قدرت کے ہیں احکام
تم کہہ دو کہ ہم کو خط تقدیر دکھا دو
ہمیں تم

اک جان ہے اک دل ہے سو ہیں
یک رخ و یک رنگ
تم چاہو تو ہر رنگ میں تاثیر دکھا دو

لطف و کرم یار کے تم پر جو ہیں منکر
اے ذوق انہیں یار کی تحریر دکھا دو
ذوق رخ

(۱۷)

اللہ و علی

دل کے مفلس جو تونگر تھے تو کیا پتھر تھے
اب تو کنکر ہیں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

مر کے گر خاک ہیں تو چھاتی پہ ہے دھرا
کھاتے گلیوں میں جو پتھر تھے تو کیا پتھر تھے

تاج شاہی میں جگہ پائی تو کیا ہاتھ آیا
اور دھرے گر ترے در پر تھے تو کیا پتھر تھے

کہ نہ بت خانہ میں اے شیخ بتوں کو دل سنگ
وہاں ترے کعبہ کے اندر تھے تو
کتنا میں رویا ولیکن نہ پسیجے وہ صنم
سنگ دل گر نہ ستم گر تھے تو کیا پتھر تھے
چور اگر سنگ ـ ساقیا خاک ہے گر شیشہ دل تیرا تو کیا
گو ـ بلوریں ترے ساغر تھے تو کیا پتھر تھے
اور

اب اسی بحر میں
ذوق ایک اور سناتا ہوں غزل کہہ کر
کی کی اب اور
ذوق اس بحر میں اب تجھ کو دکھاتا ہوں
سنگ لاخ اس کے بھلا قافیہ کیا پتھر تھے
بے جرم و خط پتھر
لکھ غزل ذوق ایک اور سناتا ہوں غزل میں تجھ کواس کو سن

سنگ دل وہ رہے اے ذوق صدا حق میں مرے
غیر کے حق میں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

(۵)

اوپر کہا گیا ہے کہ آزاد نے خود اپنی قلم سے ''واؤ'' میں غزلوں اور اشعار کا اضافہ کیا ہے - یہ اشعار اور غزلیات یا تو خود ان کے حافظے میں موجود تھیں یا مسودات سے نقل کی گئی ہوں گی - آزاد نے حاشیے پر لکھا ہے : ''فلاں فلاں غزلیں نقل کرو'' یا مشتملہ اوراق پر نقل کرو'' - بہ الفاظ دیگر ان غزلیات کے مسودات ان کے پاس موجود تھے ، جہاں سے انھیں نہایت احتیاط سے نقل کیا گیا ہے - ظاہر ہے کہ ہدایات دیتے وقت وہ ان مسودات کی صحت سے مطمئن تھے - لیکن اگر ان مشتملہ غزلیات اور

اشعار کا ''الف'' سے مقابلہ کیا جائے تو ان میں بھی رد و بدل کا وہی سلسلہ کام کرتا نظر آتا ہے ۔ مثال کے طور پر ذیل کے اقتباسات لیجیے ۔ پہلے ''واو'' کے حواشی یا اوراق مشتملہ سے نقل کیے جاتے ہیں اور بعد میں ''الف'' سے :

(واو)

کون سا ہم دم ہے تیرے عاشق بے دم کے پاس
غم ہے اس کے پاس پیارے اور وہ ہے غم کے پاس

یاں کسے پروا کہ ہو جام جہاں ہیں جم کے پاس
کاسۂ زانو ہے کافی عاشق پر غم کے پاس

خط کہاں آغاز ہے پشت لب دل‌دار پر
خضر ہے ملنے کو آیا عیسیٔ مریم کے پاس

مردمک سے اشک خوں باہم نہیں ہیں ، ہیں دھرے
پارۂ یاقوت احمر دانۂ نیلم کے پاس

روح اس ماتم زدہ کی بعد مردن جوں پتنگ
آئے گی اڑ کر چراغ خانۂ ماتم کے پاس

(الف)

کون سا ہم دم ہے تیرے عاشق بے دم کے پاس
غم ہے اس کے پاس ہمدم اور وہ ہے دم کے پاس

ہم کو کیا ساقی جو تھا جام جہاں ہیں جم کے پاس
تیرا جام بادہ ہو اور تو ہو اس ہر غم کے پاس

خط کہاں آغاز ہے پشت لب دلدار پر
ہیں جناب خضر آئے عیسیٔ مریم کے پاس

مردمک کے پاس ہے یہ اشک خونیں کا ہجوم
یا دھرے یاقوت ہیں یہ دانۂ نیلم کے پاس

روح اس آتش بجاں کی بعد مردن جوں پتنگ
آئے گی اڑ کر چراغ خانۂ ماتم کے پاس

(واو)

دل ضعف سے اُلٹتا ہے آ کر دہن کے پاس
پھر جائے ہے پہنچ کے مسافر وطن کے پاس

یہ موج خوں رواں نہیں شاید ہے رو رہا
تیشہ سر اپنا رکھ کے سر کوہ کن کے پاس

اس آرزو میں خاک ہوا ہوں کہ لے کے جام
پہنچوں کبھی لب بت پیماں شکن کے پاس

بل بے جھجک کہ خوف سے بوسے کے کان کو
جلدی ہٹا لیا مرے لا کر دہن کے پاس

انگشت شمع کیوں نہ اٹھے بہر فاتحہ
ہاں ڈھیر ہے پتنگ کا چاک لگن کے پاس

اٹھے گا تا بہ حشر مری گور سے دھواں
چاک جگر میں شعلہ ہے چاک کفن کے پاس

میں نے کہا کہ تو ہی دے بوسہ کہ ڈر سے میں
لا سکتا منہ نہیں ترے چاہ ذقن کے پاس

کہنے لگا کہ جاتا ہے پیاسا کوئیں کے پاس
یا جاتا ہے کنواں کہیں تشنہ دہن کے پاس ؟

اے ذوق صدقے جائیے پیک خیال کے
کیا دم میں لے گیا ہے بت سیم تن کے پاس

(الف)

شب جان زار رک گئی لب پر دہن کے پاس
پھر اٹھ کے رہ گیا یہ مسافر وطن کے پاس

یہ موج خوں رواں نہیں دیکھو ہے رو رہا
تیشہ سر اپنا رکھ کے سر کوہ کن کے پاس

اس آرزو میں جان ہوں دیتا کہ لے کے جام
پہنچوں کبھی لب بت پیماں شکن کے پاس

انگشت شمع کیوں نہ اٹھے بہر فاتحہ
یہ ڈھیر ہے پتنگ کا ہائے لگن کے پاس

چمکے گی تا بہ حشر ہماری لحد میں آگ
چاک جگر میں دیکھنا چاک کفن کے پاس
میں تو اسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو
شب کیا ہٹا لیا مرے لا کر دہن کے پاس
میں نے کہا کہ بوسہ تمہیں دو ادب سے میں
لا سکتا اپنا منہ نہیں چاہ ذقن کے پاس
ہنس کر کہا کہ جاتا ہے پیاسا کنویں کے پاس
یا جاتا ہے کنواں کبھی تشنہ دہن کے پاس
اے ذوق صدقے جائیے پیک خیال کے
کیا لے گیا اڑا کے بت سیم تن کے پاس

(واؤ)

ہوئے سب جمع مضمون ذوق دیوان دوعالم کے
درستی حواس خمسہ کے بند مخمس میں

(الف)

جو مضمون ذوق دیوان دو عالم کے ہوئے موزوں
حواس خمسہ ہیں انساں کے وہ بند مخمس میں

(واؤ)

روز ازل سے زلف معنبر کا ہے اسیر
کیا اڑ کے تجھ سے طائر نکہت بھلا چلے
ساتھ اپنے لے کے توسن عمر رواں کو آہ
ہم اس سرائے دہر میں کیا آئے کیا چلے

(الف)

ہے گل کا دل تو سنبل پیچاں کے دام میں
کیا اڑ کے تجھ سے طائر نکہت بھلا چلے
ہو کر سوار توسن عمر رواں پہ آہ
ہم اس سرائے دہر میں کیا آئے کیا چلے

(واؤ)

تیرے صید نیم جاں کی جاں نکلتی ہی نہیں
باندھ رکھا ہے اسے پھر تو نے کیا فتراک سے

مجھ کو دوزخ رشک جنت ہو اگر میرے لیے
واں بھی آتش ہو کسی کے روئے آتش ناک سے

آفتابِ حشر ہے یارب کہ نکلا گرم گرم
کوئی آنسو دل جلوں کے دیدۂ نم ناک سے

چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب
جب کہ وہ پردہ نشیں پردہ کرے ادراک سے

عیب ذاتی کو کوئی کھوتا ہے حسنِ عارضی
زیب بد اندام کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

(الف)

تیرے صید نیم جاں کی جان نکلے کس طرح
یہ تو وابستہ ہے تیرے دامن فتراک سے

بیٹھا دوزخ میں بہاریں خلد کی دیکھا کروں
واں کی آتش ہو جو ان کے روئے آتش ناک سے

آفتاب حشر ہے یا رب کہ نکلا گرم گرم
اشک خونیں دل جلوں کے دیدۂ نم ناک سے

چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب
کرتا وہ پردہ نشیں پردہ تو ہے ادراک سے

عیب ذاتی کو چھپائے گا نہ حسنِ عارضی
زیب بداندام کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

---

(٦)

میں نے ابھی تک اس مواد کی کیفیت بیان کی ہے
جو مجھے دستیاب ہوا ہے - اب غور طلب معاملہ یہ ہے کہ

آزاد کو یہ مواد کس مخصوص شکل میں دستیاب ہوا اور انھوں نے اسے کیوں کر استعمال کیا ؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور یہ محض نظریہ نہیں بلکہ عین حقیقت ہے کہ آزاد کے پاس کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی حالت میں ان تمام غزلوں کے مسودات موجود تھے ۔ انھوں نے پہلے پہل ان تمام غزلوں کو ایک منظم مسودے کی شکل میں تیار کیا ۔ یہ وہی مسودہ ہے جو سیالکوٹی کاغذ پر ہے اور جس کے لیے ہم نے ''س'' کا نام تجویز کیا ہے ۔

اس مسودے کی ترتیب میں آزاد نے اولاً تحقیق و تنقید سے کام نہیں لیا ۔ صرف ان مسودوں کی ترتیب سے ایک جامع مسودہ تیار کیا ہے ۔ اس مسودے کو ، جس میں فی‌الحال کوئی رد و بدل نہیں ہوا ہے ، ہم **''نقش اول''** کہیں گے ۔

اس کے بعد آزاد نے اسے بہ نظرِ تنقید دیکھا اور انھیں اس میں لفظی ، معنوی اور عروضی خامیوں کا احساس ہوا ۔ یا پھر انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے چند جزو یا الفاظ یا مصرعے یا اشعار ان الفاظ ، مصرعوں اور اشعار سے مختلف ہیں جو ان کے حافظے میں محفوظ تھے ۔ اس لیے انھوں نے بطور خود اس مسودے (نقشِ اول) پر نظرثانی کی اور حسب ضرورت تبدیلیاں کیں ۔ یا ایسے اشعار جو انھیں یاد تھے ، لیکن مسودے میں درج نہ تھے ، ان کا بین‌السطور یا حاشیے پر اضافہ کیا ۔

اِن اصلاحات کی روشنی میں ''س'' اب صرف ''نقشِ

اول'' نہیں رہا بلکہ اپنی اصلاحی صورت میں ''**نقش ِ اول**''
اور ''**نقش دوم**'' کا مجموعہ ہے۔

آئیے اب ''ح—۱'' پر نظر ڈالیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہاں آزاد ''س'' کی غزلوں اور اشعار پر نظرثانی کر رہے ہیں اور ان میں بقدر ضرورت تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ اس نظریے کی تائید میں ''س'' اور ''ح—۱'' سے صرف چند اشعار پیش کرنا کافی ہوگا۔ تائید مزید کے لیے قارئین کرام ان دونوں کی مشترک غزلوں کا خود جائزہ لینے کی زحمت گورا کریں۔

مثلاً ''س'' سے یہ چند اشعار لیجیے :

کرے ہے صفحۂ سینہ پہ تار اشک سے مسطر
غم ہجراں کیا چاہے ہے کچھ تحریر دل میرا

خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
پڑھے ہے ان دنوں شاید کوئی تفسیر دل میرا

ان سے کچھ ذکر دلا اب نہیں لانا اچھا
اے صبا کس کو بجز جنبشِ سبزہ تو نے
مورچھل گورِ غریباں پہ ہے جھلتے دیکھا

ڈھونڈ غربت میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
دیکھو چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا

لکھے شرحِ سوزشِ ہجراں جو تیرا بے قرار
لکھیں شرحِ سوزشِ ہجراں تو مانندِ سپند
کیا عجب گر ہو اچھل کر نکتہ دفتر سے جدا

جس کو یہ پیوستگی ایذا سے ہے—خون مرا
شکل فندق کے نہ ہووے نوک نشتر سے جدا

چمکے ہے داغ جنوں سر پر تہ موے سفید
یاں رکھتے ہیں سب
ورنہ سب رکھتے ہیں یاں تیشہ کو اخگر سے جدا

حق میں ہو گویا مرے
شربت قند مکرو کشتہ الفت کو دے
سر کرے قاتل اگر اس طرح خنجر سے جدا

''ح-۱'' میں یہ اشعار اس طرح درج ہیں :

ورق پر سینہ کے کھینچا ہے
کرے ہے صفحہ سینہ پہ تار اشک سے مسطر
غم ہجراں کیا چاہے ہے کچھ تحریر دل میرا

خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
تلاوت کرتا ہے قرآن با تفسیر
پڑھے ہے ان دنوں شاید کوئی تفسیر دل میرا

وصل کا ذکر
ان سے کچھ ذکر دلا اب نہیں لانا اچھا
جنبش سبزہ کے سوا کسی نے تجھے
اے صبا کس کو بجز جنبش سبزہ تو نے

چاہے عالم
ڈھونڈ غربت میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا

- - - - - - -

لکھے شرح سوزش ہجراں جو تیرا بے قرار

جوں شرارہ ہو چمک
کیا عجب گر ہو اچھل کر نکتہ دفتر سے جدا

فندق پاے نگاریں کا ہے سودا اے جنوں
دل ہے یہ پیوستہ غم سے قطرۂ خوں بھی مرا
قطرہ خوں بھی نہ ہوگا
صورت فندق نہ ہو گا نوک نشتر سے جدا

شیشۂ دل میں ہے کیا چمکا شرار عشق یار
چمکے ہے داغِ جنوں سر پر تہ موئے سفید
شیشہ گر رکھتے ہیں کیوں
ورنہ یاں رکھتے ہیں سب شیشے کو اخگر سے جدا

ہووے اور ماءالحیات
شربتِ قندِ مکرر حق میں ہو جائے مرے
بسملِ خنجر کو تو جب کردے
سر کرے قاتل اگر اس طرح خنجر سے جدا

آپ نے دیکھا ''ح-۱'' کو تیار کرتے وقت آزاد نے اولاً ان اشعار کو بالکل ویسے ہی لکھ دیا ہے جیسے وہ ''س'' میں درج تھے۔ بعد میں ان کے چند اجزا کو مسترد کرکے اپنی سمجھ کے مطابق انھیں زیادہ موزوں زبان میں ادا کیا ہے۔ ''ح-۱'' میں ''س'' کے ان اشعار کی ابتدائی صورت کا تکرار اور بعد میں ان کی اصلاح اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ''ح-۱'' کو تیار کرتے وقت ''س'' کے اشعار ان کے پیش نظر تھے۔

(۷)

ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں ''ح-۱'' اور ''ح-۲'' کے تقدّم و تأخرِ زمانی کا پتا لگانا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ ''ح-۱''، ''ح-۲'' کے بعد تیار ہوا۔ یہ اس لیے کہ ''ح-۱'' ایک باقاعدہ مسودے کی شکل میں ہے، جس میں معدودے چند اشعار کی اصلاح کی گئی ہے، اور اصل اشعار یا اجزا کو کاٹ کر نئے اشعار یا اجزا ان کے اوپر لکھ دیے گئے ہیں۔ اس کے برعکس ''ح-۲'' کی حالت، جیسا کہ بالتفصیل اوپر

کہا گیا ہے ، بالکل ان مسودات کی سی ہے جہاں کوئی شاعر شعر کہتے وقت اوپر نیچے ، دائیں بائیں لگاتار کاٹ چھانٹ کیے جاتا ہے ، یہاں تک کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے حسب منشا کہہ چکتا ہے ۔ لہذا بادی النظر میں یہی خیال ہوتا ہے کہ ''ح—۱''، ''ح—۲'' کی اصلاح شدہ شکل ہے ۔ ان حالات میں صرف ایک طریق کار ہے جس سے اس فیصلے میں مدد مل سکتی ہے کہ ان دونوں مسودوں میں سے کون سا پہلے تیار ہوا تھا ۔ اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں کا ''الف'' سے مقابلہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان میں سے کون سا موخرالذکر کے زیادہ قریب ہے ۔ لیکن اس طرز عمل سے بھی کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ''ح—۱'' اور ''ح—۲'' میں صرف چار مشترک غزلیں ہیں اور ان سب کی آخری صورت قریباً قریباً ایک سی ہے ۔

بہرحال اگر ہم ''ح—۱'' اور ''ح—۲'' کو ایک وحدت خیال کریں تو انہیں ''س'' کی اصلاح شدہ صورت ماننے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا ، کیونکہ بمقابلہ ''س'' کے وہ ''الف'' سے زیادہ قریب ہیں ۔ ذیل کے اقتباسات سے اس کی صراحت ہو جاتی ہے :

(س) آن سے کچھ ذکر دلا اب نہیں لانا اچھا
لیک جو وہ کہیں تو بھی کہے جانا اچھا

(ح-۱) ان سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو چاہیں کہیں تو بھی کہے جانا اچھا

(ح-۲) آن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تو بھی کہے جانا اچھا

(الف) اُن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا

(س) کشتۂ دستِ نگاریں ہوں مری تربت پر
پھول گل مہدی کے لا لا کے چڑھانا اچھا

(ح-۱) پھول گل مہدی کے لا لا کے چڑھاتے ہو جو تم
خون عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

(ح-۲) پھول گل مہدی کے لا لا کے چڑھاتے ہو تم
خونِ عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

(الف) پھول گل مہدی کے لا لا کے نہ ہاتھوں میں ملو
خونِ عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

(س) ہدفِ تیرِ نگہ دل کو بنا کر بولے
کیوں جی کچھ ہم بھی لگاتے ہیں نشانہ اچھا

(ح-۱) مرغِ دل نے نگہِ یار سے پوچھا اُڑ کر
پھر بھی کہنا کہ لگاتے ہیں نشانہ اچھا

(ح-۲) مرغِ دل نے نگہِ یار سے اُڑ کر جو کہا
پھر نہ کہنا کہ لگاتے ہیں نشانہ اچھا

(الف) مرغِ دل نے نگہ یار سے پوچھا اُڑ کر
پھر بھی کہنا کہ لگاتے ہیں نشانہ اچھا

(س) طائرِ روح وہاں یوں ہی پہنچ جا، تجھ سے
نامہ بر کون ہے جو کیجے روانہ اچھا

(ح-۱) طائرِ جاں کے سوا کوچۂ جاناں کی طرف
نامہ بر کون ہے جو کیجے روانہ اچھا

(ح-۲) طائرِ جاں کے سوا کوچۂ جاناں کی طرف
نامہ بر کون ہے جو کیجے روانہ اچھا

(الف)

(س) صبا سے کس روش وا ہووے یہ دلگیر دل میرا
کہ ہے باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

(ح-۱) برنگِ گل صبا سے وا ہو کیا دلگیر دل میرا
کہ ہے باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

(ح-۲) برنگ گل صبا سے وا ہو کیا دلگیر دل میرا
کہ ہے باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

(الف) برنگِ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا
کہ ہے باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

(س) خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
پڑھے یہ ان دنوں شاید کوئی تفسیر دل میرا

(ح-۱) خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
تلاوت کرتا ہے قرآن با تفسیر دل میرا

(ح-۲) خط و عارض کا اس کے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
تلاوت کرتا ہے قرآن با تفسیر دل میرا

(الف) خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
تلاوت کرتا ہے قرآن با تفسیر دل میرا

(س) تصور تیغِ ابرو کا ترے جاتا نہیں دل سے
بڑا بانکا ہے، رکھتا ہے سدا شمشیر دل میرا

(ح-۱) تصور میں کسی تیغِ نگہ کے کشورِ الفت
ہوا تسخیر کر کے صاحبِ شمشیر دل میرا

(ح-۲) تصور میں کسی تیغِ نگہ کے کشورِ الفت
ہوا تسخیر کر کے صاحبِ شمشیر دل میرا

(الف) تصور میں کسی تیغ نگہ کے کشور الفت
ہوا تسخیر کر کے صاحبِ شمشیر دل میرا

(س) ضعف سے سینے میں اب اس کی یہ حالت ہے کہ یوں
ریگ کو شیشۂ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

(ح-۲) ضعف سے سینے میں آتا ہے مرا دم جس طرح
ریگ کو شیشۂ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

(الف) ضعف سے سینے میں آتا ہے مرا دم جس طرح
ریگ کو شیشۂ ساعت میں نہ چلتے دیکھا

(س) ہے تری جنبشِ کاکل سے فرو شورش دل
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

(ح-۲) اس رخ و زلف کے آگے نہ ہؤا مہ کو فروغ
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

(الف) اس رخ و زلف کے آگے نہ ہؤا مہ کو فروغ
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

(س) اس قد کی دلا جو کھے تصویر دکھا دو
تم شکلِ الف کھینچ کے تحریر دکھا دو

(ح-۲) جو کھوے قدِ یار کی تصویر دکھا دو
تم لکھو الف اور وہی تحریر دکھا دو

(الف) جو کھوے قدِ یار کی تصویر دکھا دو
تم لکھو الف اور وہی تحریر دکھا دو

(س) ایسا نہ ہو وہ کند ہو رہ جاؤں میں بسمل
اول تو مجھے کھینچ کے شمشیر دکھا دو

(ح-۲) دیکھو سر میدان نہ کہیں چھوڑ دے بسمل
پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھا دو

(الف) دیکھو سر مقتل نہ کہیں چھوڑ دے بسمل
پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھا دو

(س) پوچھے ہے حقیقت وہ مرے دل کی عزیزو
کوئی اسے بسمل شدہ نخچیر دکھا دو

(ح-۲) حالت تپش دل کی مری پوچھیں اگر وہ
تم ان کو تڑپتا ہوا نخچیر دکھا دو

(الف) حالت تپش دل کی مری پوچھیں اگر وہ
تم ان کو تڑپتا ہوا نخچیر دکھا دو

(س) دیکھ لو آخری دیدار اگر دیکھتے ہو
ہاتھ کیا خاک مرے سینے پہ دھر دیکھتے ہو

(ح-۲) ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
اک نظر دل سے ادھر دیکھو اگر دیکھتے ہو

(الف) ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
اک نظر دل سے ادھر دیکھو اگر دیکھتے ہو

(س) ناتوانی کی میں ؟ کہ ہوا ہوں جوں بال
مجھ کو کم دیکھے اگر اپنی کمر دیکھتے ہو

(ح-۲) ناتوانی کا مری مجھ سے نہ پوچھو احوال
ہو مجھے دیکھتے یا اپنی کمر دیکھتے ہو

(الف) ناتوانی کا مری مجھ سے نہ پوچھو احوال
ہو مجھے دیکھتے یا اپنی کمر دیکھتے ہو

(س) دیکھو یارو ہر پروانہ پڑے شمع کے گرد
برگ ریزاں جو محبت کے شجر دیکھتے ہو

(ح-۲) ہر پروانہ پڑے ہیں شجر شمع کے گرد
برگ ریزی محبت کا ثمر دیکھتے ہو

(الف) ایضاً

(س) لذت ناوک غم پوچھو نہ اے چارہ‌گرو
خود بخود چاٹے ہے لب زخم جگر دیکھتے ہو

(ح-۲) لذت ناوک غم ذوق سے ہو پوچھتے کیا
لب پڑے چاٹتے ہیں زخم جگر دیکھتے ہو

(الف) ایضاً

(س) نہیں کسی کا دباؤ، نہیں کسی کے دبیل
تو ہم سے بزم میں تم کان کیوں دباتے ہو

(ح-۲) اگر دباؤ کسی کا تمھارے دل پہ نہیں
تو ہم کو دیکھ کے تم کان کیوں دباتے ہو

(الف) ایضاً

(س) نہ کیجے آئنے میں عکس سبز خط پہ نظر
تم آہ تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

(ح-۲) ہو کرتے سبزۂ خط کی جو سیر آئنے میں
نگہ کی تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

(الف)　ہو کرتے سبزۂ خط کی جو سیر آئنے میں
نگہ کی تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

اب اگر یہ پوچھا جائے کہ ''ح-۱'' ، ''ح-۲'' اور ''الف'' میں یہ تھوڑا سا فرق کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس سلسلۂ اصلاح و تصحیح میں ''ح-۱'' ، ''ح-۲'' اور ''الف'' کے درمیان اصلاح و تصحیح کی ایک یا ایک سے زیادہ کڑیاں اور بھی تھیں جو ہم تک نہیں پہنچیں -

(۸)

تدوین دیوان ذوق میں پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کا مضمون ''دیوان ذوق میں مولانا آزاد کے اضافے'' مطبوعہ رسالہ ہندوستانی بابت جنوری و اپریل ۱۹۳۷ء ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا ذکر یہاں ازبس ضروری ہے -

اس مضمون کا مواد پروفیسر صاحب موصوف کو ذوق کی چودہ غزلیات کے مسودات کی صورت میں محمد باقر صاحب، نبیرۂ مولانا آزاد سے دست یاب ہوا تھا - محمد باقر صاحب کو اس بات کا سان گمان بھی نہ تھا کہ پروفیسر شیرانی کو اپنے دولت خانے پر تشریف لانے کی دعوت دے کر اور انھیں بہ ظاہر چند بے کار کاغذات عنایت فرما کر وہ اپنے جد بزرگوار کی منصبی دیانت داری پر ایک شدید لیکن منصفانہ حملے کا مواد بہم پہنچا رہے تھے - پروفیسر شیرانی نے بالکل درست کہا ہے : ''اس وقت ان مسودات کی اہمیت کو نہ میں سمجھا نہ آغا صاحب سمجھے ورنہ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ان کی ہوا بھی نہ دیتے -''

یہ مواد جو انھیں محمد باقر صاحب کی بے خیالی کی وجہ سے دستیاب ہوا تھا ، نو (۹) مسودات پر مشتمل ہے۔ ان میں مولانا آزاد ذوق کی ۱۴ ایسی غزلوں پر سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں جن کو انھوں نے ''الف'' میں ذوق کے بچپن یا شباب کے کلام یا ایسے کلام سے تعبیر کیا ہے جو نظر ثانی سے محروم رہا۔ پروفیسر شیرانی مرحوم اس ناقابل تردید شہادت کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ غزلیں مولانا آزاد کی اپنی تصنیف کردہ ہیں ، نہ کہ ذوق کی ۔

یہ تمام مسودات بالکل ویسے ہی ہیں جن کی نقلیں میں اوپر ''ح-۲'' کے تحت دے چکا ہوں ۔ درحقیقت یہ مسودات ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور اگر ان دونوں (پروفیسر شیرانی کے مسودات اور ''ح-۱'') کو یکجا کر دیا جائے تو بیشتر ان غزلوں کے مسودے مل جاتے ہیں جو مندرجہ بالا حواشی کے ساتھ ''الف'' میں شامل کی گئی ہیں ۔

جن غزلوں کے مسودات پروفیسر شیرانی کو دست یاب ہوئے ، ان کے مطلعے حسب ذیل ہیں :

ہم سے ظاہر و باطن جو اس بت کے جھگڑے ہیں

خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے

چشم قاتل ہمیں کیوں کر نہ بھلا یاد رہے

تدبیر نہ کر ، فائدہ تدبیر میں کیا ہے

پری رو کیا ستم گر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے

نہ کھینچو عاشق۔ تشنہ جگر کے تیر پہلو سے

برق میرا آشیاں کب سے جلا کر لے گئی

حدِ رقم ہے وصفِ جبینِ صنم ہرے

ذکر مژگاں تیرا جس کے روبرو نکلا کرے

خم۔ ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے

دکھلا نہ خال۔ ناف تو اے گلبدن مجھے

مار کر تیر جو وہ دلبر۔ جانی مانگے

نہ دہن گواہی جو داغ کہن نہیں دیتے

اب اس موضوع پر پروفیسر شیرانی کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیں :

''ذوق کا یہ بچپن کا کلام سوائے بعض غزلوں کے اس مخصوص رنگ میں نہیں جس رنگ میں ان کا باقی کلام ہے ۔ ان غزلوں کا انداز ذوق کے کلام سے بالکل مختلف ہے ۔ یہی نہیں . . . میرے پاس بعض مسودے خود حضرت مولانا کے قلم میں ہیں ۔ اس شہادت کی رو سے ، جس کی تردید میں نہیں جانتا کیوں کر کی جائے ، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ استاد ذوق کا یہ مبینہ کلام ذوق سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا ، بلکہ اس کی تصنیف کی ذمہ داری حضرت مولانا پر عائد ہوتی ہے ۔ میرے پاس نو (۹) کاغذ ایسے ہیں جن میں چودہ غزلیں مسودوں کی شکل میں درج ہیں ۔ یہ کاغذات یقیناً نقلیں نہیں ہیں بلکہ اصل مسودے ہیں جن میں جگہ جگہ الفاظ اور مصرعوں کو کاٹا چھانٹا گیا ہے ۔ غالباً مولانا نے یہ جدید مواد دیوان ذوق کے لیے استاد کے بچپن کے کلام کے نام سے طیار کیا ہے . . . آخر یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے (خدا کرے غلط ہو) کہ مولانا نے یہ غزلیں تصنیف کرکے

ذوق کے دیوان میں اضافہ کر دی ہیں اور استاد کے
بچپن کے کلام سے انھیں موسوم کردیا ہے ۔''
مضمون کے آخر میں پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں :

''مولانا کا سرسبز تخیّل اور ان کی حاضر طبیعت
قابلِ ستائش ہے . . . وہ اپنے زور دماغ اور
قوت فکر کے ذریعے ایک ادنیٰ خیال کو اعلیٰ
پیرایۂ بیان عطا کر رہے ہیں ۔ یہ غزلیں اگرچہ
ذوق کی غزلوں کی روانی کو نہیں پہنچتیں ، نہ ان
میں وہ زور اور چستی ہے جو ذوق کے ہاں موجود
ہے ، تاہم ان کی پختگی اور متانت میں کوئی
شبہہ نہیں ۔''

مندرجہ بالا اقتباس کے تنقیدی حصے سے اختلاف رائے ممکن
ہے ، اگرچہ اس کے اظہار کا یہ موقع نہیں ، لیکن اس مواد کی
رُو سے، جو پروفیسر شیرانی کے پیش نظر تھا ، ان کا فیصلہ ناطق
دکھائی دیتا ہے اور کوئی انصاف پسند شخص اس کی صحت
سے انکار نہیں کر سکتا ۔ مختصراً پروفیسر موصوف کا موقف
یہ ہے کہ مولانا آزاد کے پاس ان غزلوں کے کوئی اصلی
مسودات نہ تھے ۔ یہ غزلیں آزاد نے خود کہی ہیں اور
طبع زاد ہیں ۔

لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ان غزلوں کے اصلی
مسودات آزاد کے پاس موجود تھے اور آزاد نے انھی میں
تصرف کیا ہے تو ان کا نظریہ نہ فقط پایۂ اعتبار سے گر
جائے گا بلکہ غلط ثابت ہوگا ۔

میرا اپنا موقف یہ ہے کہ آزاد کے پاس ان غزلوں کے

پرانے مسودات موجود تھے اور انھوں نے انھی پرانے مسودات سے انھیں ردیف وار نقل کیا تھا ۔ پروفیسر شیرانی والے مسودات اسی پرانے مسودے کی اصلاح پذیر شکل ہیں ۔ ''س'' کے تحت نقل کردہ غزلوں کو دیکھیے ، **وہاں آپ کو ان چودہ غزلوں میں سے بارہ کے اصلی مسودات مل جائیں گے ۔**

لہذا یہ غزلیں صرف اس حد تک آزاد کی تصنیف ہیں کہ انھوں نے ایسے مواد کو ، جو بحیثیت کلام ذوق ان تک پہنچا تھا ، لیکن جسے وہ قابلِ اصلاح خیال کرتے تھے ، اپنی دانست کے مطابق اصلاح دے کر ''الف'' میں داخل کردیا ۔

یہاں ایک اور بات غور طلب ہے ؛ اس کا کیا سبب ہے کہ کسی ایک مسودے میں کئی اشعار ایسے ہیں جن میں کوئی قطع و برید نہیں یا کہیں کہیں نہایت معمولی سی تبدیلی کر دی گئی ہے ؟ لیکن اس مسودے میں ایسے اشعار بھی آ جاتے ہیں جنھیں بار بار درست کیا گیا ہے ۔ پروفیسر شیرانی کا نظریہ یہ ہے کہ وہ مسودات جن میں بہت کم تبدیلیاں نظر آتی ہیں ، درحقیقت کسی ناقص مسودے کی اصلاح شدہ شکل ہیں ، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ قرین قیاس ہے کہ آزاد کوئی غزل بناتے وقت اس کے بیشتر اشعار تو تسلی بخش طور پر درست کر لیں اور ایک دو کو ویسے کا ویسا نامکمل چھوڑ دیں اور ان کی اصلاح کسی دوسرے مسودے پر ملتوی کر دیں ؟ کیا ایسے حالات میں یہ زیادہ قرین قیاس نہ ہوگا کہ اصلی مسودہ جس سے یہ اشعار نقل کیے گئے تھے ، بہ حیثیتِ مجموعی درست تھا ؟ صرف ایک دو اشعار نظر میں کھٹکتے تھے یا پڑھے

نہیں جاتے تھے ، لہذا ان پر مزید طبع آزمائی کی گئی ۔

یہی نظریہ پوری غزلوں پر بھی صادق آتا ہے ۔ وہ غزلیں جن پر زورِ طبیعت ڈال کر بار بار درست کیا گیا ہے ، مثال کے طور پر :

''کوہ کے چشموں سے پانی ہے نکلتے دیکھا''

غالباً ان تک قریباً قریباً مسخ شدہ شکل میں پہنچی ہوں گی ۔

---

(۹)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آزاد کے پاس اصلی مواد موجود تھا تو انھوں نے اسے جوں کا توں کیوں نہ درج کر دیا اور اس کی اصلاح کی ذمہ‌داری اپنے اوپر کیوں عائد کی؟

یہ ایک اہم سوال ہے جس کے خاطر خواہ جواب کے لیے دوسری باتوں کے علاوہ ، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ، آزاد کی نفسیات کا مطالعہ ضروری ہے ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آزاد نے محسوس کیا ہوگا کہ ذوق کی یہ غزلیں اتنی وقیع نہ تھیں جتنا ان کا باقی کلام ، لہذا انھوں نے سوچا ہوگا کہ ان کا جوں کا توں نقل کردینا ذوق کے ادبی مقام کے منافی ہوگا ۔

اس کے علاوہ عین ممکن ہے کہ ان غزلوں کے مسودات ناقص تھے اور وہ ذوق کے کلام کی صحیح نقل نہ تھے ۔ یا ان میں سے چند مسودات یا ان کے بعض حصے مسخ ہو چکے تھے اور انھیں پڑھنا دشوار یا ناممکن تھا ۔ نیز بعض حالتوں

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض غزلوں کے
چند اشعار انھیں اچھی طرح یاد نہ تھے ۔ اگر کسی کا ایک
مصرع یاد ہے تو کسی کا دوسرا ۔ یا مضمون تو ان کے
دماغ میں محفوظ تھا لیکن شعر فراموش ہوچکا تھا ، یا اس
کا دھندلا سا تصور دماغ میں باقی رہ گیا تھا ۔ علاوہ ازیں
کبھی کبھی وہ یہ بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ فلاں
غزل میں فلاں فلاں قوافی باندھے گئے تھے ۔ اشعار بالکل
فراموش ہوگئے تھے ، صرف چند قوافی یاد تھے۔

یہ صرف قیاس آرائی نہیں ، آزاد نے 'ح-۲' میں
بعض اوقات صرف مصرعے نقل کیے ہیں اور کہیں کہیں
حاشیے میں قوافی کی فہرست بھی نقل کر دی ہے ۔
پروفیسر شیرانی اس کی یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ
اپنی طبع زاد غزل بناتے وقت آزاد پہلے قوافی کی فہرست
تیار کر لیتے تھے اور پھر انھیں اشعار میں باندھتے چلے جاتے
تھے ۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ یہ وہ قوافی ہیں جنھیں
ذوق نے کسی خاص غزل میں باندھا تھا ۔ آزاد کو اشعار
یاد نہیں رہے، صرف قوافی دماغ میں چکر لگاتے نظر آتے تھے،
لہذا بدیں خیال کہ مبادا یہ قوافی اور متعلقہ اشعار نظرانداز
ہو جائیں ، انھوں نے بطورِ یاداشت انھیں حاشیے پر درج
کر دیا ۔

علاوہ ازیں ہمیں صرف دو تین غزلوں سے متعلق
ایسے قوافی کی فہرستیں ملتی ہیں ۔ اگر اشعار کہنے سے پہلے
قوافی کی فہرست تیار کرنا آزاد کا معمول ہوتا ، جیسا کہ
پروفیسر شیرانی کے نظریے سے مترشح ہوتا ہے ، تو کیا
سبب ہے کہ باقی غزلوں کو تیار کرتے وقت بھی آزاد اس

طریقِ کار پر عمل پیرا دکھائی نہیں دیتے۔

آزاد کو ذوق سے عشق تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ استاد کا جتنا کلام بھی دست بردِ زمانہ سے بچایا جا سکے، جس طرح بھی ہو اسے بچایا جائے۔ بڑھتے بڑھتے اس خیال نے ایک خبط کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ''الف'' کو دیکھیے، کتنی بار وہ بہ حسرت ایسے جملے لکھتے ہیں: صرف یہی اشعار یاد ہیں، لکھ دیتا ہوں، جو مل جائے وہی غنیمت ہے وغیرہ وغیرہ۔

''دیوان ذوق'' کی ترتیب کا آغاز اسی پر جوش جذبے کے تحت ہوا۔ اس فرض کی سرانجام دہی میں ان مشکلات کے پیشِ نظر، جن کا انھیں سامنا ہوا، یہ جذبہ اور بھی شدید ہوتا گیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے منصبی فرائض سے تجاوز کرکے ذوق کے اشعار کی اصلاح شروع کر دی۔ علاوہ ازیں جو اشعار انھیں اچھی طرح یاد نہ تھے، یا بالکل یاد نہ تھے اور صرف مضامین یا قوافی کا دھندلا سا عکس ذہن میں رہ گیا تھا، انھیں بطورِ خود بنانا شروع کردیا۔

استاد سے جذبۂ عشق کے علاوہ ایک اور غیرشعوری عمل، جس سے انھیں کلامِ ذوق کی اصلاح کی تحریک ہوئی، ان کی انانیت یا خودپرستی تھی۔ وہ اہلِ دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انھوں نے ذوق کی غزلیات کا کس تن دہی سے کھوج نکالا ہے اور وہ کام کیا ہے جو کسی اور کے بس کا نہ تھا۔ اور اس کام میں وہ حافظ ویران سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ دنیا ان کے اس کارنامے کو بہ نظر استحسان دیکھے گی۔ وہ بار بار فخریہ

انداز میں لکھتے ہیں کہ ان کا ذوق سے بہت میل جول تھا اور استاد کا جتنا کلام انھیں یاد تھا یا ان کے پاس محفوظ تھا ، اتنا کسی اور کے پاس نہ تھا ۔ ان خیالات سے ان کی انانیت کی تسکین ہوتی تھی اور وہ اپنی اس عظیم خدمت کو فخر و استحسان کی نظر سے دیکھتے تھے ۔

یہاں ایک اور بات کا اظہار بھی ضروری ہے جس کا تعلق آزاد کے رنگِ طبیعت سے ہے ۔ یہ ان کی اصلاح در اصلاح کی طبعی خواہش ہے ۔ آزاد اپنی کسی تصنیف سے مکمل طور پر مطمئن نہ تھے اور ان پر اصلاح کا عمل ہمیشہ جاری رہتا تھا ۔ میں اس کی بیسیوں مثالیں دے سکتا ہوں ، لیکن خوف طوالت سے یہاں صرف دو پر اکتفا کرتا ہوں ۔ مہدی حسن اپنے مضمون ''حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک'' میں لکھتے ہیں :

> ''ایک واقعہ دلچسپ اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لیے لکھتا ہوں ؛ لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے ، گو دماغ کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا ۔ نذیر احمد ملنے کے لیے گئے . . . نذیر احمد کا لیکچر ہونے والا تھا جو چھپا ہوا ان کے ہاتھ میں تھا ۔ آزاد رسالے کی طرف متوجہ ہوئے تو نذیر احمد نے آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجیے ، کانفرنس میں پیش کرنا ہے ۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کر دی ۔''

اس سے بھی زیادہ معنی خیز مثال ان کی اپنی مثنوی ''شب قدر'' کی ہے، جو ۹- اپریل ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے ایک ایسے جلسے میں پڑھی گئی جس سے نظم جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آزاد نے اس کی تصنیف پر پورا زور طبیعت صرف کیا ہو گا کیونکہ وہ اسے نظم جدید کی مثال کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ میرے پاس ''کوہ نور'' مورخہ ۱۶ مئی ۱۸۷۴ء کا وہ پرچہ ہے جس میں یہ مثنوی چھپی تھی۔ یہ مثنوی ۱۳۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے چھپتے ہی آزاد کو اس کی اصلاح کی ضرورت کا احساس ہوا اور انھوں نے ابیات میں رد و بدل کر دیا۔ اس عمل اصلاح میں بعض صورتوں میں بند کے بند تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات میں پہلا شعر اخبار سے نقل کیا گیا ہے، دوسرا شعر اسی اخبار میں آزاد کے اپنے قلم سے اس کی اصلاح شدہ شکل ہے۔ تیسرا شعر مزید اصلاح کا نتیجہ ہے اور ''نظم آزاد'' سے نقل کیا گیا ہے۔ جہاں صرف دو شعر نقل کیے گئے ہیں، وہ اخبار مذکور اور ''نظم آزاد'' میں چھپے ہوئے اشعار کی مختلف شکلیں ہیں۔

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر رہا ہے تو
اے آفتاب صبح نکل کر چلا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر رہا ہے تو
اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو

پر دیکھتا ہوں میں کہ ترا رنگ زرد ہے
اور روے تاب ناک پہ کلفت کی گرد ہے

اس وقت دیکھتا ہوں کہ رخ تیرا زرد ہے
اور اس پہ ڈالی شام نے غربت کی گرد ہے
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے
اور ڈالی اس پہ شام نے غربت کی گرد ہے

اے آفتاب دیر بہت کم ہے شام میں
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دن بھر کے کام میں
اے دوست دن ہے ہوتا بغل گیر شام سے
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دن بھر کے کام سے
ہوتا زمانہ بس کہ ہے وابستہ شام سے
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامن میں کوہسار کے تا صبح لیٹ کے
سو رہ لحاف ابر میں منہ کو اپیٹ کے
دامن میں کوہسار کے اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام رات کو سمجھا کے سو رہو
دامان کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

تو رنگ حکم سے جو زمانے پہ پھیرتی
گویا کہ مشک اڑاتی ہے، عنبر بکھیرتی
عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے، عنبر بکھیرتی

ہوں پوچھتا مگر کوئی بتلاتا کچھ نہیں
ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں
ہے سب حساب لیک پڑھا جاتا کچھ نہیں
ایسا سیاہ ہے کہ پڑھا جاتا کچھ نہیں
لکھتا ہوں سب حساب، پڑھا جاتا کچھ نہیں
ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں

بجلی ہنسے تو اس کی تجھی سے بہار ہے
شبنم سے تیرا فیض۔ کرم آشکار ہے

بجلی ہنسے تو رخ ترا دیتا بہار ہے
شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

چلتا ہے حکم تیرا اندھیرے جہان میں
جو چاہے دیکھ لیوے زمین آسمان میں
سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے حکم تیرا ہر آدھے جہان پر

یوں دیکھتا کہ چاروں طرف چھائی رات ہے
ہے وہ مثل کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے
اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے

آرام کے بچھونے پہ یاں کوئی گھر میں ہے
دامن پہ دشت کے کوئی سوتا سفر میں ہے
ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے
دامانِ دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے

معلوم ہوتا ہے کہ ذوق کی غزلیات پر نظرثانی کرتے وقت بھی آزاد اسی طرز پر گامزن تھے۔ جہاں تک ان کی اپنی تصانیف کا تعلق ہے، ”خوب سے خوب تر“ کی یہ خواہش نہایت مستحسن ہے، لیکن کلامِ ذوق کے بارے میں یہ عمل ایک غیر ذمہ دارانہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔

میں یہ سب کچھ مولانا آزاد کے فعل کے جواز یا حمایت میں نہیں لکھ رہا، بلکہ ان نفسیاتی عوامل کی نشاندہی کر رہا ہوں جو ”دیوانِ ذوق“ میں اصلاحات کے محرک ہوئے ہوں گے۔

آخر میں مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد بالطبع ، غیر خوش آیند حقائق کے اخفا کے عادی تھے ۔ ان کی راست گفتاری میں کلام نہیں ، لیکن سچ ، تمام تر سچ اور صرف سچ کے وہ قائل نہ تھے ۔ میں ''نیرنگِ خیال'' اور ''سخن دانِ فارس'' کے بارے میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں لہذا ان کا یہاں اعادہ تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے ۔

تدوینِ دیوانِ ذوق کی پیچ در پیچ گتھیاں سلجھانے کے لیے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ، اس کے زمانۂ آغاز و انجام کو متعین کیا جائے ۔ نیز یہ بھی معلوم کیا جائے کہ ان ایام میں آزاد کی جسمانی اور دماغی حالت کیا تھی ۔

خوش قسمتی سے ان ایام کے متعین کرنے میں ذیل کے چند خطوط اور مسودات کارآمد ثابت ہوتے ہیں :

(۱) آزاد نے ''ح—۲'' کی اس غزل کو، جس کا مطلع:

رخصت پرواز دیویں گر قفس کی تیلیاں

ہے ، مقابلے کے امتحان کے ایک پرچے کی پشت پر نقل کیا ہے ۔ پرچے پر یہ عبارت درج ہے :

Competitive examination of candidates for Extra-assistant Commissioner, dated 20th October, 1888.

To Muhammad Husain Azad, Professor, Government College, Lahore.

اس تحریر سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ متذکرہ بالا غزل ۲۰ ۔ اکتوبر ۱۸۸۸ء کے بعد کسی وقت نقل کی گئی تھی

اور اس وقت تدوینِ دیوانِ ذوق کا کام شروع ہوچکا تھا۔

یہ امر کہ وہ کام کتنا پہلے شروع ہوا تھا، اس کا پتہ آزاد کے خط مورخہ یکم ستمبر ۱۸۸۸ء بنام میجر بلگرامی سے چلتا ہے جو اس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس کام کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔

اتنا ہی اہم وزیرالدولہ کا ایک خط بنام آزاد ہے، وہ لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا صاحب! تسلیم۔ یہ قصیدہ وہ ہے جس کی خبر میں نے اپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ شیخ صاحب کی ابتدائی مشق ہے اور مجھ کو ہرگز پسند نہیں۔ بہرحال آپ کے کام کا ہے۔ عریضہ وزیرالدولہ ۱۴ فروری ۱۸۸۹ء۔

اس خط سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد فروری ۱۸۸۹ء میں ترتیبِ دیوان میں مشغول تھے۔

باقی رہا یہ امر کہ یہ کام کب ختم ہوا، اس کا پتا آزاد کی ملازمت کے کوائف سے چلتا ہے۔ ان کاغذات پر درج ہے کہ ۱۶- اکتوبر ۱۸۸۹ء کو آزاد بوجہ علالت، بیماری کی رخصت پر مجبور ہوگئے تھے اور جون ۱۸۹۰ء میں ان کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

چونکہ آزاد کی علالت کا آغاز کچھ ہفتے پہلے ہو چکا تھا اور ان کی بیماری کی رخصت کی درخواست اس وقت دی گئی تھی جب ان کی صحت یابی کے امکانات بہت کم نظر آتے تھے لہذا یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی ترتیب یکم اکتوبر ۱۸۸۹ء سے ایک دو ماہ پہلے مکمل ہو

چکی تھی -

چنانچہ ہم تخمیناً کہہ سکتے ہیں کہ تدوین دیوان کا آغاز ستمبر ۱۸۸۸ء سے کچھ عرصہ بعد ہوا اور اکتوبر ۱۸۸۹ء سے کچھ عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا -

میرا مضمون ''آزاد عالم دیوانگی میں'' دیکھیے - اس سے پتا چلتا ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جب آزاد کی دماغی حالت بتدریج خراب ہوتی جا رہی تھی - یہی وہ زمانہ ہے جب وہ ''دربار اکبری'' کی اشاعت کے شدت سے مخالف تھے، کیونکہ ان کی رائے میں اکبر جیسی عظیم شخصیت کے سوانح شائع کرنا اس کی توہین کے مترادف تھا - یہی وہ زمانہ ہے جب وہ بار بار ''دربار اکبری'' کا مسودہ ضائع کرنے کی دھمکی دے چکے تھے ، اور بدیں خوف کہ کہیں وہ اسے ضائع نہ کردیں ، ان کے لواحقین نے خفیہ طور پر اسے ان کی الماری سے نکال کر کہیں چھپا دیا تھا - یہی وہ زمانہ ہے جب مولوی خلیل الرحمان شام کی تاریکی میں ان سے ملنے کے لیے گئے اور دیکھا کہ جھلسنے والی گرمی میں ، ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند ، وہ ذوق کے اشعار کی تصحیح میں مشغول تھے - جوں ہی انھوں نے مولوی خلیل الرحمان کو دیکھا ، انھوں نے ''چور چور'' پکار کر ان کا تعاقب کیا اور پولیس میں رپٹ لکھوانے گھر سے چل نکلے -

ان شواہد کی بنا پر یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ''دیوان ذوق'' کی ترتیب کے دوران میں یا کم از کم اس کے اختتام کے وقت ان کی دماغی حالت رو بہ انحطاط تھی اور شدت انہماک کی وجہ سے ان کا اخلاقی حاسہ بھی کم و بیش

ماؤف ہو چکا تھا اور بدیں وجہ کسی حد تک وہ "دیوان ذوق" میں بے جا تصرّفات کے مرتکب ہوئے ۔

بہر کیف اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اس کام کی سرانجام دہی میں اپنے فرائضِ منصبی سے بہت تجاوز کیا ۔ چنانچہ ہم اُن غزلیات کو ، جنھیں وہ ذوق کے بچپن یا شباب کے کلام سے تعبیر کرتے ہیں ، تمام تر کلامِ ذوق تسلیم نہ کرنے میں مبالغے یا بدظنی کے مرتکب نہیں ہوتے ۔

☆ ☆ ☆

مجلسِ ترقیٔ ادب کی چند علمی مطبوعات

۱- مقالات حافظ محمود شیرانی (جلد اول تا چہارم) - - فی	۱۲/-
۲- مقالات حافظ محمود شیرانی : (جلد پنجم) - - - - - -	۲۴/-
۳- مقالات حافظ محمود شیرانی : (جلد ششم) - - - - - -	۲۵/-
۴- مباحث : ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالات کا مجموعہ - - -	۱۳/۵۰
۵- مقالات عرشی : از امتیاز علی خاں عرشی - - - - -	۲۵/-
۶- مقالات مولوی محمد شفیع : جلد اول) - - - - - - -	۱۵/-
۷- مقالات مولوی محمد شفیع : (جلد دوم) - - - - - -	۲۰/-
۸- مقالات مولوی محمد شفیع (جلد چہارم) - - - - - -	۸/-
۹- اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں : از ڈاکٹر محمد باقر - -	۱۵/-
۱۰- ارمغان پاک : ص ... ڈاکٹر ... - - - - - -	۷/-
۱۱- شاعری اور تخیّل : از محمد ... حسین - - - - - -	۶/-
۱۲- مغربی شعریات : از ... ہادی حسین - - - - - -	۱۸/-
۱۳- اصولِ انتقادِ ادبیات : از سید عابد علی عابد - - -	۱۵/-
۱۴- اسلوب : از سید عابد علی عابد - - - - - - - -	۱۰/-
۱۵- اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری : از ڈاکٹر فرمان فتح پوری - - - - - - -	۲۰/-
۱۶- مولوی نذیر احمد دہلوی - احوال و آثار : از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی - - - - -	۲۵/-
۱۷- ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر : از ڈاکٹر محمد اسلم - -	۲۰/-

مجلسِ ترقیٔ ادب ، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ ، لاہور

زرین آرٹ پریس ، لاہور